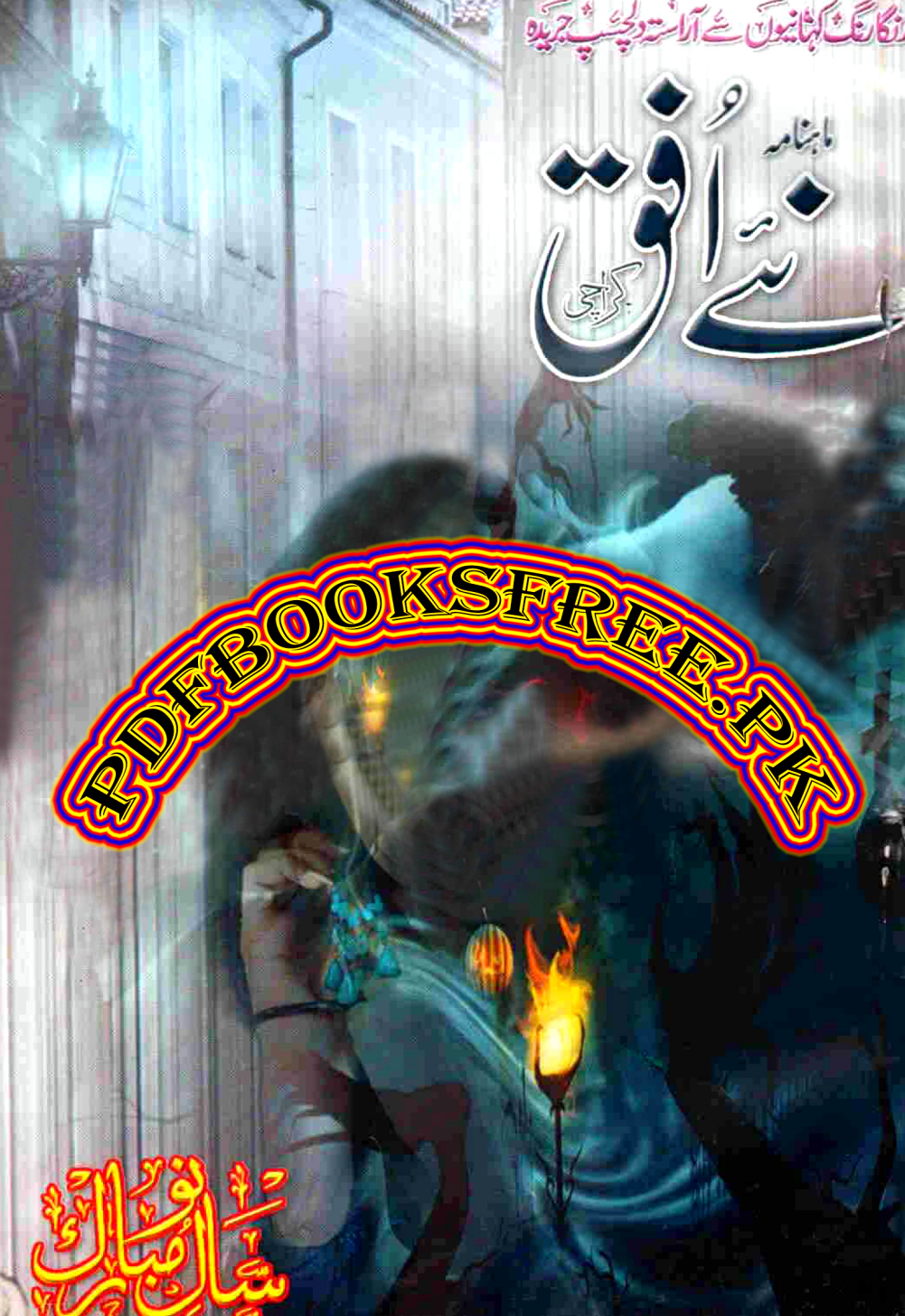

رنگا رنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ
ماہنامہ
نئے افق
کراچی
PDFBOOKSFREE.PK
سال نو مبارک

ابتدائیہ

دستک	مشتاق احمد قریشی	8
گفتگو	عمران احمد	10
اقرأ	طاہر احمد قریشی	20

سچی کہانیاں

سراب	دعا فاطمہ	106
حقیقی مسرت	شہنی ارشاد	112
کردار	فاخرہ سلطانہ	132
مکافات	زین نقوی	147
زرگزیدہ	ریاض بٹ	189
عشق نامراد	عثمان خالق	200

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

تراجم

واپسی	اسرار احمد	60
ملاقات	راحیلہ تاج	64
چکر	اقبال بھٹی	70

مستقل سلسلے

بیت المقدس	الماس ایم اے	22
بازی گر	حسام بٹ	74
گردش	شہناز بانو	152
خطروں کا کھلاڑی	اے۔حمید	222
بزم سخن	روبین احمد	212
خوشبوئے سخن	سیما بنت عاصم	215
ذوق آگہی	عفان احمد	219

خط وکتابت کا پتا: ماہنامہ نئے افق پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74200 فون نمبرز 021-35620771/2
فیکس 021-35620773 یکے از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز ای میل Info@aanchal.com.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

ہوتا ہے شب روز تماشہ میرے آگے.....!!

ذرائع ابلاغ چاہے وہ پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک میڈیا' دونوں نے ہی مل کر دنیا کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ اب چاہے کوئی حادثہ کوئی واقعہ قریب و نزدیک کا ہو یا کسی دور افتادہ ملک کا منٹوں' سیکنڈوں میں نہیں بلکہ اب تو لمحوں میں ساری دنیا اس سے باخبر اور اس کی شاہد بن جاتی ہے۔ کوئی حادثہ کوئی واقعہ چاہے کہیں کیوں نہ ہو رہا ہو۔ ذرائع ابلاغ اسے براہِ راست زندہ جاوید دکھا رہے ہوتے ہیں۔ اب کوئی کسی طرح کسی پردے کے پیچھے چھپ نہیں سکتا چاہے ٹی وی چینلز ہوں یا کوئی اخبار سب کے سب اپنے اپنے مدمقابل سے بازی لے جانے اور سب سے پہلے خبر پہنچانے کی مہم جوئی میں آگے ہی آگے رہنے میں مصروف رہتے ہیں ایسے سازگار ماحول میں بھلا کوئی خبر ناظرین و قارئین سے کیسے پوشیدہ رہ سکتی ہے۔

وطنِ عزیز میں بھی بڑی بڑی اور اہم خبریں بڑے تواتر اور تسلسل کے ساتھ یکے بعد دیگرے چلی آ رہی تھیں۔ حکومتِ وقت کو معلوم ایسا ہو رہا تھا کہ واقعی وقت پڑ گیا ہے۔ کیونکہ ابھی حسین حقانی صاحب سے منسوب میمو گیٹ اسکینڈل کی بازگشت تھمنے بھی نہیں پائی تھی کہ امریکہ نے براہِ راست سلالہ چوکی پر حملہ کر کے پاک افواج کے جوانوں کو لقمۂ اجل بنا دیا۔ ذرائع ابلاغ کی تمام چھوٹی بڑی توپوں کا رخ حسین حقانی اور میمو سے ہٹ کر ایک دم سے سلالہ چیک پوسٹ اور امریکی کارروائیوں کی طرح مڑ گیا۔ اس حادثے نے نا صرف حسین حقانی بلکہ ان سے منسوب تمام الزامات جن سے حکمرانوں کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی پس پشت ڈال کر حکمرانوں پر اپنی توپوں کے دہانے کھول دیے اور تو چل میں آیا کے مصداق پے در پے حکمرانوں پر ان کی موجودہ پالیسیوں پر امریکہ کے جارحانہ رویوں پر مذاکرے' مکالموں کا دور شروع کر دیا اس چکچم دھاڑ میں نہ صرف ٹی وی چینلز بلکہ عوام بھی میمو گیٹ اسکینڈل کو بھول گئے۔ بات آگے بڑھ گئی اس عرصے میں حکومت کے لیے ایک نیا دردِ سر عمران خان کی شکل میں جو بتدریج شروع ہوتا ہے اچانک ہی بڑھ کر سامنے آ گیا۔ جب گھوٹکی میں موجودہ حکومت کے سابقہ وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی نے اپنے حلقۂ اثر میں بڑا جلسہ ہی نہیں کیا۔ خود کو عمران خان کی جماعت تحریک انصاف میں شامل کر کے حکمرانوں پر وقت ڈال دیا ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس ابھرتے امڈتے ہوئے طوفان کا رخ کیسے موڑیں اور خود کو ان پے در پے

حادثات سے کیسے بچائیں۔ تب ہی ان کے عاقل بالغ وزیر داخلہ جناب عبدالرحمٰن ملک صاحب نے اپنے جوہر خفتہ کو آواز دی اور اپنے جوہر یکم محرم کو نمائش چورنگی پر دو افراد کو لقمۂ اجل بنوا کر دکھا دیے۔ اب نہ صرف تمام ذرائع ابلاغ بلکہ عام آدمی تک اس خوف میں مبتلا کر دیا گیا کہ کہیں ملک کے طول و عرض میں یا کراچی میں کہیں ایک بار پھر آگ و خون کی ہولی نہ کھیلی جانے لگے اور شیعہ سنی فساد نہ برپا ہو جائے۔ شیعہ سنی فساد تو برپا نہیں ہوئے۔ ہاں لوگ عمران خان اور شاہ محمود قریشی کے ملاپ اور گھوٹکی کے جلسہ عام کو ضرور بھول گئے۔ اس طرح حکومت اس جلسے کے وہ اثرات جو عام آدمی یعنی ووٹر پر مرتب ہونا تھے کو روکنے میں ضرور کامیاب ہو گئی۔ کہنے والے کہہ رہے ہیں کہ اسی کا نام اصل سیاست ہے کیونکہ سیاست اور حکمرانی میں نہ کوئی بیٹا ہوتا ہے نہ کوئی باپ نہ ہی کوئی اجتماعی یا قومی مفاد ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ذاتی مفاد کا تحفظ ضروری ہوتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کراچی میں نمائش چورنگی پر یکم محرم کو رونما ہونے والے حادثے کے اثرات کو کیسے ختم کیا جاتا ہے یا اسے تادیر ہوا دی جاتی رہے گی کیونکہ ابھی تو محرم کے کئی روز باقی ہیں۔

سوچ و فکر رکھنے والے حلقوں کا یہ بھی خیال اور کہنا ہے کہ چونکہ موجودہ حکمرانوں کی بداعمالی' بدعنوانی اور کرپشن کے اس قدر واقعات ذرائع ابلاغ سامنے لا چکا ہے' جس سے مرعوب و متاثر ہو کر وطنِ عزیز کے حکمرانوں کے اصل سرپرست امریکہ اور اس کے حواریوں نے اپنا ہاتھ ان سے ہٹا لیا اور کچھ لوگوں کے خیال کے مطابق اب امریکہ سیاست کے نئے کھلاڑی عمران خان کی پشت سہلا رہا ہے اسے آزما رہا ہے جو عوامی جذبات و احساسات کو مدِ نظر رکھے ہوئے بظاہر امریکہ کے خلاف ایسی مہم چلا رہا ہے' کہنے والے کہہ رہے ہیں کہ سیاست میں جو کچھ ہوتا ہے وہ نظر نہیں آتا اور جو نظر آ رہا ہوتا ہے وہ ہوتا نہیں ہے۔ ایک کامیاب سیاست دان ہونے کا اصل گر ہے کیونکہ سیاست دان جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں جو کرتے ہیں وہ کہتے نہیں۔ امریکہ اور عمران خان بھی بظاہر تو ایک دوسرے کی مخالفت کرتے نظر آ رہے ہیں۔ لیکن خطے کی تاریخ گواہ ہے کہ وطنِ عزیز میں اب تک آنے والی تمام تبدیلیاں چاہے وہ عوامی ہوں یا عسکری وہ سب کی سب ہمارے آقائے اعلیٰ مقام امریکہ بہادر کی مرضی و منشا سے ہی آتی ہیں اور شاید آئندہ بھی ان کی ہی مرضی و منشا کی محتاج رہیں گی۔ کیونکہ ہمارا تو بال بال ان کا مقروض ہے۔ ہم ان کے احسان عظیم کے تلے دبتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ سر اٹھانے کی نہ ہمت ہے نہ حوصلہ۔ اللہ تعالیٰ ہماری ہمارے وطنِ عزیز کی حفاظت فرمائے۔ آمین

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گفتگو

عمران احمد

گانے کی کراہت

زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ کی کسی گلی سے گزر رہے تھے کہ اچانک ایک نوجوان (پاس سے) گانا گاتے ہوئے گزرا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: ''اے نوجوان! تم پر افسوس ہے تم (گانے کی بجائے) قرآن کریم کو ترنم سے کیوں نہیں پڑھ لیتے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات کئی بار دہرائی۔ (دیلمی)

عزیزانِ محترم...... سلامت باشد

اللہ تعالیٰ نئے سال کو اس کائنات ہجری سال نو کا پہلا مہینہ اپنے اختتام کے قریب ہے۔ جب کہ نئے عیسوی سال کی آمد آمد ہے۔ خصوصاً عالم اسلام کے لیے مبارک فرمائے۔ ہم یعنی مسلمان اب تک خواب غفلت میں مبتلا ہیں۔ جب ہم بیدار تھے تو ہمیں اللہ تعالیٰ کی نصرت حاصل تھی۔ تب بیت المقدس بھی ہمارے پاس تھا اور نصف یورپ کی دھرتی بھی ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں سے لرز رہی تھی۔ ہمارے تعلیمی ادارے (مدارس) دنیا کو علم بانٹ رہے تھے۔ تاریک یورپ کو روشنی دے رہے تھے انہیں انسانیت کے جامے میں لا رہے تھے لیکن ہم نے جونہی اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے انحراف کیا اسلام سے ہٹ کر نظریات کو اپنایا تو ہمارے ساتھ جو کچھ ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ ہم نے یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست بنایا وہ آج اسی دوستی کی آڑ میں ہماری سرحدوں کی خلاف ورزی کر رہے ہیں اور ہم سوائے دبے دبے احتجاج کے کچھ نہیں کر سکتے' کیوں......؟ اس کا جواب ہم سب کے پاس ہے لیکن ہم اسے تسلیم نہیں کرتے۔

اب آئیے اپنے تلخ و شیریں ناموں کی طرف۔

عبدالمالک کیف...... صادق آباد۔ السلام علیکم محترم عمران قریشی صاحب سب سے پہلے تو آپ کو نئے افق کی پوری ٹیم کو نئے سال کی بہت بہت مبارک ہم امید کرتے ہیں کہ ان شاء اللہ نئے سال کے ساتھ ہمارے میگزین کو بھی نئے سال کی مناسبت سے پہلے سے بڑھ کر خوب صورت اور معیاری بنا کر ہمارے ہاتھوں میں پہنچاتے رہیں گے اور جس طرح پچھلے سال ہماری تحریروں کو قدر کی نگاہ فراہم کر کے نوک پلک سنوار کر شائع کرتے رہے اسی طرح اس سال بھی حوصلہ افزائی کرتے رہیں گے۔ جو ناتا نئے افق سے جڑا ہے۔ وہ شاید ہی کسی دوسرے میگزین سے ہو۔ اس سال ہم سے جو غلطیاں' کوتاہیاں سرزد ہوئیں آؤ ہم سب مل کر پھر نہ دہرانے کا عہد کریں اور ہماری دعا ہے کہ اللہ پاک ہماری غلطیوں کو معاف فرمائے اور ہمارے وطن عزیز کو آنے والے دنوں میں ہمارے لیے مثل جنت بنا دے آمین۔ دسمبر 2011ء کا شمارہ ہاتھ میں آیا۔ ٹائٹل گرل بہت خوش نظر آ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو کیف جی نیا سال مبارک ہو۔ ہمیشہ کی طرح حاجی صاحب کی ''دستک'' دل میں اتر گئی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نئے سال میں ان حکمرانوں سے نجات عطا فرمائے اور ہمیں ایسے حکمران دے' جو ہمارے پاکستان کو دنیا کے لیے مثال بنا دیں۔ گفتگو میں عمران قریشی صاحب کی عید قرباں کے حوالے سے مستند باتیں پڑھ کے جانا کہ اب اور پہلے کے لوگوں میں کتنا فرق ہے کہ ایک بندے کی وجہ سے ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کا حج قبول ہوا اور دوسری قربانی یہ دی کہ وہ آدمی حج پر اس لیے نہ جا سکا کہ اس کا پڑوسی بھوکا تھا۔ قربان جاؤں اس بغداد کے موچی پر۔ آج لوگ حج جیسے عظیم فریضے پر جانے کے لیے بھی کتنا دکھاوا کرتے ہیں۔ گفتگو میں پہلا خط محمد اسلم جاوید فیصل آباد! کیسے ہیں بھائی جان! دوسرا خط محترمہ عالیہ انعام الٰہی کا تھا۔ آپی آپ نے تو دل کی بھڑاس ہی نکال دی۔ میری مانیں تو دنیا' حالات سیاست' ان چیزوں کے بارے میں سوچ کر ہلکان نہ ہوا کریں اللہ بہتر کرے گا۔ آپ کا تبصرہ بہت ہی جاندار لگا کہ آپ نے کھل کے لکھا اور اتنا لکھا کہ میرے تبصرے کی جگہ بھی آپ کے تبصرے نے اڑا لی۔ آپی کتنی محبت سے لکھا تھا میں نے۔ (ناراض نہ ہو مذاق کر رہا ہوں) یہی تو ہمارے میگزین والوں کی خوبی ہے کہ ہمارے جذبات و احساسات کی قدر کرتے ہیں۔ ویسے کا ویسا شائع کر دیتے ہیں جو ہم لکھتے ہیں۔ اللہ آپ کو پریشانیوں سے نجات عطا فرمائے۔ عصمت اقبال عین صاحبہ منگلا ڈیم سے اپنی حاضری ہر ماہ لگوانے کی پابند ہوتی جا رہی ہیں۔ ماشاء اللہ محنت کرتی رہیں اللہ آپ کا اقبال بلند کرے۔ آپ اپنے اجلاس میں چھائی رہیں اچھا انداز اپنایا۔ ریاض بٹ حسن ابدال' سے ایک شعر کے ساتھ حاضر تھے۔ آپ کی کہانی باری آنے پر شائع کر دی جائے گی۔ محترم جلد بازی نہ کریں۔ جلدی تو ہمیں بھی نہیں ہے کہ اپنی دو کہانیاں لکھ کے بھیج دی ہیں کب شائع ہوتی ہیں ادارے والے ہی بہتر جانتے ہیں۔ میری تحریر پسند کرنے کا شکریہ۔ ادی شہناز بانو بھی اپنی مصروفیات سے

وقت نکال کر حاضر تھیں۔ این شاہین ناز کے لیے استعمال کیے جملے محبت اور شفقت سے مزین تھے اور سب کے لیے احترام قابل احترام ہے۔ ادی دل تو چاہتا ہے کہ آپ سے کچھ سیکھیں۔ ہم بھی آپ کے چھوٹے بھائیوں کی طرح ہیں۔ ہمارے سر پر بھی شفقت سے ہاتھ رکھ کے دعا دیجیے کہ ہم بھی آپ کی طرح معیاری ادب تخلیق کر سکیں۔ آپ نے میری چھوٹی سی رائے سے اتفاق کیا یقین کیجیے بہت خوشی ہوئی۔ عبداللہ شاہد ادا آپ غائب ہیں کیوں؟ شبنمی ارشاد اور انجم فاروق ساحلی بھی حاضر رہے اپنے خوب صورت تبصروں کے ساتھ۔ عبدالحکیم ساجد بھی اپنی خوبیوں کے ساتھ محو گفتگو تھے۔ یاد آوری کا شکریہ۔ مجاہد ناز سنجر پور اور عبدالرحمٰن ساغر آزاد کشمیر سے آخری خطوط کے ساتھ حاضر تھے۔ دسمبر یعنی کے سال کا آخری شمارہ ہونے پر جو دوست کئی مہینوں سے غائب ہیں ان کی شدت سے یاد آئی۔ یار احمد علی کیف تم کیوں بھگوڑے بنتے جا رہے ہو۔ بھائیو لوٹ آؤ نئی خوشیاں لے کر وقت نکال کر پھر سے محفل کو آباد کرنے آ ئیں۔ ناظم بخاری لودھراں۔ ارشاد قریشی صاحب (ارشاد قریشی صاحب سے بات ہوئی کہنے لگے بہت بیمار ہوں زیادہ اصرار کیا کہ بتاؤ کیا بات ہے مگر ٹال گئے۔ مایوس سے لگ رہے تھے) آپ سب لوگ ان کی صحت یابی کے لیے دعا کریں ارشاد بھائی مایوسی گناہ ہے۔ آپ بہت جلد ان شاء اللہ مکمل فٹ ہوں گے۔ محترم اللہ دتہ عابد' عبیداللہ عاطر' لنگاہ برادرز' وقاص احمد وکی' محترم سرور شاز' ابن مقبول جاوید احمد صدیقی' آ کاش بخاری' محمد فہد جتوئی' قمر جہاں' محترمہ طاہرہ جبیں تارا' ریحانہ سعیدہ' محمد فاروق انجم' حسنین نوید بلوچ' محمد سلیمان عاکف' سہیل عمران' امیر حمزہ چاند' کہاں ہو میرے چاند' قدیر رانا' اسعد علی' ملک ظفر شاہین' نوید اسلم' عبدالرؤف عدم' جناب ایم کے مجاہد' ریاض حسین قمر' محترمہ صائمہ ناصر اور بھی بہت سارے نام ہیں جو رہ گئے ان سے بھی گزارش کہ آپ لوگوں کو کسی سے شکوہ ہے تو مل بیٹھ کے ختم کر لیتے ہیں۔ نئے افق جولائی 2011ء میں سیل نمبر شائع ہونے کے بعد کچھ دوست جو میری شاعری کو پسند کرتے ہیں' جنھیں شکوہ ہے کہ کبھی میگزین کے تبصرے میں بھی یاد کر لیا کرو ان سب دوستوں کو عزت افزائی کرنے والوں کو نیا سال مبارک اور شکریہ کہ ناچیز کو یاد کرتے ہیں۔ جن میں محترم سکندر نواز جہلم' شیریں صاحبہ اسلام آباد' محترمہ حنیفہ جہلم کیسی ہو بلونگڑی (اب زیادہ دانت مت نکالو بھی خود بھی نئے افق کو خط لکھ بھیجو) کچھ دوسرے بھی نام ہیں ان سب کو تہہ دل سے نئے سال کی خوشیاں مبارک۔ محترم ایڈیٹر نئے افق کو خوب صورت اور دلنشیں بنانے کے لیے کچھ اور نئے سلسلے شروع کر دیں کہ چار چاند لگ جائیں۔ اقرا کے بعد کہانیوں میں بیت المقدس اپنی آب و تاب کے ساتھ جاری ہے۔ چھوٹی کہانیوں میں ''سفر ہدایت'' ناز سلوش ذشے پہلے نمبر پر رہی۔ دوسرے نمبر پر ادی شہناز بانو کی قصوروار رہی۔ جو حقیقی لگی شاید کوئی مغرب پرست لڑکی اپنا محاسبہ کر سکے۔ ''گردش'' بھی خوب رہی۔ بازی گر کی پہلی قسط بھی متاثر کن رہی۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ پچھلی دفعہ بھی تبصرہ رہ گیا۔ بہت افسوس ہوا۔ پھر یہ بھی کہ میری کوئی تحریر بھی نہ تھی۔ بھائی روبین احمد بزم سخن والے آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہے کیا کب سے قطعے بھیج رہا ہوں کوئی ایک بھی شائع نہیں ہوا اور اب کی بار بزم سخن کم بزم خواتین زیادہ لگ رہی تھی۔ کیونکہ 34 قطعات میں فقط تین نام حضرات کے تھے۔ بھئی آپ کی بزم میں آنے کا کیا طریقہ کار ہے ویسے سلیکشن عمدہ تھی۔ خوش بو سخن سیما بنت عاصم نے سنبھال لی ہے ادی آپ نے بھی ہمیں ریجیکٹ کر دیا۔ خوشبو سخن میں غزلوں اور نظموں کی خوشبو بڑی پیاری تھی۔ سچ تو یہی ہے کہ ایک سلسلے کی وجہ سے نئے افق میں قدم رکھا تھا۔ والسلام۔

کامران شاہ کامی...... راولپنڈی! محترم جناب ایڈیٹر صاحب السلام علیکم! امید ہے کہ آپ خدا کے فضل و کرم اور ہماری دعاؤں سے خیریت سے ہوں گے۔ محترم میں نئے افق کا نیا قاری تو نہیں ہوں بلکہ کئی سال تک اس میں میری کہانیاں اور شاعری چھپتی رہی ہے۔ بس کچھ مصروفیات کی وجہ سے لکھنے کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ اب ان شاء اللہ لکھنے کا سلسلہ دوبارہ جاری رہے گا۔ نئے افق کے پرانے رائٹر و شاعر عثمان کیانی' قدیر رانا' راحیلہ تاج' یعقوب جمیل' اسرار احمد' شہناز بانو' عاصم ناصر' اسد علی' قمر جہاں' اللہ دتہ عابد' روشانے سبعین' روبین احمد' عفان احمد اور میری پیاری اور لاڈلی اور مجھ سے ناراض میری پیاری بہنا'' شبنمی ارشاد'' تقریباً مجھ کو جانتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ سب مجھ کو دوبارہ خوش آمدید کہیں گے۔ محترم اپنی اور اپنے دوست کی شاعری بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کہ ہمیشہ کی طرح حوصلہ افزائی کریں گے۔ آخر میں نئے افق کے تمام دوستوں کو سلام بہنا شبنمی ارشاد کے نام یہ شعر۔

غم کی آگ میں جلے ہیں
دکھ درد کا کوئی ساتھی نہیں
خوشیوں کی کریں کیونکر آرزو
جب خوشی ہی راس آتی نہیں

محمد اسحاق انجم...... کنگن پور'

لبوں تبسم نگاہوں میں بجلی
قیامت کدھر سے چلی آ رہی ہے
خدا کے لیے اپنی آنکھوں کو روکو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے دل کی دنیا لٹی جا رہی ہے

محترم جناب ایڈیٹر صاحب! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے دسمبر 2011ء کا شمارہ نئے افق' خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ ملا۔ گفتگو میں نئے پرانے لوگوں کی محفل سجی ہوئی تھی ایک ہم ہی تھے جو کچھ عرصہ سے غیر حاضر تھے۔ بہت دوستوں کے خطوط اور فون نے ہمیں یاد کروادیا کہ ہم محفل سے غائب ہیں۔ خطوط تو ہم لکھتے رہتے ہیں۔ مگر پتا نہیں جاتے کہاں ہیں؟ یا پھر عمران صاحب انہیں ردی کی نذر کردیتے ہیں۔ اللہ جانے۔ محفل میں محمد اسلم جاوید' عالیہ انعام الٰہی طویل خط کے ساتھ حاضر ہوئیں۔ عصمت اقبال عین' ریاض بٹ' شبنم ارشاد' انجم فاروق ساحلی' مجاہد ناز عباس' عبدالرحمٰن ساغر اور شہناز بانو صاحبہ محفل میں رنگ جمار ہے تھے۔ کہانیاں پسند سلسلے پسند دوستوں کی محفل یوں ہی جاری وساری رہے۔ آپ سلامت رہیں۔ والسلام

عصمت اقبال عین...... منگلا ڈیم! محترم عمران بھائی! سدا خوش رہیں۔ السلام علیکم امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ دسمبر کے شمارے کا ابھی سرسری جائزہ لیا ہے۔ مکمل نہیں پڑھا اس لیے تفصیلی خط نہیں لکھ رہی ان شاء اللہ جلد ہی تفصیل سے خط لکھوں گی۔ میں آپ کی بے حد مشکور ہوں آپ نے دسمبر کے شمارے میں میرا خط اور غزل شامل کیے۔ مزید اپنی دو غزلیں بھیج رہی ہوں۔ امید ہے قریبی اشاعت میں جگہ پائیں گی۔ میری طرف سے آپ کو اور ادارے کے تمام احباب کو ڈھیروں دعائیں۔ خدا حافظ

محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد! بڑی آرزو تھی ملاقات کی سدا مسکراتے رہو۔ جناب مشتاق احمد قریشی صاحب السلام علیکم! آپ خیریت سے ہوں گے اور میں خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں۔ اس وقت میرے ہاتھوں میں دسمبر کا تازہ پرچہ ہے جسے دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ سرورق پہلے سے زیادہ دلکش تھا۔ گفتگو اور دستک سے لے کر سرورق تک بکھرے رنگ اور پھول بہار کی آمد کا پتا دیتے تھے۔ ویسے بھی یہ ایک معیاری پرچہ ہے خط شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ خوش بوئے سخن میں غزل لگانے کا آپ میرے خلوص کے مستحق ہیں۔ آپ جس پیار سے ہماری حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ یہی جذبہ آپ کو خط تحریر کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ طویل سفر کے بعد نئے افق کا دیدار بڑی مشکل سے ہوتا ہے۔ یہ اس سال کا آخری شمارہ ہوگا۔ اس جاتے سال میں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ مجھ سے بہتر آپ خود جانتے ہیں پھولوں کی مہک کی جگہ ہم نے کانٹے پائے زندگی کی راہوں میں کوئی چراغ نہ جلا۔ بڑے گہرے زخم ملے اس سال نے بڑے دکھ دیے اور اس کے دامن میں لاتعداد اداسیوں کے سائے تھے۔ کوئی خوشی نہ ملی۔ وہ داغ دیے جو دل سے مٹائے نہ گئے دیگر کئی مسائل سے ہمارا سامنا تھا۔ غریب آدمی کی زندگی ویسے کوئی بہتر نہیں ہوتی۔ موسم پہلے سے کافی بدل گیا ہے اور سردی کا آغاز ہے۔ نئے افق کے تمام عنوان اپنی اپنی جگہ پر بہتر ہیں۔ جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے مثلاً اقرا' گفتگو' بزم سخن اور خوشبوئے سخن اپنی مثال آپ ہیں اگر آپ نئے سال کی آمد پر پرچے میں کچھ تبدیلیاں کریں تو بہتر ہوگا۔ ویسے پرچہ ترقی کی منازل آہستہ آہستہ طے کر کے عوام میں بہت مقبول ہوتا جاتا ہے۔ کہانیوں میں گردش' فرض' بازی گر' سفر ہدایت' ذوق آگہی جن سے بے حد متاثر ہوا تمام قلم کاروں کو میری طرف سے آداب عرض ہو۔ بیت المقدس تحریر بھی بہت خوب صورت تھی بزم سخن کے اشعار اچھے تھے۔ آپ کو خط لکھنے کے لیے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ تب جا کے میں کامیاب ہوتا ہوں۔ ایک بار میں پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ خط اور غزل شائع کرنے پر چند غزلیں ارسال کر رہا ہوں۔ کسی قریبی شمارے میں جگہ دے کر شکریہ کا موقع دیں۔ 2011ء آہستہ آہستہ ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہا ہے۔ خدا کرے کہ نیا سال ہم سب کے لیے خوشیوں کا پیغام لے کر آئے اور کوئی پریشانی نہ ہو۔ آپ کی دعاؤں سے ہم سب کو نیا سال دیکھنا نصیب ہو۔

ناز سلوش دشے...... میر پور۔ قابل قدر عمران بھائی اور تمام قارئین نئے افق کو میرا سلام اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ سب کو اپنی امان اور نعمتوں کی چھاؤں تلے رکھے۔ آمین۔ ایک لمبا عرصہ مصروفیت کی زندگی گزارنے کے بعد جب نئے افق کو ہاتھ میں پکڑا تو وقت گزرنے کا احساس تک نہ رہا۔ گزشتہ دنوں سابقہ رسالوں پر گزارا کرتی رہی۔ ٹائٹل کے بارے میں کیا تبصرہ کروں......؟ بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی' کے مترادف ٹائٹل بس گزارے لائق ہی ہے۔ نجانے مجھے کیوں لگنے لگا ہے کہ نئے افق کے لیے اچھے ٹائٹل کا کال پڑ چکا ہے۔ سوائے ماڈل کی آنکھوں کے کوئی چیز بھی تو قابل ستائش نہیں۔ خیر جو ایڈیٹر کی مرضی۔ ہم تو صرف اپنے اچھا یا برا لگنے کا اظہار ہی کر سکتے ہیں۔ دستک میں ان حالات پر روشنی ڈالی گئی کہ جن کو میری عمر کے اکثر لوگ نظر انداز کردیتے ہیں۔ مگر میں تو اب بھی کہتی ہوں۔ Youth Power بہت بڑی چیز ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس سے فائدہ اٹھائے گا کون؟ گفتگو میں ڈینگی اور ایڈز کے وائرس کے بارے میں انکشاف نے دل دہلا دیا۔ مسلمانوں کو ختم کرنے کے کیسے کیسے طریقے استعمال کیے جارہے ہیں۔ خدا کی پناہ۔ خطوط میں اس دفعہ صدارتی کرسی این شاہین کے پاس تھی۔ میری طرح اس دفعہ یہ بھی ٹائیفائڈ کا شکار ہوئیں۔ خدا ان کو صحت و کامرانی عطا کرے۔ عبدالحکیم ساجد صاحب ڈاک والوں کے انتقام سے بچنے کے لیے اپنا خط ہمیشہ رجسٹری کروائیں۔ خرچ زیادہ مگر کام پکا۔ عام ڈاک کے خط عموماً آگے پیچھے ہوجاتے ہیں اور مجھے خط میں یاد رکھنے کا شکریہ۔ اس سے اگلا خط میرا جس میں میرے پروجیکٹ کا نام مکس ہو کر کھچڑی بنا ہوا تھا۔ Awairness and development program in edu-sector شہناز بانو میں آپ سے ناراض نہیں۔ بس

کچھ بیمار تھی اور کچھ مصروفیات ایسی رہیں کہ رابطہ نہیں کر سکی۔ بہر حال اس غلطی پر معذرت امی آپ کو بہت سلام کہہ رہی ہیں اپنا خیال رکھیے گا۔ اگر میں سب خطوط پر تبصرہ کروں تو کافی لمبا ہو جائے گا۔ ابھی کہانیوں کی طرف آؤں گی۔ بیت المقدس کو پڑھ کر عظیم مجاہد صلاح الدین ایوبی کی یاد آ گئی۔ اس عظیم شخص نے جن مشکلات سے بیت المقدس حاصل کیا تھا۔ اس کا دسواں حصہ بھی ہم میں ناپید ہے۔ بہت اعلیٰ اور قابل ستائش کہانی تھی۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ بزم سخن' خوشبوئے سخن اور ذوق آگہی ہر دفعہ کی طرح قابل ستائش رہے اور آخر میں آخری صفحات کی زینت ''کالی عورت'' مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آرہا کہ یہ عبداللہ شاہد کی کہانی ہے۔ بہت خوب۔ اس کہانی کو پڑھ کر بے اختیار ایک عنوان ذہن میں آیا۔ ''کوٹھے سے کوٹھے تک'' سلمیٰ جہاں سے چلی تھی اپنی فطرت کے باعث دوبارہ اسی جگہ جا پہنچی جس خوب صورتی سے اس کہانی کو قلم بند کیا گیا۔ وہ واقعی قابل ستائش ہے۔ اس دفعہ کی اچھی کہانیوں کی گلشن پر عمران بھائی کو مبارک باد۔ باقی تمام قارئین کو میری طرف سے سلام اور دعا جو لوگ غیر حاضر ہیں وہ حاضر ہو جائیں کیونکہ میں بھی لمبی چھٹیاں گزار کے واپس آ گئی ہوں۔ کوشش ہوگی کہ اس خط کے ساتھ ایک آدھ کہانی بھی ارسال کرسکوں۔ والسلام۔

شہناز بانو...... کراچی۔ اللہ تعالیٰ رحیم وکریم کی ذات سے امید ہے کہ تمام قارئین نئے افق اور ادارے کا سارا اسٹاف بخیرو عافیت ہوگا۔ اس ماہ بھی نئے افق مجھے اٹھائیس تاریخ کو ملا ہے۔ اس لیے جلدی جلدی مطالعہ کرنے کی کوشش کی مگر پھر بھی رہ گیا ہے سوچتا ہے جتنا پڑھا ہے اس پر تبصرہ حاضر ہے۔ گفتگو میں عمران بھائی کی گفتگو بہترین لگی۔ حقیقت میں ایسا ہی ہوتا ہے سنتے ہیں کہ روز قیامت وہ نفسانفسی ہوگی کہ کسی کو دوسرے کی پروا نہیں ہوگی۔ سب کو اپنی اپنی پڑی ہوگی۔ لیکن ہمارے حکمرانوں نے وہ صورت حال پیدا کردی ہے کہ قیامت سے پہلے ہی قیامت آچکی ہے۔ نفسانفسی کا عالم ہے۔ مہنگائی نے کمر توڑ رکھی ہے۔ ایسے میں لوگوں نے عید قربان سے فائدہ اٹھایا ایک پنتھ اور دو کاج والی بات کی۔ سنت ابراہیمی بھی ادا کی اور اپنا فائدہ بھی حاصل کر لیا۔ (دل کو سمجھانے والی بات ہے)۔ وہ غریب لوگ جو ویسے بھی گوشت کھانے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے اب بھی محروم ہی رہے حقیقت تو یہی ہے کہ قیامت نزدیک آچکی ہے۔ ہر نشانی ظاہر ہے سوائے دجال اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد باقی ہے۔ آیئے ہم سب مل کر اپنے اعمال کا محاسبہ کریں اور اللہ کے حضور استغفار کریں کہ اب بھی موقع ہے سانس کی ڈور نہ جانے کب ٹوٹ جائے۔ محمد اسلم جاوید صاحب آپ نے بالکل درست فرمایا کہ اس مہنگائی کے دور میں اتنا جاذب نظر پرچہ نکالنا آسان کام نہیں ہے۔ میرے خیال میں کسی بھی کام کے لیے اگر نیت صاف ہو تو اللہ تعالیٰ بھی مددگار بن جاتا ہے۔ عالیہ ڈیئر تمہیں اتنے دنوں بعد پرچے میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ تمہیں عمران بھائی تو کیا کوئی بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ دیکھتی نہیں ہو تم نہ ہو تو ہر جانب عالیہ عالیہ کی پکار مچی ہوتی ہے۔ تمہارے مسائل بھی ان شاء اللہ جلد ہی ختم ہو جائیں گے اللہ پر بھروسا اور اسی سے امید رکھو۔ وہ پکارنے والوں کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔ تمہیں میری تحریر پسند آئی بہت شکریہ۔ اس مرتبہ قرآنی آیت کے حوالے سے ایک کہانی لکھی ہے۔ امید ہے تمہیں یہ بھی پسند آئے گی۔ اس کے علاوہ اب گردش تحریر کرنا بھی عمران بھائی نے میرے ذمے لگا دیا ہے۔ اللہ کرے میں عمران بھائی اور قارئین کی امیدوں پر پوری اتر جاؤں۔ کافی بڑی ذمہ داری ہے۔ سب کی دعاؤں اور حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ عصمت اقبال عین صاحبہ پہلے تو یہ بتائیے کہ یہ ''عین'' کیا ہے۔ آپ نے بجائے پرچے پر تبصرہ کرنے کے صرف گفتگو میں موجود ساتھیوں کی گفتگو پر تبصرہ کیا ہے۔ کیا آپ آگے پرچے کا مطالعہ نہیں کرتیں؟ ریاض بٹ صاحب آپ اپنی تحریروں کے لیے فکر مند نہ ہوا کریں۔ باری آنے پر چھپ ہی جائے گی۔ آپ کا تبصرہ اچھا تھا۔ نہی کیسی ہو؟ پچھلے دنوں تمہاری مصروفیات کچھ زیادہ ہی تھیں اور کچھ خاص بھی تھیں۔ تم نے ذکر نہیں کیا تو ہم بھی گول کر جاتے ہیں۔ تمہاری کہانی کہاں ہے؟ انجم فاروق ساحلی کیسے ہو بھئی بتاؤ کچھ جان وان بنائی یا ابھی تک ویسے ہی ہو؟ تمہاری کہانی اچھی تھی۔ عبدالحکیم ساجد صاحب آپ کیسے ہیں۔ آپ کا تبصرہ اچھا تھا۔ ویسے منچن آباد والے کم کم آنے لگے ہیں۔ محفل میں اس بار بہت سے ساتھیوں کی بہت کمی محسوس ہوئی ہے۔ جاوید مقبول صاحب' عبداللہ شاہد' ارشاد قریشی' نازش' طاہرہ جبیں' فقیر لنگاہ بھائی' آپ سب خیریت سے ہوں بس یہی دعا ہے۔ کہانیوں میں بازی گر کی پہلی قسط پسند آئی۔ فرض' اپنا جال' سفر ہدایت اچھی تھیں باقی ابھی زیر مطالعہ ہیں گردش کی قسط میں نے تحریر کی ہے۔ ضرور بتائیے گا کہ کیسی لگی۔ اب اجازت چاہوں گی۔ اس دعا کے ساتھ کہ سب لوگ خوش رہیں اللہ پاکستان کی اور اس میں بسنے والے لوگوں کی حفاظت کرے آمین۔ زندگی رہی تو آئندہ ماہ ملیں گے۔ اللہ حافظ۔

مجاہد ناز عباسی...... سنجر پور! محترم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب السلام علیکم سدا خوش رہو پھولوں کی طرح مسکراتے رہو آمین۔ جناب میں نئے افق کے ایڈیٹر صاحب سے سخت ناراض ہوں۔ کیونکہ انہوں نے ایک بار پھر غلطی کردی میں نے پچھلے خط میں واضح طور پر بتایا تھا کہ میں سنجر پور میں رہتا ہوں لیکن پھر بھی میرے نام کے آگے سنجن پور لکھا گیا۔ کیوں بھائی؟ (مجھ سے کوئی دشمنی ہے کیا؟) اب میں ہاتھ جوڑ کر کہہ رہا ہوں کہ میرے نام کے آگے شہر سنجر پور لکھنا (شکریہ۔) اس بار شمارہ ٹائم پر ملا اور محفل میں اپنا نام پا کر بہت خوشی ہوئی۔ ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ حسینہ کے لبوں کی مسکان نے تو میرے دل میں تھرتھراہٹ پیدا کردی۔ (خود بخود آوازیں نکلنے لگیں کہ ہائے اللہ انی سوہنی کڑی) حسینہ کے لمبے لمبے بال اور اس کی موٹی آنکھیں کاجل سے دبی ہوئیں قابل تعریف تھیں اس کے کانوں کی بالی بھی

خودآواز دے رہی تھی کہ میں بھی کسی تعریف سے کم نہیں ہوں۔ (اوئے دیکھو بالیاں بھی بولنے لگ گئیں) اور سب سے بڑی بات یہ کہ حسینہ نے گلابی کپڑے زیب تن کیے ہوئے تھے۔ جو میرا فیورٹ کلر ہے۔ دستک میں مشتاق احمد قریشی صاحب نے ہمیں سیاسی لیڈروں پر غور کرنے پر مجبور کیا ہاں بھائی واقعی ایسا ہے جو بھی لیڈر آیا ہے وہ اس گمان میں پڑ جاتا ہے کہ اس کی کرسی مضبوط ہے۔ آج عوام کی آنکھیں بند ہیں ہم سب کچھ جانتے ہوئے بھی ان لیڈروں اور شاہی وڈیروں کے ہاتھوں کی کٹھ پتلیاں ہیں آج پاکستان کے حالات سے کون ہے جو ناواقف ہو ہماری نسلیں ووٹ دے دے کر ختم ہو گئیں مگر ہمارا نظام وہیں کا وہیں رہا۔ ہمارے عوام دن بدن غربت کی چکی میں پستی جا رہی ہے آج کا دور میڈیا کا دور ہے اب ہمیں نیند سے بیدار ہو جانا چاہیے اور اپنے ملک کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ آئے دن مہنگائی کی شرح 200 گنا بڑھ رہی ہے۔ عوامی حکومت کی آڑ میں غریب مکاؤ مہم جاری ہے ہمیں ان حکومتوں نے خودکش حملوں ڈرون حملوں، مسجدوں میں بم دھماکے جیسا کلچر دیا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک ہماری اور ہمارے ملک کی حفاظت کرے آمین۔ گفتگو میں عمران احمد نے ہمیں قربانی اور حج کے بارے میں اپنی قیمتی رائے سے نوازا۔ محمد اسلم جاوید کا نئے افق کے لیے ابھرتا ہوا جذبہ دیکھ کر بہت اچھا لگا۔ عالیہ انعام الٰہی کا تبصرہ کافی بڑا تھا لیکن اس کے ایک ایک لفظ میں سچائی تھی۔ عالیہ باجی کیسی ہیں آپ؟ عصمت اقبال عین صاحبہ کیسے مزاج ہیں آپ کے؟ عصمت باجی میں باقاعدہ رائٹر نہیں لیکن میں کوشش کر رہا ہوں کہ ایک اچھا رائٹر بن جاؤں۔ ریاض بٹ، شہناز بانو، شبنمی ارشاد، انجم فاروق ساحلی، عبدالحکیم ساجد اور عبدالرحمن ساگر کو بھی گفتگو میں پا کر بہت اچھا لگا۔ بزم میں ساری شاعری بہت پسند آئی۔ خوشبوئے سخن میں ریحانہ سعیدہ، محمد اسلم جاوید، شاہ روم خان ولی، ریاض حسین قمر اور فرح ناز کی غزلیں بہت پسند آئیں۔ ذوق آگہی میں ابن مقبول جاوید احمد صدیقی نے ہمیں "نماز" کے فوائد سے آگاہ کیا۔ آخر میں نئے افق کے تمام اسٹاف اور تمام نئے افق کے پڑھنے والوں کو میری طرف سے سلام۔

عالیہ انعام الٰہی...... کراچی! محترم عمران بھائی السلام علیکم! اللہ تعالیٰ سے امید اور دعاؤں کے ساتھ پھر سے حاضر خدمت ہوں۔ اللہ آپ کی ترقی و کامرانی میں اضافہ فرمائے آمین۔ ہمارے ذوقِ مطالعہ کی تسکین کے لیے "نئے افق" کے ادارے کے ذریعے کی جانے والی تگ و دو بہترین انداز سے جاری ہے۔ بس ایک ذرا غور فرمائیں سرورق کی بہتری پر۔ اب اسی ماہ دیکھ لیں کیا آخر کسی ٹوتھ برش کا اشتہار معلوم دیتا سرورق کیا تاثر پیدا کرے گا۔ پس منظر میں تو اکثر اوقات ہی کھنڈرات نما عمارتیں دکھائی دے رہی ہوتی ہیں۔ ماڈلز کی تصاویر بھی کچھ زیادہ جاذبِ نظر نہیں ہوا کرتیں۔ مشتاق انکل کی تحریر "دستک" ہر کمال کو زوال ہے۔ ایک ٹھوس حقیقت کا قلمی اور فکری جائزہ تھی۔ جس کے اصل فریق ہمارے حکمران ہی اس حقیقت سے نابلد ہیں یا پھر زعم کا نشہ کچھ ایسا سوار ہے کہ ہر سچائی سے آنکھیں پھیرے ہوئے ہیں۔ "گفتگو" کی محفل میں محبتیں لفظوں کے سانچے میں ڈھل کر اپنا جوبن دکھا رہی تھیں۔ آپ کے توسط سے ہم مختلف علاقوں میں رہنے والے مختلف اندازِ فکر رکھنے والے آپس میں کیسے کیسے دلی تعلق جوڑ چکے ہیں کہ حیرت بھی ہوتی ہے اور خوشی بھی ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرنا پھر ایک دوسرے کے لیے فکرمند رہنا۔ نئے افق کی تحریروں کو اپنی تعریف اور تنقید کی سند سے سنوارنے کی کوشش کرنا کتنا اچھا لگتا ہے۔ اللہ اس محفل کے حسن کو مزید نکھار عطا فرمائے آمین۔ شاذ بھائی کی غیر حاضری تشویش ناک ہوتی جا رہی ہے۔ بخش انکل کا نہ ہونا بھی کافی تکلیف دہ ہوتا ہے۔ آکاش بخاری کی غزلیں پڑھے کافی عرصہ ہو گیا کہاں ہو بھائی یہ تحریری ناغے ہم جیسوں پر ظلم ثابت ہو رہے ہیں اور ہاں یہ شبنمی جی آپ کون سا فائن لگا رہی ہیں۔ حالانکہ آپ کی تحریروں کی غیر حاضری کے باعث تو الٹا آپ پر فائن لگنا چاہیے۔ اب میں نے اپنا زاویہ نظر بدل لیا ہے آپ کی تحریریں بہت پُراثر معلوم ہونے لگی ہیں لیکن آپ نے تو اتر سے لکھنا ہی چھوڑ دیا۔ اب یہ زیادتی تو نہ کریں ناں۔ اقرا پڑھ کر ہم کافی سکون محسوس کرتے ہیں۔ حالات اور ماحول کے ہاتھوں آلودہ ہوتے ذہن و قلب کو ایک پرسکون سی طہارت میسر آجاتی ہے۔ جس کے لیے بہت بہت شکریہ۔ "بیت المقدس" تاریخ کے اوراق جن پر تبصرہ چند جملوں اور چند لفظوں میں کر دینا ناممکن ہوتا ہے کہ تاریخ تو بذاتِ خود انسانی اوقات کا بڑا دل کش مگر بڑا بے رحم تبصرہ ہوتی ہے کہ جو ہمارے لیے اصلاح کے دروازے کھولتی ہے۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم خود کو خوش قسمت ثابت کرتے ہیں یا بدقسمت "تحفہ خاص" ایثار اور قربانی کے میٹھے جذبوں سے گندھی بڑی شیریں تحریر تھی۔ زندگی میں محبت کا شہد کسی پاکباز دوشیزہ کے روپ میں میسر ہو یا دوستی کے لبادے میں ملفوف ہو زندگی خوب صورت بن جایا کرتی ہے۔ محبت، چاہت، قربانی، انقلاب یوں کہیں کہ لفظوں کی طویل فہرست ہے جنہیں ان کے اصل معنوں کے ساتھ زندگی میں شامل کر لیا جائے تو دنیا جنت بن جائے۔ "نامکمل ہستی" خودغرض اور نفرت کے کریہہ جذبوں کی عکاس تحریر تھی۔ اپنے مفاد اور اپنی ذاتی خواہشات کی تکمیل کے لیے انسان خود کو ذلت کے گڑھوں میں گرانے سے بھی نہیں چوکتا۔ اپنی نفسانی خواہشات کی تسکین اور اپنی ہوس کی تسکین کے لیے انسان منٹوں میں شیطان بن جایا کرتا ہے۔ اس تحریر کا اختتام انتہائی شاندار طریقے سے کیا گیا۔ "پشیمان" قتل کے معمے کی روداد تھی۔ انسانی عقل دنیا کی سب سے اعلیٰ شے ہے کہ انسان جس کے سہارے بڑے بڑے مسائل کا حل تلاش کر لیا کرتا ہے۔ ایک قتل کا معاملہ جس طرح سے اس تحریر میں حل ہوتے دکھایا گیا عقل دنگ رہ گئی۔ ہماری پولیس کی ٹریننگ میں لازمی طور پر انہیں ایسی تحریریں پڑھوانی چاہئیں تا کہ وہ بھی کچھ کارکردگی دکھا سکیں۔ کسی بھی مجرم کو نفسیاتی مار سے توڑ کر اعتراف جرم کروانے کا یہ ڈھنگ انوکھا معلوم دیا۔ جب کہ ہماری پولیس ابھی تک ڈرائنگ روم

کی سیر یا طریقہ نمبر تیرہ میں ہی الجھی ہوئی ہے۔ "بازی گر" کی پہلی قسط ثابت کر رہی ہے کہ آگے جا کر خوب رنگ جمائے گی۔ ابھی تو کاروباری ریشہ دوانیوں، بے ایمانیوں کے ساتھ ساتھ عشق کی سلگتی آگ جو اچانک ہی بھڑک اٹھی ہے اس تحریر میں دکھائی دیتی ہے۔ آگے جا کر کیا کیا تماشے دیکھنے کو ملیں گے۔ انتظار رہے گا۔ شہناز باجی کی قصوروار دعوتِ فکر دیتی تحریر تھی۔ بے راہ روی جو ہمارے یہاں برگر طبقے کا طرہ سمجھی جاتی ہے۔ کس طرح سے نچلے اور متوسط طبقوں میں اپنے پنجے گاڑھ رہی ہے۔ تو طبیعت وحشت کا شکار ہونے لگی ہے۔ خودنمائی کا چسکا اب معاشرے کے ہر طبقے میں سرایت کر چکا ہے اور اس کی شکل مزید مکروہ ہوتی جا رہی ہے۔ جس کا مظاہرہ ہمیں اپنے محلوں، گلیوں اور شاہراہوں پر کھلے عام دیکھنے کو ملتا ہے۔ مگر ہم اس چیز کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ وقت کی سنگینی کا احساس بھی کھو چکے ہیں۔ اللہ ہمارے حال پر رحم فرمائے آمین۔ "فلاپ ڈرامہ" قدرت کی کارفرمائی کا مظاہر تھی کہ قاتل ہزار پردوں میں بھی خود کو نہ چھپا لے اس کے گناہ کا پردہ چاک ہو کر ہی رہتا ہے۔ "انوکھا بندھن" ایک زمانے سے جوان ہوتے ہوئے جذبوں کی شدت اور پھر خوابوں کی دنیا میں رہنے والی لڑکیوں کو ملنے والے دھوکوں کی روداد تھی۔ حیرت ہوتی ہے مجھے ایسی لڑکیوں پر جو گھٹیا جذبوں کی خاطر خود کو سستا ثابت کرتی ہیں۔ پتا نہیں یہ کون سا جذبہ ہوتا ہے جس کو پاکیزہ محبت کا نام دے کر خود کو مظلوم ثابت کرنے بیٹھ جاتی ہیں۔ زہر لگتی ہیں مجھے ایسی تحریریں۔ "فرض" بھی قتل کے ایک کیس کی روداد تھی جسے ایک عقلمند پولیس والے نے چٹکی بجاتے ہی حل کر لیا اور اصل مزہ تو تب آیا جب مجرم کو اس کے تمام تر اثر و رسوخ کے باوجود کیفرِ کردار تک پہنچا دیا کہ ہمارے یہاں کے سیٹ اپ میں جرم کی کھوج کر لینا تو پھر آسان ہے مگر اسے سزا دلوانا کافی مشکل ہوتا ہے۔ "سفرِ ہدایت" خوب صورت تحریر تھی۔ جس میں کوئی کہانی تو دکھائی نہ دی ہاں خوب صورت وعظ پڑھنے کو بے شک ملے۔ یہ تحریر ناز کی فکری پاکیزگی کے ساتھ ساتھ ایک واعظ کا تاثر پیدا کرتی رہی۔ "اپنا جال" پھر ایک اور قتل کی کہانی جسے ایک انسپکٹر نے عقل کا استعمال کر کے حل کر لیا۔ عمران بھائی یہ اس بار آپ نے ساری ایک جیسے موضوع کی تحریریں کس خوشی میں شائع کر دیں یا پھر اتفاقاً ہو گیا۔ "خطروں کا کھلاڑی" سطر سطر دل کے تاروں کو چھیڑنے والی تحریر ہے۔ دل کشی اور رعنائی کا ایک ایسا مرقع جو شاید اگر شاملِ مطالعہ نہ ہوتا تو ہم خود کو نامکمل محسوس کرتے۔ ذوقِ مطالعہ کے لیے شراب سے زیادہ نشہ پیدا کرتی ہے یہ تحریر نہایت پسند آ رہی ہے۔ والسلام

محمد ارشاد قریشی...... اسلام آباد! محترم بھائی عمران احمد قریشی السلام علیکم! نئے افق کے نومبر اور دسمبر کے شمارے میرے سامنے پڑے ہیں اور میں سوچ رہا ہوں کیا یہ وہی نئے افق ہے جس میں میں نے پہلی بار لکھنا شروع کیا تھا۔ عمران بھائی اور ان کے معزز ساتھیوں کی زبردست محنت صاف دکھائی دے رہی ہے اور میرے ان لکھاری ساتھیوں نے اپنی محنت سے اس میں رنگ بھر دیے۔ میری دعا ہے کہ ہم سب لکھاری دوست عمران بھائی کی راہنمائی میں اسی طرح اس میں مزید نکھار لاتے رہیں۔ نئے سال کی آمد آمد ہے 2011، ہمیں چھوڑ کر جا رہا ہے۔ اس سال میں ہم نے جو کچھ دیکھا وہ ہم 2012، میں نہ دیکھیں اس سال میں بہت سے ساتھی معزز شخصیات لکھاری شوبز کے لوگ اور ہمارے عزیز ہمیں چھوڑ گئے۔ ان سب کے لیے دعا گو ہوں رب کریم ان سب کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے آمین۔ مزید دعا گو ہوں کہ ہمارا رب اس نئے سال کو ہم سب کے لیے باعثِ رحمت بنا دے۔ خوشیاں ہم سب کا نصیب ہوں۔ غم اور دکھ کا کسی کو پتہ بھی نہ ہو۔ ہمارے ارضِ پاک میں ہر طرح سے امن و سکون ہو۔ غریب خوش حال ہو۔ ادب کا بول بالا ہو اور سب سے بڑھ کر اسلام کا قانون نافذ ہو۔ آمین۔ اب آتا ہوں اپنی محفل میں کہانیوں میں سب ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ صرف اپنی پسند ظاہر کر رہا ہوں۔ دستک تو کوئی کہانی نہیں یہ تو سب کے لیے ایسا ہے کہ جو اس پر عمل کر لے اپنی زندگی بنا لے۔ پروردگار مشتاق احمد قریشی صاحب کو زندگی صحت و تندرستی دے آمین۔ شہناز بانو کی کڑی مسافت، قصوروار۔ ناز سلوش ذشے کی افتاد اور سفرِ ہدایت۔ راحیلہ تاج کی آزادی پسند اور نامکمل ہستی۔ زاہد حسین کی غلط راستا۔ مہتاب خان کی انوکھا بندھن پسند آئیں۔ باقی کہانیوں نے بھی اپنا معیار برقرار رکھا۔ بیت المقدس کو الماس صاحب خوب لے کر چل رہے ہیں۔ ریاض حسین قمر، عبدالحکیم ساجد، عبدالمالک کیف، سید عبداللہ شاہد، محمد عبداللہ عاطر، میرے محترم بزرگ فقیر محمد بخش لنگاہ نے اپنی تحریروں میں یاد رکھا بہت بہت شکریہ۔ شہناز بانو صاحبہ میں ٹھیک ہوں اور محفل میں حاضر ہوں شبنمی ارشاد صاحبہ آپ نے مجھے اور عالیہ انعام طاہرہ جبیں پر فائن کر دیا۔ بھئی فائن کیوں لگا اور کتنا لگا؟ خوش بوئے سخن میں انتخاب پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ شہناز بانو، عالیہ انعام، طاہرہ جبیں، ابن شاہین، صابرہ کلثوم آپ سب میرے لیے بہت احترام کے قابل ہو۔ اللہ پاک آپ سب کے نصیب خوشیوں سے بھر دے۔ آپ سب کو ایک اطلاع دیتا چلوں کہ ہماری محفل کے ساتھی لکھاری سید ناظم بخاری بھی رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے ہیں۔ سید ہاشم بخاری دیور بننے پر بہت خوش ہیں۔ ناظم آپ کو اور بھابی کو مقدس رشتہ مبارک ہو۔ سدا خوش و آباد رہو۔ سید آکاش بخاری، محمد فہد زاو، چاند، ابن مقبول جاوید احمد صدیقی، اللہ دتہ عابد، احمد علی کیف، آپ سب کہاں ہو بھائی محفل میں آؤ سب آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ خوش بوئے سخن میں عالیہ انعام الٰہی، عصمت اقبال عین، ریاض حسین قمر، رابعہ حسن، صابر لنگاہ، فرح ناز حسنین کی غزلیں بہت اچھی تھیں۔ مجاہد ناز عباسی آپ کو بھی سلام جو نام رہ گئے معذرت ان کو بھی سلام اپنے خط کو اس شعر پر ختم کرتا ہوں۔

وہ میرا ہو کے بھی محروم رہا مجھ سے ارشاد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیا کوئی میری طرح جیت کے ہارا ہوگا

پرانا خانیوال سے فقیر محمد بخش صابر لنگاہ لکھتے ہیں جناب عزیز من عمران احمد صاحب! ماشاء اللہ ہمارا محبت نامہ اس دفعہ ردی کی ٹوکری کی نذر کردیا گیا۔ دل دکھی ضرور ہوا مگر پھر بھی دعا گو ہیں کہ اللہ پاک آپ کو خوش رکھے شمارہ مورخہ 22-11-2011 منگل وار کو ملتان شریف سے ثقلین صابر لے آیا پہلے ہی چکر پر مل گیا۔ دل خوش ہوگیا اور دعائے خیر دل سے نکلی ہمارے فیملی ممبران کی طرف سے سچ بیانیاں تلاش بسیار کے بعد لکھ کر ارسال کی جاتی رہی ہیں لیکن ہمیں کبھی بھی حوصلہ افزائی سے نہیں نوازا گیا۔ کیا ہم کسی بھی طرح اس قابل نہیں ہیں جواب ضرور دیجیے گا۔ ہجری سال کے اول ماہ محرم الحرام کا آغاز ہو چکا ہے۔ اللہ پاک ہمارے ملک پاک و مسلمانان اسلام کو اس ماہ اپنی رحمتوں سے نوازے اور سابقہ سال کی طرح جیسی آفات ومشکلات سے راہ نجات دے اور سچ یہ ہے کہ ماہنامہ پیارا تو ضرور حاصل ہوگیا ہے لیکن بعض مجبوریوں بیماری کی زیادتی کی وجہ سے رفتار نہ ہونے کے برابر ہے۔ فقط حاضری شمارہ جنوری 2012ء کے لیے محبت نامہ ارسال کررہے ہیں۔ شامل کرنا یانہ کرنا آپ کی صوابدید پر منحصر ہے۔ باقی ردی کی ٹوکری تو ہے ناں دل والوں کے لیے آپ کے پاس۔ حسام بٹ صاحب کی بازی گر قسط اول اور شہناز بانو صاحبہ کی قصوروار اور راے حمید صاحب کی خطروں کا کھلاڑی اور الماس ایم اے صاحب کی تاریخ کے اسباق سے آشنائی بیت المقدس کا مطالعہ کیا گیا ہر رنگ نے خوش کردیا اور جو بلڈ پریشر محفل میں غیر حاضری شمولیت کی وجہ سے ہوا یعنی بڑھ گیا تھا اس میں کافی کمی ہوئی اور ایکشن سسپنس تیزی میلان کی برقراری نے جہاں سکون دیا وہیں پر سبق کی راہیں جرم وسزا محبت ونفرت اور قانون قدرت کے رنگوں میں ڈوبی ہوئی سچ بیانیاں سفر ہدایت ناز سلوش ذشے اور اپنا جال انجم فاروق ساحلی صاحب اور انوکھا بندھن مہتاب خان راوی نے یہ سبق دیا کہ ہم تو ہم رہے مگر اس دنیا میں ہم سے بھی زیادہ دکھی موجود ہیں اور دل سے دعا نکلی کہ اللہ پاک ہم سب پر رحم وکرم کرے اور صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق دے باقی ان تحریروں کے مصنفین کو سلام محبت اور دعاؤں کا پیغام پیش ہے۔ محترم بزرگوار قریشی صاحب کی دستک نے جہاں دل کے دروازے پر دستک دی اور سبق حاصل کرنے کا درس دیا وہیں پر جناب طاہر احمد قریشی صاحب نے اقرا میں دینی سبق جھوٹ کی بعض خفی اقسام پر حدیث مبارکہ کا سبق دیا۔ کسی نے کیا کہا کہ جھوٹا جگ دا پیار مگر جھوٹ کافی برائیوں کو جنم دیتا ہے اور ایک جھوٹ بول کر اپنی عزت بچانے کے لیے کئی جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ جھوٹ رزق کو کھاجاتا ہے۔ لہٰذا اللہ پاک جھوٹ سے بچائے اور سچ بولنے کی توفیق دے دعا گو ہوں اگلے سبق کا انتظار رہے گا۔ بزم سخن، خوش بوئے سخن اور ذوق آگہی میں ادبی ذوق رکھنے والے بہن بھائیوں کا مقابلہ شمولیت جس کا انتخاب روبین احمد صاحب، محمد احمد شہزاد اور عفان احمد صاحب نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق کیا اور صدارتی کرسی کے حق دار ٹھہرے سمیرا بانو صاحبہ، عالیہ انعام الٰہی صاحبہ اور ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب ہماری طرف سے تینوں عزیزان گرامی کو سلام دعا۔ ادارہ کے نام محبت ناموں کی مد میں صدارتی نمبر محمد اسلم جاوید صاحب نے حاصل کیا۔ مبارک ہو بھائی اچھا لکھ رہے ہو خوش، دوسرے نمبر پر صاحب زادی عالیہ انعام الٰہی صاحبہ اپنے بیان ماہنامہ کو سابقہ روٹین پر تاکہ اچھی خواہش کا جنازہ نہ اٹھ سکے بلکہ ماہنامہ زرخیز ہے۔ بہت خوب صورت الفاظ میں حالات کا جائزہ پیش کیا۔ واہ خوب صاحب زادی دل خوش کردیا۔ شعر بھی خوب تھا۔ باقی میرے بارے میں محبت بھری باتوں اور دعاؤں نے خوش کردیا۔ جیتی رہو بیٹی آباد وشاد رہو فقیر کی دعائیں اور سلام مع حسنین وثقلین دیگر ممبران آپ کے نام ہے۔ عصمت اقبال عین صاحبہ خوش رہو بہت اچھے انداز میں قدم سے قدم بڑھا کر گفتگو کی رونق، خیالات کے موتی پرو کر پیش کررہی ہو اللہ پاک آپ کو کامیابی دے باقی بابا لوگ ہم تو صرف دعا ہی کرسکتے ہیں اور کررہے ہیں آپ کی یاد پر فقیر یہ شعر محفل گفتگو کے سنگ پیش کررہا ہے۔

وہ جو بوڑھا گلی میں رہتا ہے
حال پوچھو تو بس دعا دیتا ہے

برادر ریاض بٹ صاحب دلی سلام ودعا۔ آپ کے خوب صورت شعر نے زندہ رہنے کی نوید دی۔ خوش رہو بابا لوگ آپ کا مرسلہ محبت گفتگو پسند آیا۔ میرے بارے میں آپ کے خیالات نے دلی خوشی دی فقیر کی دعا ہے کہ آپ سدا خوش رہیں۔ دل خوب صورت ہو تو سب ہی خوب صورت نظر آتے ہیں۔ اللہ نبی وارث ہو آپ کا میرے عزیز۔ پانچویں اسد کے نمبر پر اپنے قلم کا جادو جگائے پیاری بہن شہناز بانو براجمان تھیں۔ تو سسٹر صاحبہ مع برخوردار اسعد علی وارشد علی شہاب صاحب اور بڑے بھائی صاحب یعنی فقیر کا حسنین کا ثقلین کا تمام ممبران کا بہت بہت سلام اور دعائیں۔ باقی بہن ہم نہ ہوں گے تو کوئی ہم سا ہوگا یہ تو سدا ہوتا آرہا ہے مگر کچھ لوگ دل میں سماجاتے ہیں اور دل تو خدا کا گھر ہے اور اللہ پاک آپ کو اپنی امان میں رکھے۔ فقیر تو بہن کے علاوہ بھی آپ کو استاد سمجھتا ہے زنجیر میں بار بار دہرائی جانے والی دعا جو کہ اسم اعظم کہلاتی ہے یعنی کہ یا حی یا قیوم برحمتک استغیث کی وجہ سے کہ اس کی روزانہ تسبیح کرنا فقیر کا معمول بن گیا ہے اور آپ کی دعاؤں کا میں طلب گار ہوں۔ عطارد کا نمبر صاحبزادی شہنی ارشاد نے سنبھالا ہوا تھا۔ بیٹی وعلیکم السلام اور دعائیں کہ خوش رہو۔ کیا بات ہے آج کل بہت غیر حاضری کر رہی ہو۔ خیر تو ہے ناں؟ باقی آپ نے کسی ماہ نامہ میں لکھا تھا کہ موبائل نمبر دینے کا سبق تو میرے والد صاحب ہی نے نہیں دیا مگر فروری

2010ء میں آپ کی سچ بیانی کے ساتھ آپ کا ای میل لکھا ہوا تھا۔ اس میں سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے آگاہ ضرور کرنا۔ میزان کے سنگ برخوردار انجم فاروق ساحلی صاحب اپنے قلم کا جادو جگائے ہوئے ہم تو صرف دعا ہی کرسکتے ہیں۔ بابا لوگ عقرب کے رنگوں میں عبدالحکیم ساجد صاحب منچن آباد کی زمین بڑی ہی زرخیز ادب نظر آتی ہے اور آپ بھی اسی زمین کے سپوت ہیں اللہ پاک آپ کو کامیابیوں کامرانیوں سے نوازے۔ محترم مجاہد عباس ناز صاحب اور عبدالرحمن ساغر صاحب نے بھی خوب حاضر دی۔ جناب عزیزان من محمد عبداللہ عاطر صاحب، ریحانہ سعیدہ صاحبہ، صاحب زادی طاہرہ جبیں تارا، محترمہ این شاہین صاحبہ، برادر دل شاد حسین صاحب، عبدالمالک کیف صاحب، محمد خان مجاہد صاحب، سید عبداللہ شاہد صاحب، محمد سرور شاذ صاحب، روبین شاذ صاحبہ، فیاض حسین آکاش بخاری صاحب، محمد ظفر شاہین صاحب، محمد فاروق انجم صاحب، محترمہ فریدہ جیلانی صاحبہ، ناظم بخاری صاحب، محمد فہد جتوئی صاحب، سہیل عمران صاحب، سلمیٰ غزل صاحبہ، حسنین بلوچ صاحب، اللہ دتہ عابد صاحب، ماہ لقا صاحبہ، ابن مقبول جاوید احمد صدیقی اور احمد علی کیف صاحب کی ماہنامہ نئے افق محفل گفتگو سے غیر حاضری دل نے شدت سے محسوس کی اللہ پاک خیر کرے دل سے دعا نکلی باقی سلام محبت۔ اس کے ساتھ اب رخصت چاہتے ہیں۔ والسلام

ریاض حسین قمر ...... منگلا ڈیم! محترم ومکرم جناب عمران احمد صاحب! امید ہے آپ مع اپنے مخلص عملہ کے بالکل با خیریت ہوں گے اور نئے سال کے پہلے شمارے کی تیاریوں میں لگے ہوں گے۔ خداوند کریم آپ سب کو ہمت اور حوصلہ عطا فرمائے آمین۔ ماہ دسمبر کا نئے افق نظر نواز ہوا۔ ہنسنے کے انداز میں مسکراتے چہرے والی حسینہ نے ٹائٹل کو چار چاند لگادیے ہیں۔ دستک میں جناب مشتاق احمد قریشی صاحب نے پاکستان کا سیاست نامہ اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ واقعی کسی حکمران نے کسی حکمران سے سبق نہیں سیکھا۔ ہر کوئی اقتدار کے نشے میں مست ہاتھی بنا رہا اور آخر منہ کے بل گر کر اپنے دانت تڑوا بیٹھا۔ کسی بھی حکمران نے شاید شداد، نمرود اور فرعون کے انجام سے آگاہی حاصل نہیں کی۔ وہ لوگ تو اپنے آپ کو اتنا طاقت ور سمجھتے تھے کہ خدا کہلواتے تھے مگر انجام کار ذلت کی موت منوں مٹی کے نیچے چلے گئے اور کسی کو رب ذوالجلال نے آنے والوں کے لیے سامانِ عبرت بنایا اور ان کا جسم رہتی دنیا تک محفوظ فرمادیا۔ پچھلے ماہ گفتگو میں شریک نہ ہوسکا۔ دراصل میرے بیٹے انجینئر محمد صدیق کی شادی خانہ آبادی تھی۔ اب شادی کی مصروفیات سے فارغ ہوا ہوں تو ان شاء اللہ ہر ماہ گفتگو میں حاضر ہوتا رہوں گا۔ گفتگو کے آغاز میں آپ نے جو ایک مثال پیش کی ہے۔ وہ ہم سب کے لیے مشعلِ راہ ہونی چاہیے۔ گفتگو میں محترمہ عالیہ انعام الٰہی نے اپنے طویل خط میں جن جذبات کا اظہار کیا ہے وہ نئے افق کے ہر قاری کے دل کی آواز ہے۔ کاش ایسی باتوں کو کسی صاحب اقتدار کا کوئی کارندہ ہی پڑھ لیتا تو شاید حکمرانوں کے کان پر جوں رینگ جاتی۔ اس بار عصمت اقبال عین صاحبہ ایک منفرد انداز میں گفتگو میں شریک ہوئی ہیں۔ ان کا انداز گفتگو واقعی دل موہ لینے والا ہے۔ محترمہ شہناز بانو صاحبہ کو گفتگو میں شریک پا کر دل کو گونا گوں خوشی نصیب ہوئی۔ پلیز باقاعدگی سے تشریف لاتی رہا کریں۔ میرا خط اور تبصرہ پسند فرمانے کا تہہ دل سے شکریہ۔ محترمہ شہنی ارشاد صاحبہ تو مہمانوں کے جھرمٹ میں رہیں پھر بھی گفتگو میں تشریف لے آئیں بہت اچھا لگا۔ ان کے علاوہ جناب محمد اسلم جاوید صاحب، انجم فاروق ساحلی، عبدالحکیم ساجد، مجاہد ناز عباسی اور عبدالرحمن ساغر صاحب کے خطوط اپنی اپنی جگہ بہت خوب تھے۔ جناب عبداللہ عاطر صاحب اس بار شریکِ گفتگو نہ ہوئے بہت کمی محسوس ہوئی۔ اس کے علاوہ ہمارے محترم جناب محمد بخش صابر لنگاہ صاحب نے شرکت نہیں فرمائی۔ اقرا میں جناب طاہر قریشی صاحب نے جھوٹ کے اثرات کو ہمارے دلوں میں بٹھادیا۔ اس بار بیت المقدس کی قسط بہت جاندار تھی۔ مصنف تک میری مبارک باد پہنچا دیجیے گا۔ محترمہ شہناز بانو کا ''قصوروار'' ایک ایسا نشتر ہے جس کی نوک تہذیب نو کے جسد ناپاک میں چبھوئی گئی ہے۔ کاش یہ جسم فاسد مادے سے پاک ہوجائے اے کاش فلاپ ڈرامہ بھی ہمارے معاشرے میں جنم لینے والی ایسی کہانی ہے جس سے ہمیں سبق حاصل کرنا چاہیے۔ کہانی میں سسپنس آخر تک قائم رہا۔ مصنف مبارک باد کے لائق ہیں فرض میں جو کردار پیش کیا گیا ہے کاش سب لوگ اس کی پیروی کریں اور اپنے فرائض کی ادائیگی اس طرح کریں بزم سخن میں اشعار کا انتخاب لاجواب ہے۔ خوش بوئے سخن میں محترمہ عالیہ انعام الٰہی، سمیع جمال، محمد اسلم جاوید، شاہ روم خان ولی کی غزلیں بہت اچھی ہیں۔ ان کے علاوہ عصمت اقبال عین صاحبہ اور جناب عبداللہ عاطر صاحب کی غزلیں منفرد انداز لیے ہوئے ہیں اللہ کرے زور قلم اور زیادہ محترمہ رابعہ صابر لنگاہ اور غلام سکینہ صابر لنگاہ کا انتخاب بہت اچھا ہے۔ اگر شاعر کا نام بھی دے دیا جاتا تو سونے پر سہاگہ ہوتا۔ ذوق آگہی میں ہر آئٹم دل کش اور سبق آموز ہے۔ اتنا اچھا شمارہ پیش کرنے پر آپ سب مبارک باد کے مستحق ہیں۔ خدا تعالیٰ آپ سب کی عمروں میں برکت عطا فرمائے۔ آمین

سید عبداللہ شاہد ...... حیدر آباد۔ محترم جناب من عمران احمد قریشی صاحب! السّلام علیکم! خدائے برحق سے امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے اور میرے خوب صورت رفیق اور محبوب رسالے ''نئے افق'' کی ترقی وسربلندی کے لیے مصروف کار ہوں گے۔ عرصہ ہوا آپ کے شرف ملاقات سے وابستہ یادیں اب دھندلائی محسوس ہوتی ہیں۔ مریض دل کو بروقت دوا ملتی رہے تو وہ کما حقہٗ غم روزگار کی ریشہ دوانیوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے کوششوں میں لگا رہتا ہے۔ نئے جذبوں اور نئی توانائیوں سے زندگی کی خوشیوں کے لیے تگ ودو میں سرگرم ہوجاتا ہے۔ یہ احساس محض اس وجہ سے ہوا ہے کہ پچھلی بار آپ کو حسب عادت مکمل تبصرے کے ساتھ نامۂ پرخلوص ارسال کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا لیکن افسوس وہ گفتگو میں شامل اشاعت نہیں کیا گیا۔ ممکن ہے محکمۂ ڈاک میں آگے پیچھے دم بھرنے والے رقیب روسیاہ کی بدنظری کا شکار ہو گیا ہو۔ میر اللہ بدخواہوں کی موشگافیوں کا بحقِ قدرت جواب دینے والا ہے۔ اس مرتبہ ماہ نومبر کا تازہ شمارہ بروقت موصول ہو گیا تھا۔ جس کے لیے آپ کا مشکور ہوں۔ چند ماہ قبل جو دو مسودات آپ تک نہیں پہنچ سکے تھے انہیں ری رائٹ کر کے دوبارہ آپ کی خدمت میں بھیجا تھا امید ہے کہ اس بار مل گئے ہوں گے۔ امید کرتا ہوں کہ یہ تحریریں "کمپنی" اور "ترازو" کو قریبی اشاعت میں شائع کر کے دل ناصبور کی دعائیں لیں گے۔ اس مرتبہ کا سرورق دیکھ کر محبت و مروت سے آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔ خانقاہِ شاہی سے باہر کھڑی دوشیزہ جذبہ خودی سے یوں متعارف کروا رہی تھی گویا کہہ رہی ہو کہ میں ہوں نا پھر کیوں گھبراتے ہو تم۔ اے میرے ہم وطن میں استعماری لادینی طاقتوں کے خلاف تمہارے ساتھ مل کر مقابلہ کروں گی اور صعوبتیں برداشت کروں گی۔ نئے افق کی دیرینہ نقاد محترمہ عالیہ انعام الٰہی گفتگو میں رائے زنی کرتے ہوئے فرماتی ہیں کوئی خیال اجاگر کرتا ہوا سرورق تو دیکھے مدت گزر گئی۔ اس سرورق کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اگر آپ تنقید برائے اصلاح پر یقین رکھتی ہیں اور واقعی اپنے فکر و فلسفے میں سچی ہیں تو یقیناً اسے ایک بامقصد اور متاثر کن سرورق کہیں گی اگر نہیں تو میں یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گا کہ تبصرہ کرتے وقت آپ کو اپنی ذات کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اب نئے افق کی منتخب اور دل آویز کہانیوں کے بارے میں کچھ چیدہ چیدہ طریقے سے بات کرتا ہوں۔ سب سے پہلے سچی کہانیوں کا مطالعہ کیا۔ مہتاب خان کی تحریر "انوکھا بندھن" محبت، وفا اور ایثار جیسے کمیاب جذبوں کی حامل ایک خوب صورت کہانی تھی۔ اس مرتبہ شہناز بانو خلاف توقع ایک مختصر سچ بیانی "قصوروار" لے کر حاضر ہوئی تھیں۔ کہانی کے کلائمکس میں سورہ نور کے حوالے سے خواتین کی بے پردگی اور حجاب کے بارے میں جو تنبیہہ اور سخت وعید کی گئی تھیں اس سے آج کی بے باک عورتوں کو سبق حاصل کرنا چاہیے مبادا وہ بھی کسی ارشید کے ہاتھوں اپنی عصمت گنوا بیٹھیں۔ شہناز جی نے قرآنی تعلیمات کی روشنی میں کہانی لکھنے کا اچھا تجربہ کیا ہے لیکن کہانی مختصر نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس سے بھرپور تاثر قائم نہیں ہو پائے گا۔ ان کے ساتھ ہی انور فرہاد کی کہانی فلاپ ڈرامہ، جرم و سزا پر مبنی ایک اچھی اور معیاری تحریر پڑھنے کو ملی۔ ان کے علاوہ فرض شعیب شیخ اور اپنا جال محمد فاروق انجم شعبہ تحقیق و تفتیش کے حوالے سے عمدہ معمہ کہانیاں تھیں۔ اس دفعہ ناز سلوش ذشے نے مقبوضہ جموں کشمیر کے تناظر میں "سفر ہدایت" لکھ کر ورطۂ حیرت میں مبتلا کر دیا۔ اپنے دعوے کے مطابق نازش نے پوری اسٹوری میں ایک بھی انگریزی لفظ استعمال نہیں کیا اور سچ بیانی کے سنجیدہ اور حساس موضوع کو دلچسپ اور سہل پیرائے میں تنازعۂ کشمیر کے معروضی حقائق کے ساتھ قلم بند کیا۔ اس مرتبہ محترم بزرگوار مشتاق قریشی کی "دستک" بعنوان "ہر کمال کو زوال ہے" پاکستان کے حکمرانوں کے اصلاح احوال کی کوششوں کا تسلسل تھی۔ سیاست کے افق پر منڈلاتے بادلوں کے تغیراتی گھن گرج سے ایسا لگتا ہے کہ پاکستان کے عوام پر آزمائش کا دور اب ختم ہونے کو ہے اور آئندہ ہونے والے الیکشن ہماری ترقی و خوشحالی اور خود مختاری کی نوید سنائیں گے اور صبح نو حقیقی خوشیوں اور مسرتوں کے پیغام کے ساتھ طلوع ہو گی۔ اللہ عزوجل میرے وطن پاک کے غریب اور غیور عوام کو یہ روشن دن دیکھنا نصیب ہو آمین۔ قرآن و حدیث کی سچی خوشبوؤں سے مہکتے "درس و تدریس" سے آگہی بخشتے اقرأ کے صفحات میں اس مرتبہ محترم طاہر قریشی جھوٹ کے مخفی اقسام کے بارے میں دلنشین لفظوں میں توضیح فرما رہے تھے۔ یہ دین اسلام کی تعلیمات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے سیر حاصل معلومات کا موجب سلسلہ ہے جو زہد و تقویٰ اختیار کرنے والے خواتین و حضرات کے ایمان و یقین کے جذبوں کو پاکیزگی، طہارت اور تقدس عطا کرتا ہے اور یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ دین کی حدود و قیود کو اپنے خوب صورت بدنوں میں راسخ کیے بنا ہم دنیا و آخرت کا سکون اور قلبی اطمینان حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔ اس بار مغربی کہانیاں اپنے منفرد موضوع کے لحاظ سے یادگار ثابت ہوئیں۔ محمد بدر منیر کے "تحفہ خاص" تین محبت کے ماروں کے درمیان ایک دل کش حسینہ کی رنگین اٹھکھیلیوں کا پرفریب و پرلطف ماجرا تھا۔ "نامکمل ہستی" اپنے نا سمجھ آنے والے اختتام کے لحاظ سے نامکمل کہانی ثابت ہوئی قسم لے لیں۔ اب کچھ عالی جناب اقبال بھٹی کی "پشیمان" کے بارے میں انسپکٹر ریمنڈ زرخیز و چست دل و دماغ اور ہمہ جہت صلاحیتوں کا مالک شخص تھا۔ کہانی ہنڈریڈ میں سے نائنٹی یعنی نوے فیصد مارکس لے کر رہی۔ بھٹی صاحب کی اسٹوریز کو میں ہمیشہ پہلی فرصت میں پڑھتا ہوں۔ بہت مشاق طبع سے لفظوں کو قرطاس پر بکھیرتے ہیں اب آپ کی اجازت سے شرکائے گفتگو سے بات چیت ہو جائے۔ اس مرتبہ محمد اسلم جاوید مسندِ اول پر دکھائی دیے۔ جاوید صاحب کو دلی مبارک باد۔ ان کے بعد عالیہ انعام الٰہی کافی حیلے بہانوں کے ساتھ رونق افروز نظر آ رہی تھیں۔ سوا دو صفحات پر عالیہ نے کیسی بھانت بھانت کی خواہشات کا اظہار کیا تھا۔ میرا یہ کہنا بے جا نہیں ہے کہ کون دیتا ہے دینے کو منہ چاہیے۔ یہ تو محض عمران بھائی ہیں جو ہر ایک کی تاویلوں کو سنتے ہیں اور شد و مد سے کی گئی لن ترانیوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں محترمہ عالیہ جی نے میری کہانی "کالی عورت" پر تبصرہ کرنے کے بجائے ازراہِ تشفی فرمایا کہ میں نے خواتین کی کمزور ہوتی حقیقت پر تشویش کا اظہار کر کے انہیں پرلطف کر دیا۔ تو پلیٹ، چمچ، ہانڈی، ڈش، نمک دانی، وغیرہ کی تانیث سے اپنے دسترخوان کو بصد شوق سے آراستہ کیجیے اور اپنے مزے کو دوبالا کیجیے۔ اس مرتبہ بھی محفل سے بہت سے دوست احباب کی کمی کا احساس ہوا بہرحال خاطر لحاظ رکھنے والے اور تفریح ذوق و شوق کو بڑھانے والے بعض دیرینہ ساتھی حاضر باش نظر آ رہے ہیں۔ عصمت اقبال عین نے میرے تبصرے پر اپنی قیمتی رائے سے نوازا، خود پر اور قلم پر اعتبار اور حوصلہ بڑھا۔ عصمت نے

اسمبلی کے اجلاس کی صورت گری میں گفتگو کے ممبران کے تبصروں پر دلچسپ و منفرد انداز میں رائے زنی کی اور اپنی موجودگی کا احساس برقرار رکھنے میں کامیاب ہیں۔ محفل کی ہردل عزیز اور گریس فل خاتون شہناز بانو بھی اپنے پرخلوص تبصرے کے ساتھ موجود تھیں۔ آپ نے "کالی عورت" کے بارے میں رائے زنی کرتے ہوئے کہا کہ میری تحریریں جیسی ہوتی ہیں یہ کہانی ویسی نہیں تھی۔ شہناز جی بات یہ ہے کہ سچی کہانی لکھتے وقت میں محسوس کرتا ہوں کہ فکر و فلسفے کا بھوت مجھ پر سوار ہو جاتا ہے اور کہانی بن جاتی ہے آپ غور فرمائیں گی تو یہ فرق محسوس ہو جائے گا کہ میں نے "کالی عورت" کو کہانی کی طرز پر روانی اور چابکدستی سے لکھنے کی کوشش کی ہے اور فکر و فلسفے کے آسیب سے بچنے کی کماحقہ سعی کی ہے۔ خط و تحریر کی وصولیابی کے حوالے سے آپ کی تسلی و تشفی سے جذبوں کو تقویت ملی ہے۔ برادر ارشد علی شہاب اور بھائی مسز شہاب کو میرا اسلام اور نیک خواہشات ضرور پہنچائیے گا۔ ان کے علاوہ شہنی ارشاد، ریاض بٹ، انجم فاروق ساحلی، عبدالحکیم ساجد نے اپنے پرخلوص لفظوں سے "کالی عورت" پر اپنی قیمتی رائے دی ہے اور سابقہ تبصرے کو بھی سراہا ہے۔ آپ سب کا بے حد مشکور ہوں۔ مجاہد ناز عباسی اور ساغر صاحب کے تبصرے مختصر مگر اچھے تھے۔ آخر میں سلسلے وار ناولوں کے بارے میں بھی کچھ عرض کرتا چلوں۔ "بیت المقدس" (الماس ایم اے) کی تازہ قسط میں قبلۂ اول اور مسجد اقصیٰ کی یہودیوں سے آزادی کے پس منظر میں کچھ خد و خال واضح ہوئے ہیں۔ امید ہے یہ ناول اگلی اقساط میں قارئین کو اپنے سحر میں جکڑ لے گا۔ حسام بٹ کی "بازی گر" کا آغاز ایکشن، تھرل اور ہنگامہ خیزی کا پیش خیمہ محسوس ہو رہا ہے۔ بقول شاعر "دست جنوں رہے نہ رہے آستیں رہے" کے مصداق جستجوئے ہائے تمام میں یوں گھسان کا رن پڑے گا کہ اختر شیرانی، میرا جی اور حبیب جالب کی آشفتہ تری اور ہیبت کزائی اور شوق تماشا اپنے عروج پر ہو گا۔ اس بار "گردش" میں ہمارے ہیرو شاہ زمان کو چور پر مور کے مصداق ایک تیسرے گروپ سے واسطہ پڑ گیا ہے۔ خدا کرے جابر اور بینا شاہ ہو کے سپورٹر ثابت ہوں۔ سب سے آخر میں محترم اے حمید صاحب کا سفر نامہ بھی پڑھ ڈالا۔ انہوں نے دلچسپ اور پرلطف لفظوں میں "برما" کے جنگلات اور وہاں وقوع پذیر ہونے والے جنگلی جرائم کا بھی تذکرہ کیا۔ اپنے عشق کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے جنگلی کی بیوی کے دودھ کی چائے کا لطیفہ خوب چست کیا! اللہ ان کی روح کو غریق رحمت کرے کہ وہ اپنی رگ ظرافت تو پھڑکا گئے لیکن اس ہنسی کا کیا کروں۔ جو اس لطیفے کو یاد کر کے بے اختیار منہ سے چھوٹ جاتی ہے۔ عمران بھائی اس حوالے سے آپ ہی روک تھام کیجیے گا۔ اب آخر میں خوش بو سخن کی نئی انچارج "سیما بنت عاصم" کو میری جانب سے ذمہ داری سنبھالنے پر نیک تمنائیں اور دعائیں۔ منظومات میں عبدالحکیم ساجد کا "اداس شہزادہ" عصمت اقبال عین کی غزل "دل کی بات" بہت خوب صورت اور معیاری لگیں۔ تازہ کہانیاں جلد ارسال کروں گا۔ صبر و استقامت کے لیے دعا کیجیے گا۔ والسلام

طاہرہ جبین تارا...... لاہور! امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے۔ کافی عرصہ بعد محفل میں شریک ہو رہی ہوں۔ دراصل کالج میگزین اور پھر کالج میں غیر نصابی سرگرمیوں کی وجہ سے اتنی مصروف رہی کہ نہ تو بروقت نئے افق کا مطالعہ کر سکی اور نہ ہی کہانیوں پر تبصرہ کر سکی۔ بہرحال تمام ساتھیوں کی شکر گزار ہوں جنہوں نے میری کمی محسوس کی۔ مجھے یاد رکھا۔ اس مہینے فرصت تھی سوچا کہ کہانیوں پر تبصرے کے ساتھ حاضری دوں گی۔ مگر عمران صاحب کی مہربانی سے ابھی تک نئے افق نہیں مل سکا۔ اب ہاکر سے کہا ہے تو اس نے بھی یہی کہا ہے کہ اس بار [illegible] آیا دو چار دنوں کے بعد دے جاؤں گا۔ پوسٹ مین سے پتا کیا ہے تو اس نے کہا ہے آپ کے نام جتنی ڈاک آتی ہے میں حفاظت سے دے جاتا ہوں۔ نئے افق آیا ہی نہیں ہے۔ تو جناب یہ کراچی پوسٹ آفس والوں کی کارستانی ہے۔ دسمبر کا مہینہ ہے۔ میمو اسکینڈل، نیٹو حملہ، مہنگائی، بجلی و گیس کی لوڈ شیڈنگ، انقلاب، لانگ مارچ، سب کچھ وہی ہے۔ جو سال کے آغاز میں تھا اور اب جب کہ سال کا اختتام ہو رہا ہے تو مسائل اور مشکلات کم نہیں ہوئیں بلکہ گزرتے وقت نے ان میں اضافہ ہی کیا ہے۔ زندگی آسان نہیں بلکہ پہلے سے مشکل ہی ہوئی ہے۔ نہ جانے آنے والا سال اہل پاکستان کے لیے کیا لے کر آتا ہے۔ امید، مایوسی، کشمکش ہر فرد کی زندگی آج کل ان تینوں لفظوں کے گرد گھوم رہی ہے۔ امید کی کرن نمودار ہوتی ہے امنگ اور جذبہ پیدا ہوتا ہے مگر کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ رونما ہو جاتا ہے کہ امید کی کرن مایوسی میں بدل جاتی ہے۔ اقتدار پر براجمان مست الست ہیں اور عوام مشکلات کی چکی میں پس رہی ہے۔ ہوائیں زرد پتوں کو گرا کر سبز کونپلوں کی نوید تو دیتی ہے مگر حالات و واقعات کو دیکھتے ہوئے ان کونپلوں کے پنپنے کی امید نظر نہیں آتی۔ کاش کہ ہمارے حکمران دسمبر کے مہینے میں اپنا احتساب کریں کہ انہوں نے جنوری سے دسمبر تک عوام کو کیا دیا۔ مہنگائی، لوڈ شیڈنگ کا عذاب، خودکشیاں، بے روزگاری، دہشت گردی، لوٹ مار قتل و غارت اور خود کیا لیا۔ ڈالر، بے غیرتی اور بھیک اب تو یہی دعا ہے کہ آنے والا سال ان مفاد پرست حکمرانوں سے نجات دے اور عوام کی زندگی آسانیوں سے ہمکنار ہو۔ تمام ساتھیو اور نئے افق کو سجانے والوں کے لیے بھی یہی دلی دعا ہے کہ آپ سب کی خواہشات پوری ہوں۔ زندگی غموں سے نا آشنا رہے اور زندگی کی تمام خوشیاں اور آسائشات و سہولتیں آپ کا مقدر بنیں۔ پلیز اب نئے افق جلد بھجوا دیجیے گا تاکہ اگلے ماہ میں کہانیوں پر تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں۔ ایک کہانی "تہی داماں" بھیج رہی ہوں امید ہے کہ قریبی اشاعت میں جگہ دے کر مشکور فرمائیں گے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اقرأ

ترتیب: طاہر قریشی

خیانت کی بعض خفی قسمیں:۔

جس طرح بعض جھوٹ اس قسم کے ہیں کہ بہت سے لوگ ان کو جھوٹ ہی نہیں سمجھتے' اسی طرح خیانت کی بھی بعض صورتیں ایسی ہیں کہ بہت سے لوگ ان کو خیانت ہی نہیں جانتے' اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں بھی امت کو واضح طور پر آگاہی دی ہے' اس سلسلہ میں ذیل کی حدیثیں پڑھیئے:۔

(۲۰۹)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ابوالہیثم القیہان سے فرمایا:۔ جس سے کسی معاملہ میں مشورہ کیا جائے وہ اس میں امین ہے اور اس کے سپرد امانت کی جاتی ہے۔

(جامع ترمذی)

(تشریح) ابوالہیثم بن القیہان نے ایک معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ چاہا تھا' اس موقع پر آپ نے ان سے یہ ارشاد فرمایا' جس کا مطلب یہ تھا کہ جس سے کسی معاملہ میں مشورہ لیا جائے اسے چاہئے کہ وہ محسوس کرے کہ مشورہ چاہنے والے نے اس کو اعتماد اور بھروسہ کے قابل سمجھ کر اس سے مشورہ چاہا ہے اور اپنی ایک امانت اس کے سپرد کی ہے' لہٰذا اسے چاہئے کہ حق امانت ادا کرنے میں کوتاہی نہ کرے' یعنی اچھی طرح سوچ سمجھ کر مشورہ دے اور پھر اس کی بات کو راز میں رکھے اگر ایسا نہیں کرے گا تو ایک درجہ کی خیانت کا مجرم ہوگا۔

(۲۱۰)

(ترجمہ) حضرت جابر بن عبداللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:۔ جب کوئی شخص اپنی کوئی بات کہے اور پھر ادھر ادھر دیکھے تو وہ امانت ہے۔

(جامع ترمذی' سنن ابی داؤد)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تم سے بات کرے اور وہ زبانی تم سے نہ کہے کہ اس کو راز رکھنا لیکن اس کے کسی طرز انداز سے تمہیں محسوس ہو کہ وہ نہیں چاہتا ہے کہ اس کی یہ بات عام لوگوں کے علم میں آئے تو پھر اس کی یہ بات امانت ہی ہے' اور امانت کی طرح تم کو اس کی حفاظت کرنی چاہئے' اگر ایسا نہ کیا اور دوسروں کو تم نے پہنچا دیا تو تمہاری طرف سے امانت میں یہ خیانت ہوگی اور تمہیں خدا کے سامنے اس کا جواب دینا ہوگا۔

لیکن ایک دوسری حدیث میں صاف فرمایا گیا ہے کہ اگر کسی بندہ کے ناحق قتل یا اس کی آبروریزی یا اس کو مالی نقصان پہنچانے کی کوئی سازش تمہارے علم میں آئے تو پھر ہرگز اس کو راز میں نہ رکھو' بلکہ متعلقہ آدمیوں کو اس سے مطلع کر دو۔ وہ حدیث بھی یہیں پڑھ لیجئے۔

(۲۱۱)

(ترجمہ) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ نشستیں امانت داری کے ساتھ ہوں (یعنی کسی مجلس میں راز داری کے ساتھ جو مشورہ یا فیصلہ ہو' اہل مجلس امانت سمجھ کر اس کو راز میں رکھیں) لیکن تین مجلسیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ ایک وہ جس کا تعلق کسی کے خون ناحق کی سازش سے ہو' دوسرے وہ جس کا تعلق کسی کی عصمت وعفت لوٹنے کے مشورہ سے ہو اور تیسرے وہ جس کا تعلق بغیر کسی حق کے کسی کا مال چھیننے سے ہو۔

(سنن ابی داؤد)

(تشریح) ان تین باتوں کو بھی صرف مثال سمجھنا چاہئے' ورنہ منشا یہ ہے کہ اگر کسی مجلس میں کسی معصیت اور ظلم کے لیے کوئی سازش اور کوئی مشورہ کیا جائے اور تم کو بھی اس میں شریک کیا جائے تو پھر ہرگز اس کو راز میں نہ رکھو' بلکہ اس صورت میں تمہاری دیانت داری کا تقاضا یہ ہے کہ ظلم ومعصیت کے اس منصوبہ کو ناکام بنانے کے لیے جن کو اس سے باخبر کرنا تم ضروری سمجھو' ان کو ضرور باخبر کر دو' اگر ایسا نہ کرو گے تو اللہ کے حق میں بھی خیانت ہوگی اور بندوں کے حق میں بھی۔

اختلاف اور فتنہ کو ختم کرنے کے لیے اپنی طرف سے کچھ کہہ دینا جھوٹ نہیں:۔

(۲۱۲)

(ترجمہ) ام کلثوم (بنت عقبہ بن ابی معیط) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ وہ آدمی جھوٹا اور گنہگار نہیں ہے جو باہم لڑنے والے آدمیوں کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کرے' اور اس سلسلہ میں (ایک فریق کی طرف سے دوسرے فریق کو) خیر اور بھلائی کی باتیں پہنچائے اور (اچھا اثر ڈالنے والی) اچھی باتیں کرے۔

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دو شخصوں یا دو پارٹیوں کے درمیان سخت نزاع اور رنجش ہے اور ہر فریق دوسرے کو اپنا دشمن سمجھتا ہے' اور پھر اس کے نتیجہ میں بڑے بڑے شر اور فتنے پیدا ہوتے ہیں' کبھی کبھی تو خون خرابہ اور قتل وغارت اور آبروریزی تک نوبت پہنچ جاتی ہے' اور عداوت کے جوش میں ہر طرف سے ظلم اور تعدی کو اپنا حق سمجھا جاتا ہے' ان حالات میں اگر کوئی مخلص اور بے غرض بندہ ان دونوں برسرجنگ فریقوں کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کرے' اور اس کے لیے وہ ضرورت محسوس کرے کہ ایک فریق کی طرف سے دوسرے فریق کو ایسی خیر اندیشی کی باتیں پہنچائی جائیں جن سے جنگ وعداوت کی آگ بجھے اور خوش گمانی اور مصالحت کی فضا پیدا ہو تو اس مقصد کے لیے اگر اللہ کا وہ بندہ ایک فریق کی طرف سے دوسرے فریق کو ایسی خوش کن اور صلح جویانہ باتیں بھی پہنچائے جو واقعی میں اس فریق نے نہ کہی ہوں' تو اس مخلص بندہ کا ایسا کرنا اس جھوٹ میں شمار نہ ہوگا جو معصیت اور گناہ کبیرہ ہے..... بس یہی اس حدیث کا منشا ہے۔ اور یہی مطلب ہے حضرت سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کے اس مقولہ کا' کہ!۔ دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز۔"

(بشکریہ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانیؒ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

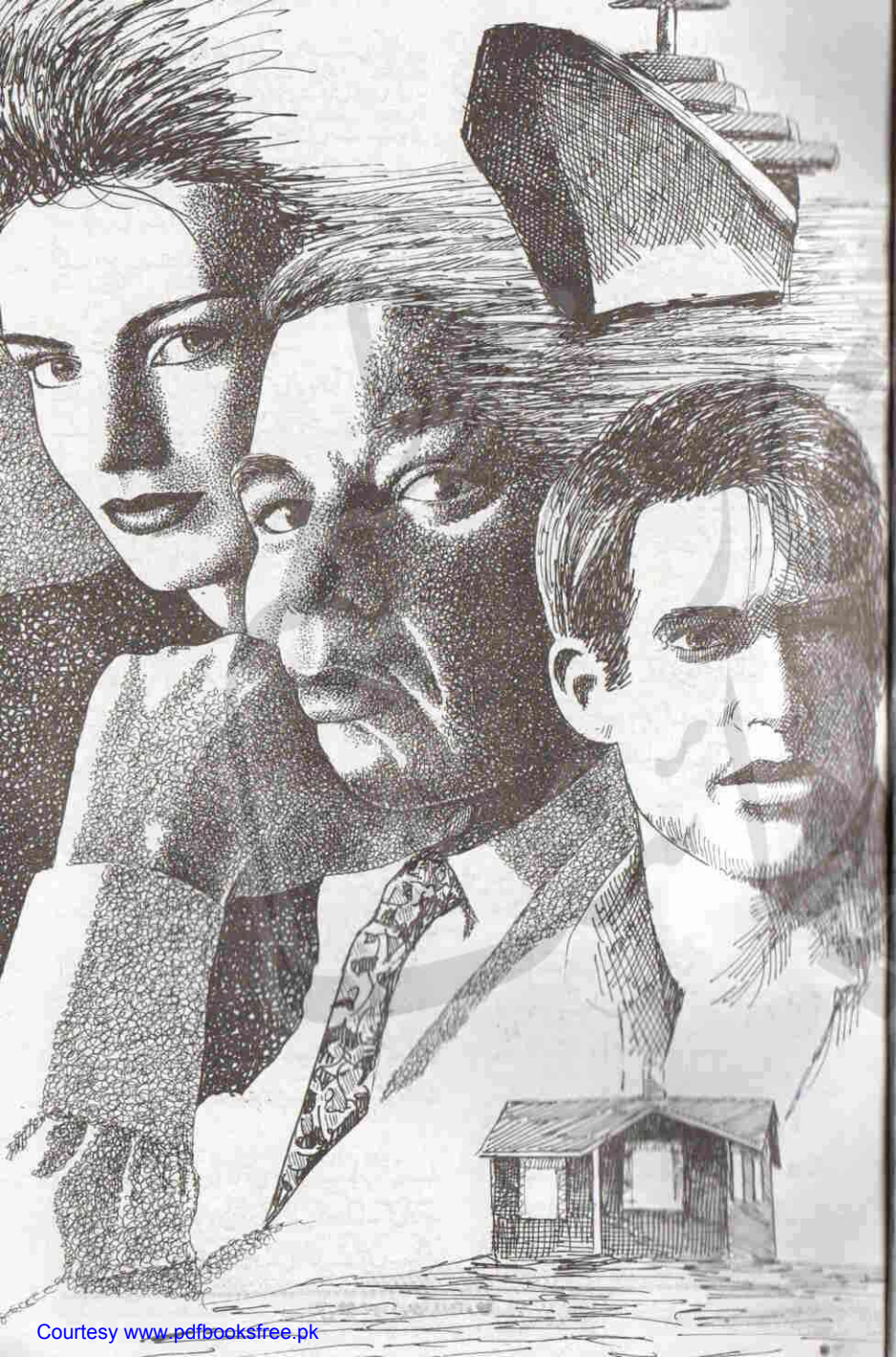

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیت المقدس

الماس ایم اے

بیت المقدس مسلمانوں کا قبلہ اول اور وہ شہر ہے جہاں سے مولائے کائنات پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرش بریں کا سفر کیا۔ وہ شہر جو مسلمانوں کو مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے بعد سب سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ شہر جو نصف صدی سے یہودیوں کے زیر تسلط ہے۔ جہاں کلمہ گو مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کردیا گیا ہے۔ جہاں یہودیوں کے مظالم پر دنیا نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ وہ شہر جہاں مسجد اقصیٰ واقع ہے جہاں متعدد پیغمبروں اور صحابہ کرام کے مزارات واقع ہیں۔ یہ شہر آج بھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور کسی صلاح الدین ایوبی کا منتظر ہے۔ یہ شہر کیسے فتح ہوا اور کس طرح اس کا سقوط ہوا آئیے اسے ممتاز مورخ اور ادیب الماس ایم اے کی نظر سے دیکھیے۔

تاریخ کے جھروکوں سے لہو کو گرماتی ایمانی جذبوں کو جھنجھوڑتی تحریر

مثل مشہور ہے کہ جو ینده یابنده۔ یعنی تلاش کرنے والے کو آخر اپنی تلاش کا پھل مل جاتا ہے۔ فادر ولیم کا یہ طریقہ تھا کہ جب کوئی قافلہ آتا تو وہ صدر دروازے کے قریب ایک اونچی جگہ کھڑے ہو جاتے جہاں سے وہ سرائے میں داخل ہونے والے ہر شخص کو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ ایک شام ایک بڑا قافلہ سرائے میں داخل ہوا۔ آنے والے قافلہ کا غلغلہ سن کر فادر ولیم اپنی مخصوص اونچی جگہ پر آ کر کھڑے ہو گئے اور ہر داخل ہونے والا چہرہ بڑے غور اور انہماک سے دیکھ رہے تھے۔

آدھا قافلہ سرائے میں داخل ہو چکا تھا مگر فادر ولیم کی نظریں اب بھی خالی خالی تھیں کہ یکا یک ایک شخص کو سرائے میں داخل ہوتا دیکھ کر فادر ولیم چونک پڑے۔ وہ ایک لمبے قد کا نیم فوجی معلوم ہوتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی فادر ولیم اپنی جگہ سے ہٹ کر اس آنے والے کے پیچھے لگ گئے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ جگہ بناتے ہوئے آخر اس کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ پھر فادر ولیم نے اس شخص کے ساتھ چلتے ہوئے سرگوشی کی۔

”بارکتش! میں سرائے کے صدر دروازے کے باہر تمہارا انتظار کروں گا۔“

بارکتش امیر عماد الدین زنگی کا خواجہ سرا غلام تھا۔ زنگی اس پر بہت اعتماد کرتے تھے اور اس سے بہت ہی اہم کام لیا کرتے تھے۔ فادر ولیم کو ان باتوں کا علم تھا۔ پس انہوں نے بارکتش کو فوراً پہچان لیا تھا اور ان کے دماغ میں فوراً یہ خیال آیا تھا کہ امیر زنگی نے اس کی تلاش میں بارکتش کو الرہا بھیجا ہے۔ کیونکہ فادر ولیم (جعفر) نے پچھلے کئی دنوں سے کوئی رپورٹ یا اطلاع نہ بھیجی تھی۔

بارکتش سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا اور فادر ولیم اپنے کمرے میں آ گئے۔

فادر ولیم نے اپنے کمرے میں آ کر شمع روشن کی اور کاغذوں کے پلندے میں سے ایک لکھا ہوا لمبا خط نکالا۔ یہ خط نہیں بلکہ الرہا کی پوری تفصیل تھی۔ اس زمانے میں خفیہ اطلاعات بھیجنے کا یہی طریقہ تھا۔ ملک ملک کے جاسوس سرائے میں جا ٹھہرتے تھے اور رات کو خفیہ رپورٹ لکھتے تھے۔ پھر جب موقع ملتا تو وہ یہ تفصیل جو ایک خط کی صورت میں ہوتی تھی آگے کی طرف روانہ کر دی جاتی تھی۔

فادر ولیم نے اپنے خط یا رپورٹ میں کچھ اور

باتوں کا اضافہ کیا اور کاغذ لپیٹ کر جیب میں رکھ لیا۔ بارکتش کے آنے کی فادر ولیم کو بہت خوشی ہوئی تھی۔ یہ رپورٹ بھیج کر وہ الرہا سے کچھ دنوں کے لیے باہر بھی جا سکتا تھا۔

پھر صبح کے دھندلکے میں بارکتش اور فادر ولیم ایک دوسرے سے ملے۔

بارکتش نے مسکرا کے کہا۔ ”میں فادر ولیم کی خدمت میں سلام پیش کرتا ہوں۔“

”وقت ضائع نہ کرو بارکتش! کچھ آقائے محترم کے بارے میں بتاؤ۔“ جعفر نے آہستہ سے کہا۔

بارکتش نے بتایا۔ ”آقا بالکل خیریت سے ہیں اور دیار بکر میں قیامت برپا کیے ہوئے ہیں۔ تمام امیروں نے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور ہمارے زنگی آقا کی پناہ میں ہیں۔“

”فتوحات مبارک ہوں بارکتش!“ یہ کہتے ہوئے فادر ولیم نے رپورٹ بارکتش کے حوالے کر دی۔ بارکتش نے رپورٹ سنبھال کے اندر کی جیب میں رکھ لی اور پھر کہا۔

”ایک دلچسپ خبر ہے۔ سنو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔“

”ضرور سناؤ۔ میں تو کسی اہم خبر کی تلاش میں ہوں۔“

”خبر یہ ہے کہ ہمارے امیر کی حرم میں آرمینیا کی ایک شہزادی کا.....“ اور بارکتش کہتے کہتے رک گیا۔

فادر ولیم نے اسے حیران نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ”خبر تو دل چسپ ہے مگر یہ ہمارے امیر کو کیا سوجھی؟ ان کی عمر ساٹھ سے اوپر ہے اور دو بیٹے جوان ہو چکے ہیں۔“

”آقا کی باتیں آقا ہی جانیں۔“ بارکتش نے منہ بنایا۔ ”ان کی چالوں کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ کسی کو تہہ تیغ کرتے ہیں تو کسی کو پہلو میں بٹھاتے ہیں۔ یہ بھی ایک سیاسی شادی ہے۔ والی آرمینیا خود سری پر آمادہ تھا۔ امیر نے اسے تلوار سے زیر کرنے کی بجائے اس کی بیٹی کے لیے اپنا پیغام بھیج دیا اور والی آرمینیا مع اپنی بیٹی کے امیر کا ہمیشہ کے لیے حلقہ بگوش ہو گیا۔

فادر ولیم سر ہلا کے بولا۔ ”امیر جس قدر سخت دل ہیں اتنے ہی نرم دل بھی ہیں۔ میدان جنگ میں بھی ان کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ میں نے کئی کمزور حکمرانوں کو گلے لگاتے دیکھا ہے اور کئی خود سروں کا سر قلم کرتے بھی دیکھا ہے۔ ایسے عالی دماغ اور شہ زور حکمران کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔ خدا امیر کو سلامت رکھے۔“

فادر ولیم یعنی جعفر نے امیر کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ ایک تاریخی حقیقت تھی جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اب صبح کی روشنی ابھرنا شروع ہو گئی تھی۔ بارکتش نے فکر مند لہجے میں کہا۔ ”کوئی پیغام دینا ہے امیر کو؟“

”میں نے سب کچھ اس رپورٹ میں لکھ دیا ہے۔“ ولیم نے جواب دیا۔ ”ہاں! امیر نے کوئی حکم دیا ہو تو بتاؤ۔“

”تمہارے لیے یہی حکم ہے کہ تم تا حکم ثانی الرہا میں ہی رہو گے۔“

”تمہارا دوسرا چکر کب لگے گا؟“

”یہ بات میرے اختیار میں نہیں۔“

فادر ولیم نے اسے بتایا۔ ”میں شاید یہ جگہ چھوڑ دوں۔“ پھر سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

”فادر ولیم کسی جگہ بھی رہے مگر اس کا پتا یہیں سے ملے گا۔ سرائے کا مالک تمہارے فادر ولیم کا بہت معتقد ہے۔ تمہیں اس سے میرا پتا معلوم ہو جائے گا۔“

”فادر ولیم!.....“ بارکتش مسکرایا۔ ”میں تمہیں نہیں پہچان سکا تھا۔

دوسرے دن شام کے وقت بارکتش کا قافلہ اسے لے کر آگے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب اسے ترن کوزی کو تلاش کرنے کے لیے کافی وقت مل گیا تھا۔ اب تو وہ لارنس سے بھی ملنے کا خطرہ مول لے سکتا تھا۔

چنانچہ دوسرے دن اس نے بڑے گرجا کا رخ کیا۔ گرجے کی چہار دیواری کے اندر لوگوں کا ہجوم تھا اور درجنوں پادری ادھر ادھر پھرتے نظر آ رہے تھے۔ پس فادر ولیم بھی ان میں شامل ہو گیا اور لارنس کو ڈھونڈنے لگا۔

لارنس ایک عشرت پسند انسان تھا۔ اس لیے فادر اسے ڈھونڈنے بڑے گرجا گھر میں آئے تھے۔ انہیں یہاں آ کے مایوسی نہیں ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی لارنس انہیں نظر آ گیا۔ فادر ولیم بڑھ کے اس کے برابر پہنچ گئے۔ انہوں نے نرمی سے کہا۔

”نیک بیٹے! میری مدد کرو۔“

لارنس کے قدم اس آواز پر رک گئے۔ پھر وہ فادر ولیم کے برابر آ گیا۔ ”فرمایئے فادر! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”بیٹے! کیا تمہارا تعلق اسی عبادت گاہ سے ہے؟“ فادر ولیم نے سوال کیا۔

”جی..... یہی سمجھ لیجیے۔“ لارنس نے مختصر جواب دیا۔ ”آپ اس شہر میں اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔“

”تم نے ٹھیک اندازہ لگایا بیٹے!“ فادر ولیم بولے۔ ”مجھے دراصل بعلبک کے فادر فلپ کی تلاش ہے۔“

فادر فلپ کے نام پر لارنس کے کان کھڑے ہو گئے مگر اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا اور یوں بن گیا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ دوسری طرف فادر ولیم محتاط ہونے کے باوجود لارنس کو اعتماد میں لینے کے لیے کہہ رہے تھے۔

”میں فادر فلپ کی تلاش میں دمشق سے بعلبک پہنچا تھا مگر وہاں کے تمام عبادت خانے برباد ہو گئے ہیں۔ وہاں مجھے بتایا گیا کہ فادر فلپ بعلبک چھوڑ کر الرہا میں آباد ہوئے ہیں۔ میں ایک ہفتہ سے سرگرداں ہوں مگر مجھے کسی عبادت خانے سے بھی ان کا اتا پتا نہ معلوم ہو سکا۔“

لارنس تذبذب میں گرفتار ہو گیا۔ آخر اس نے پوچھا۔ ”فادر!..... کیا فادر فلپ سے آپ کی عزیز داری ہے؟“

”میرے بیٹے! قریبی تعلق، رشتہ داری اور عزیز داری سے زیادہ بلند ہوتا ہے۔“ فادر ولیم نے بے پروائی سے جواب دیا۔ حالانکہ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ لارنس اسے شبہ کی نظر سے دیکھ رہا ہے۔ ”فادر فلپ مجھ ناچیز کے بزرگ اور رہنما ہیں۔ میں جب بھی شمال کا سفر اختیار کرتا ہوں تو بعلبک کی عبادت گاہ کو نہیں بھولتا۔ فادر فلپ کے مشفقانہ سلوک اور احسانات کو میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔“

لارنس کو شاید کچھ اطمینان ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے کہا۔

”فادر ولیم! آپ فادر فلپ سے ملنا چاہتے ہیں مگر وہ ابھی تک یہاں نہیں پہنچے۔“

”یہ تو میں جانتا ہوں بیٹے!“ فادر ولیم نے سنجیدگی سے کہا۔ ”سوال یہ ہے کہ وہ ہیں کہاں؟ بعلبک کی تباہی کو ایک سال ہونے کو آیا ہے۔ پھر وہ راستے میں کہاں رہ گئے۔“

”وہ اس وقت تل باشر میں ہیں فادر!“ لارنس نے آخر بتا دیا۔

”تل باشر؟“ ولیم پریشان ہو گیا۔ ”مگر تم یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ تل باشر میں ہیں؟“

”میرا نام لارنس ہے اور میں ان کا قریبی عزیز ہوں فادر۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اچھا تو تم فادر فلپ کے عزیز ہو۔" فادر ولیم نے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔

"خداوند یسوع مسیح کی تم پر رحمت ہو۔ تمہاری صورت بھی کچھ کچھ فادر فلپ سے ملتی ہے۔ تمہارا رابطہ تو فادر فلپ سے ضرور ہوگا۔"

"اب تو نہیں ہے۔" لارنس نے انکشاف کیا۔ "میں کچھ دن پہلے ان سے تل باشر میں ملا تھا۔"

"کیا انہوں نے تم سے کہا تھا کہ وہ الرہا آئیں گے؟" فادر ولیم نے بے چینی سے پوچھا۔

"میں نے ان سے عہد لیا تھا کہ وہ جلد از جلد الرہا پہنچ جائیں۔" لارنس نے بتایا۔

فادر ولیم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "لارنس تمہارا کیا خیال ہے کہ میں یہاں ٹھہر کر فادر فلپ کا انتظار کروں یا تل باشر چلا جاؤں۔ میں ادھر آیا ہوں تو چاہتا ہوں کہ فادر فلپ سے مل لوں۔"

لارنس نے اداس لہجے میں جواب دیا۔ "میں تو یہی کہوں گا کہ آپ بھی ان کا انتظار کریں۔ میں خود ان کے لیے بے چین ہوں۔"

"کیا کوئی خاص بات ہے؟" ولیم نے اسے ٹٹولا مگر فوراً بات پلٹ دی۔ "مگر یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے اور کسی کے ذاتی معاملات میں دخل دینا میں درست نہیں سمجھتا۔"

"مگر فادر..... میں سمجھتا ہوں کہ یسوع مسیح نے آپ کو میری مدد کے لیے بھیجا ہے۔" لارنس نے جذبات سے پر لہجے میں کہا۔

"یہ تو تمہارا خلوص ہے لارنس۔" فادر ولیم نے اسے سہارا دیا۔ "اگر تم کچھ بتاؤ تو میں شاید تمہاری مدد کر سکوں۔"

"لارنس ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "فادر! آپ نے کہا تھا کہ فادر فلپ آپ کے رہنما ہیں۔"

"ہاں ہاں، اس میں شک ہی کیا ہے۔" فادر ولیم نے پورے وثوق کے ساتھ جواب دیا۔

"فادر فلپ آپ کی بات بھی مانتے ہوں گے۔" لارنس نے زیادہ جذباتی لہجے میں پوچھا۔

"لارنس! میں نے آج تک فادر فلپ سے اپنے لیے کچھ نہیں مانگا۔ مگر دوسروں کے لیے دعائیں اور سفارشیں ضرور کرائی ہیں۔" فادر ولیم نے لارنس کو جیسے پوری تسلی دی۔

"تو کیا آپ ایک سفارش میرے لیے بھی کرا دیں گے گا؟" یہ کہہ کر لارنس بڑی امیدوں سے فادر ولیم کا منہ دیکھنے لگا۔

"لارنس! تم اس قدر اظہار انکساری کیوں کر رہے ہوں؟" فادر ولیم نے اسے دوبارہ تسلی دی۔ "تم تو میرے اپنے ہو۔ میں تمہاری سفارش کیوں نہیں کروں گا؟ صرف سفارش ہی نہیں بلکہ پوری کوشش کروں گا۔ بتاؤ تمہیں فادر فلپ سے کیا کام ہے؟"

"فادر! آپ کو معلوم ہے ان کی ایک جوان لڑکی ہے۔" لارنس نے کھلنا شروع کیا۔

فادر ولیم نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھا جیسے وہ ذہن پر زور دے رہا ہو۔ پھر سنبھل کر بولا۔ "جوان لڑکی کو تو میں نہیں جانتا۔ مگر ایک پیاری سی بچی ضرور ان کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔"

"وہ بچی اب جوان ہوگئی ہے فادر!" لارنس نے لہک کے کہا۔ "اس کا نام ترن کوزی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اب یاد آیا۔ فادر فلپ اسے کوزی کوزی کہہ کر پکارتے تھے۔" فادر ولیم مسکرایا۔ "وہ بچی اب جوان ہوگئی ہے اور ہمارا بیٹا اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ کیوں لارنس! ہمارا اندازہ غلط ہے کیا؟"

"غلط نہیں بلکہ بالکل درست ہے فادر!" لارنس نے قدرے شرما کر سر جھکا لیا۔

"فکر نہ کرو لارنس! میں فادر فلپ سے تمہاری خواہش بیان کروں گا اور سفارش بھی کروں گا۔" فادر ولیم نے کہنے کو تو کہہ دیا مگر یہ کہتے وقت جیسے اس کے دل پر چھریاں چل گئیں۔ اس کے سینے میں آگ سی لگ گئی تھی۔

اسی وقت لارنس نے افسردگی سے بتایا۔ "فادر! شادی سے انکار ہو گیا ہے۔"

"کس نے انکار کیا ہے؟" فادر ولیم نے دل پر جبر کر کے پوچھا۔ "میں فادر فلپ کو راضی کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔"

"مگر فادر ولیم! انکار فادر فلپ نے نہیں بلکہ خود ترن کوزی نے کیا ہے۔" لارنس اپنا خشک گلا سہلانے لگا۔

فادر ولیم نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور پھر بولے۔ "وہ بچی ہے۔ میں اس سے کہوں گا کہ تم سے بہتر اسے اور کون مل سکتا ہے؟"

"فادر....." لارنس نے بڑی محبت سے فادر ولیم کے ہاتھ چوم لیے۔

"فکر کی ضرورت نہیں لارنس۔" فادر ولیم نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ "بس یوں سمجھو کہ تمہارا کام بن گیا۔ میں فادر فلپ سے ملاقات کرتے ہی تمہارے لیے ترن کوزی کو مانگ لوں گا۔"

لارنس شرمایا لجایا جا رہا تھا جیسے وہ واقعی دلہا بن گیا ہو۔ اس نے شکر گزار نظروں سے فادر ولیم کو دیکھا اور بڑے جذباتی انداز میں کہا۔

"فادر! میں تو بالکل ناامید ہو گیا تھا۔ آپ نے مجھے سہارا دیا تو مجھے یوں لگا جیسے میری زندگی کی روٹھی ہوئی بہاریں واپس آ رہی ہیں۔ میں پہلے ہی بہت بد قسمت ہوں۔ نہ ماں، نہ باپ..... میرا پورا بچپن فادر فلپ کی گود میں گزرا ہے مگر میں نے ان کی باتوں سے کوئی نصیحت نہیں پکڑی۔ بری صحبت نے مجھے تباہ کر دیا۔ پھر فادر فلپ نے بھی مجھے اپنے سے الگ کر دیا۔"

لارنس اپنی داستان سنا رہا تھا اور فادر ولیم اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ آخر اس نے ترن کوزی کو ڈھونڈ نکالا۔ اس کی جانِ حیات تل باشر میں تھی اور تل باشر کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ اس وقت وہ فارغ ہی تھا۔ امیر زنگی کو اس نے ضروری اطلاعات بھجوا دی تھیں اس لیے وہ کچھ دنوں کے لیے الرہا سے غیر حاضر بھی رہ سکتا تھا۔ لارنس کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ ترن کوزی اب تک اس کے انتظار میں ہے، ورنہ وہ لارنس سے انکار کیوں کرتی۔"

لارنس کی نظر فادر ولیم پر پڑی تو اس نے گھبرا کے پوچھا۔

"فادر!..... آپ کیا سوچنے لگے؟"

"میں تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔" فادر ولیم نے مسکرا کے کہا۔ "فادر فلپ میری بات مانتے ہیں۔ میں اس نادان لڑکی سے پوچھوں گا کہ اسے کیا ہوا؟ اس نے تم سے شادی کرنے سے کیوں انکار کر دیا۔" یہ کہتے ہوئے ولیم نے چور نظروں سے لارنس کو دیکھا مگر لارنس اس وقت گم صم کھڑا فضاؤں میں گھور رہا تھا۔ لارنس کی طرف سے جواب نہ پا کر فادر ولیم نے ایک بار پھر لارنس کو تسلی دی۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں لارنس، میں عورت کی فطرت سے واقف ہوں۔ تم بالکل بے فکر رہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"آپ کا شکریہ کس طرح ادا کروں فادر۔" لارنس فادر ولیم کی ہمدردی میں بچھا جا رہا تھا۔

"تم کہیں جا رہے تھے لارنس۔" ولیم نے اسے یاد دلایا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کوئی بات نہیں فادر....." لارنس نے مسکین لہجے میں کہا۔ "آپ کی ملاقات سے اہم کوئی چیز نہیں۔"

"نہیں، نہیں۔ تم اپنے کام پر جاؤ۔ میں بھی ذرا گھوم پھر لوں۔" ولیم نے اسے ٹالنے کی دوبارہ کوشش کی۔

"پھر کب ملاقات ہوگی فادر؟" لارنس نے ایک دم سوال کیا۔

"ملاقات.....؟" ولیم سوچ میں پڑ گیا۔

"میرا مطلب ہے میں خود آپ کی ملاقات کے لیے آؤں گا۔" لارنس نے کہا۔ "آپ کس جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

ولیم اس سوال پر بوکھلا گیا۔ وہ کیا بتاتا کہ کہاں ٹھہرا ہے۔ اگر سرائے کا نام بتاتا تو لارنس وہاں چوبیس گھنٹے پڑاؤ ڈالے رکھتا اور اس کے تمام منصوبے خاک میں مل جاتے۔

آخر ولیم کو کوئی جواب تو دینا ہی تھا۔ پس اس نے کہا۔ "بیٹے! ہمارا ٹھکانہ کیا پوچھتے ہو۔ ہم تو بے ٹھکانہ لوگ ہیں۔ جہاں شام ہوئی وہیں پڑے رہے۔ الرہا میں یوں بھی عبادت خانوں کی کمی نہیں۔ جہاں جاتا ہوں لوگ عزت سے ملتے ہیں۔"

"فادر! اگر کوئی حرج نہ ہو تو آپ میرے پاس آ جایئے۔" لارنس نے فوراً پیش کش کی۔ "میرے پاس ایک کمرہ نہیں بلکہ بڑا ہال ہے۔ نہایت آرام دہ اور کشادہ۔"

فادر ولیم کے لیے اس پیش کش کو قبول کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے نہایت پیار سے کہا۔

"لارنس! تم اڑتے پرندے کو سونے کے پنجرے میں قید کرنا چاہتے ہو۔ نہ بیٹے نہ۔ مجھے ایسا آرام نہیں چاہیے۔"

لارنس نے ولیم کو رام کرنے کے لیے کہا۔

"مگر فادر! کس کو پتا ہے کہ فادر فلپ الرہا کب پہنچیں گے۔ یہاں آپ کو زیادہ آرام ملے گا۔"

"تمہارے ہی پاس رہوں گا لارنس مگر کبھی کبھی۔"

فادر ولیم نے خطرہ مول نہیں لیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

"مگر آپ جائیں گے کہاں؟" لارنس نے بڑے پیار سے پوچھا۔

فادر ولیم کو یہ معلوم ہوتے ہی کہ ان کی جانِ آرزو تل باشر میں ہے۔ اس نے وہاں جانے کا فوراً فیصلہ کر لیا۔ اس دن ایک قافلہ تل باشر روانہ ہو رہا تھا۔ پس ولیم اس قافلے میں شامل ہو گیا۔ مشہور ہے کہ جب بات بنتی ہے تو بنتی ہی چلی جاتی ہے۔ فادر ولیم تل باشر میں داخل ہوا تو اسے تقدیر نے ایک اور تماشہ دکھایا۔ اسے ترن کوزی کی تلاش تھی اور ترن کوزی اس کے سامنے اس طرح آ گئی جیسے اسے ولیم کے آنے کی خبر پہلے ہی مل گئی ہو۔ ترن کوزی اس سڑک پر چل رہی تھی جس پر ولیم کا قافلہ رواں دواں تھا۔ ان دونوں کے درمیان دس فٹ سے زیادہ کا فاصلہ نہ تھا۔

ولیم کا دل سینے میں اچھلنے لگا۔ وہ واقعی ترن کوزی ہی تھی۔ اس کی محبوبہ۔ اس کی امیدوں کا مرکز۔ وہی چال، وہی رفتار، چہرے پر وہی سنجیدگی۔ ترن کوزی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں گم آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہی تھی۔ ادھر ولیم بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ دوڑ کر ترن کوزی کو پکڑ لے لیکن اس طرح وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو سکتا تھا۔

اب قافلہ چلتے چلتے گرجا گھر کے سامنے رک گیا۔

"اس عبادت خانے کا نام کیا ہے؟" ولیم نے اپنے ساتھ چلنے والے ایک ساتھی سے پوچھا۔

اجنبی ساتھی نے اسے حیرانی سے دیکھا اور بولا۔

"فادر! آپ شاید پہلی مرتبہ یہاں آئے ہیں۔"

"تمہارا خیال درست ہے بیٹے۔ تل باشر میرے لیے بالکل اجنبی شہر ہے۔"

اور پھر جب اس اجنبی نے اس کلیسا کا نام بتایا تو فادر ولیم کے قدم ایک دم رک گئے۔

"کیا ہوا فادر..... آپ ایک دم کیوں رک گئے؟" ان کے ساتھی نے پوچھا۔

"مجھے اسی کلیسا میں جانا ہے بیٹا۔ الرہا میں مجھے یہی نام بتایا گیا تھا۔" ولیم نے اسے جواب دیا۔

اسی وقت فادر ولیم نے دیکھا کہ ترن کوزی سڑک چھوڑ کر ایک پگڈنڈی پر ہو گئی ہے جو سیدھی کلیسا کو جا رہی تھی۔ ولیم نے قدم روک لیے اور ساتھی سے کہا۔

"اچھا بیٹا! میری منزل آ گئی ہے۔ خداوند یسوع مسیح کی برکتیں تم پر نازل ہوں۔"

قبل اس کے کہ اس کا ساتھی کوئی جواب دیتا۔ ولیم قافلہ سے الگ ہو گیا اور اس پگڈنڈی پر ہو لیا جس پر آگے آگے ترن کوزی جا رہی تھی۔ پھر جب ولیم بالکل اس کے قریب پہنچ گیا تو ترن کوزی کو آواز دی۔

"ذرا ٹھہرو لڑکی۔"

ترن کوزی کے قدم اک دم رک گئے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور حیران رہ گئی۔

"تمہارا نام شاید ترن کوزی ہے۔" ولیم شاید خود کو پادری ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ترن کوزی نے اپنے سر کو ذرا سا جھٹکا دیا جیسے کوئی خواب سے بے دار ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ترن کوزی کے رخسار دہکنے لگے۔

"ارے تم..... غضب کر دیا تم نے جعفر۔" یہ کہتے ہوئے ترن کوزی گھبرا گئی اور چاروں طرف دیکھنے لگی۔

"گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ترن کوزی۔" جعفر نے اسے تسلی دی۔ "مجھے اس شہر میں کوئی پہچان نہیں سکتا۔"

"مگر جعفر یہ عیسائی ریاست ہے۔ راز کھل گیا تو جان کے لالے پڑ جائیں گے۔" ترن کوزی کی نظریں اب بھی چاروں طرف گھوم رہی تھیں اور وہ سخت گھبرائی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

"ترن! جان کی پروا ہوتی تو تمہیں ڈھونڈنے کیوں نکلتا۔" جعفر بے پروائی سے بولا۔ "میں کفن سر سے باندھ کے نکلا ہوں اور موت کی وادیوں سے گزر کر تم تک پہنچا ہوں۔" جعفر کے دل میں جذبات کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ اس نے ترن کوزی کو خاموش دیکھا تو بولا۔

"تم نے میرے لیے کیا سوچا ہے؟"

"میں نے سوچا تو بہت کچھ تھا مگر اب حالات بدل گئے ہیں۔" ترن کوزی نے درد بھری آواز میں جواب دیا۔

"حالات بدل گئے ہیں کہ تم بدل گئی ہو؟" جعفر چڑ کے بولا۔

"جعفر!..... میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔" ترن کوزی بے چین ہو رہی تھی۔

"بعلبک اسلامی علاقہ تھا۔ میں نے بابا سے تمہارے ساتھ جانے کی اجازت بھی لے لی تھی۔ مگر یہ بعلبک نہیں ہے۔ یہ الرہا کا علاقہ ہے۔ اور یہاں شاہ جوسیلین کا ڈنکا بجتا ہے۔ ہم سرحد تک کیسے پہنچیں گے؟ کمینے لارنس نے مجھے بہت بدنام کیا ہے۔ تمہارے ساتھ اگر فرار ہوئی تو کہیں نہ کہیں ضرور پکڑی جاؤں گی۔"

"مجھے ہاں یا ناں میں جواب چاہیے۔ تم میرے لیے تکلیف نہیں اٹھا سکتیں تو کوئی بات نہیں۔ میں جیسے آیا ہوں ویسے ہی چلا جاؤں گا۔"

شاید یہ جعفر کی دھمکی تھی۔ ترن کوزی تڑپ اٹھی۔ "تم مجھے بزدل سمجھتے ہو۔ بے وفائی کا الزام لگا رہے ہو؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جعفر نے سنا۔ مگر کوئی جواب نہیں دیا۔

"میں تم سے پھر بات کروں گی۔" ترن کوزی نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔

پھر ترن کوزی جعفر کو اپنی ایک سہیلی کے پاس لے گئی۔

"ششی! تم جعفر کا خیال رکھنا اور انہیں باہر نہ جانے دینا۔" یہ تاکید کر کے ترن کوزی باہر چلی گئی۔

جعفر کو ایک جائے پناہ تو مل گئی تھی مگر وہ گھبرایا ہوا تھا۔

"تم مجھ پر اعتماد کر سکتے ہو۔" ششی نے جعفر کو تسلی دی۔ "میں تمہارے ناشتے کا انتظام کرنے جا رہی ہوں۔ ہاں تم باہر نکلنے کی کوشش نہ کرنا۔ شاہ جوسیلین الرہا تشریف لا رہے ہیں۔"

جعفر کے دل میں پنکھے لگے ہوئے تھے۔ اسے کسی پہلو چین نہ آ رہا تھا۔ شاہ جوسیلین کے آنے کی خبر اس پر ایک اور بجلی بن کر گری تھی۔ وہ الرہا سے چند دن کے لیے اس لیے آیا تھا کہ ترن کوزی کا پتہ لگائے گا اور اگر وہ مل گئی تو "تجدید محبت" کرے گا مگر اب سارا عشق رفو چکر ہو گیا تھا۔ جعفر نے سامنے کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا تو یوں محسوس ہوا جیسے امیر زنگی اس کے سامنے کھڑا کہہ رہا ہے۔

"او نمک حرام! تجھے الرہا بھیجا تھا کہ وہاں کے حالات سے برابر مطلع کرتا رہے مگر تو ایک لڑکی کے عشق میں اپنا فرض بھول گیا۔ الرہا کی مضبوط چوکی اپنے حکمران سے خالی ہو رہی ہے اور تو اپنی محبوبہ سے شادی رچانے کے چکر میں ہے۔ تجھے اس کا اندازہ نہیں کہ جوسیلین کی الرہا سے غیر حاضری تیرے آقا کے لیے کس قدر خوش کن خبر ہو سکتی ہے۔ اپنے فرض کو پہچان۔ محبوبہ چھوٹ کر پھر مل سکتی ہے۔ مگر الرہا دوبارہ خالی نہیں ہو سکتا۔ فوراً اپنے مالک کے پاس پہنچ اور کہہ "اے میرے امیر! وہ وقت آ گیا ہے کہ جس کا مسلمان ایک سو سال سے انتظار کر رہے تھے۔ سو سال پہلے عیسائیوں نے الرہا کی مسلم ریاست میں مسلمانوں کا جس قدر خون بہایا تھا اس کا انتقام لینے کا وقت آ گیا ہے۔ آج الرہا میں کوئی مسجد نہیں۔ کوئی مدرسہ نہیں، کوئی خانقاہ نہیں۔ کسی طرف سے بھی "اللہ اکبر" کی صدا بلند نہیں ہوتی۔ الرہا کی مٹی میں دبی ہوئی مسلمانوں کی ہڈیاں تیرے امیر کو آوازیں دے رہی ہیں۔"

جعفر کو جذبات اور خیالات کا طوفان گھیرے ہوئے تھا۔ ایک طرف ترن کوزی کی محبت اس کے پیروں سے لپٹی جا رہی تھی تو دوسری طرف فرض کی پکار اس کے دل و دماغ میں ہتھوڑے چلا رہی تھی۔

جعفر نے سر کو زور سے جھٹکا دیا اور ترن کوزی کی محبت کو کچلتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے سوچا کہ دنیا اور دنیا والوں کی محبت تو آنی جانی چیز ہے۔ اس سے دل لگانا ریت کی دیوار کھڑی کرنے کے مترادف ہے۔ وقت لوٹ کر نہیں آیا کرتا اور نہ وقت کسی کا انتظار کرتا ہے۔ آج اگر یہ موقع گنوا دیا تو عمر بھر پچھتائے گا اور تیرا ضمیر ہمیشہ ملامت کرتا رہے گا۔ پھر تیری آنکھ اپنے امیر کے سامنے کبھی نہ اٹھ سکے گی۔

جعفر پادریوں کا چوغہ سنبھالتا ہوا دروازے کے پاس آیا۔ اس نے درز سے جھانکا۔ ششی اس کا ناشتہ بنا رہی تھی۔ اس کے ارادے ایک دم متزلزل ہو گئے۔ ناشتہ کیے بغیر اس کا باہر نکلنا ممکن نہ تھا۔ ششی اندر آئی تو اس نے ناشتہ جعفر کے آگے لگا دیا اور وہ کھانا زہر مار کرنے لگا۔ اس نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا کہیں جانے کا ارادہ ہے؟" ششی نے گھبرا کے سوال کیا۔

"ارادے اپنے اختیار میں نہیں ہوتے ششی۔" جعفر نے کہا۔ "میں ذرا سرائے تک جا رہا ہوں۔ میرے ساتھی انتظار کر رہے ہوں گے۔ انہیں مطمئن کر کے ابھی واپس آ جاؤں گا۔" اتنا کہہ کر جعفر باہر نکل گیا۔

جعفر سرائے پہنچا۔ وہاں شاہ جوسیلین کی آمد کا اعلان ہو چکا تھا۔ ہر شخص اس کے استقبال کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ جعفر جلد از جلد وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس نے سرائے سے معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا کہ ایک قافلہ اسی وقت الرہا روانہ ہو رہا ہے۔ جعفر آج ہی الرہا سے آیا تھا اور اسے آج ہی واپس جانا پڑ رہا تھا۔ اسے جلد از جلد "عمید" پہنچ کر امیر زنگی کو یہ خبر سنانا تھی کہ شاہ جوسیلین اس وقت الرہا چھوڑ کر گرمیاں گزارنے تل باشر جا رہا ہے۔

جعفر کو جس قدر جلدی تھی اسی قدر اسے دیر ہو رہی تھی۔ کیونکہ پوری سڑک کو شاہ جوسیلین کے ہراول دستے گھیرے ہوئے تھے۔ شاہ جوسیلین کا جلوس ان راستوں سے بہت پیچھے تھا۔ جعفر کو مجبوراً سڑک چھوڑنا پڑی۔ پھر شام کے وقت شاہی جلوس نمودار ہوا۔ زرق برق لباس میں شاہی باڈی گارڈ پرچم اٹھائے اور ڈھول تاشے بجاتے آگے آگے چل رہے تھے۔ ان کے پیچھے چار گھوڑوں والا شاہی رتھ تھا۔ گھوڑوں کے ساز چاندی اور سونے کی چمک سے جگمگا رہے تھے۔

شاہ جوسیلین رتھ میں اکیلا تھا۔ دونوں طرف پائیدان پر اس کے جنرل تلواریں بلند کیے کھڑے تھے۔ رتھ کے اوپر ایک زرنگار سائبان آویزاں تھا۔ شاہی بیگمات کی سواریاں شاہ کے رتھ کے پیچھے تھیں۔ پھر ان کے پیچھے وہ چاق و چوبند فوجی دستے تھے جن پر شاہ کو بڑا ناز تھا۔ اس پورے جلوس کے گزر جانے پر ہی الرہا جانے والے قافلہ کو روانگی کی اجازت ملی۔ جعفر نے اب اس قافلہ کو چھوڑ دیا تھا۔ اس کا رخ سیدھا قلعہ عمید کی طرف تھا جہاں اس کا امیر محاصرہ کیے ہوئے مقیم تھا۔

جعفر تیز گھوڑا بھگا رہا تھا اور جلد از جلد عمید

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہنچنا چاہتا تھا۔ مسلم علاقے میں پہنچ کر اس نے اپنا چوغہ اتار دیا اور اب وہ ایک مسلمان سوار کے لباس میں اپنے مرکب پر بیٹھا آگے بڑھ رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا اور جعفر مع اپنے گھوڑے کے پسینے میں نہا گیا تھا۔ پھر بھی وہ گھوڑا معمولی رفتار سے بھگاتا ہوا امیر زنگی کے خیمے کے سامنے پہنچ گیا۔

امیر کے پہرے دار نے جعفر کو گھوڑے سے اترتے دیکھ کر اندر جا کر امیر کو اس کے آنے کی اطلاع دی۔ امیر جعفر کا نام سن کر غصہ سے بلبلا اٹھا۔ پہرے دار کو جواب دینے کی بجائے وہ تلوار بے نیام کرتے ہوئے خیمہ سے باہر آ گیا۔

جعفر نے امیر کو ادب سے سلام کیا۔

امیر زنگی جواب میں شیر کی طرح دہاڑا۔

"او بدذات! تجھے اپنے امیر کے سامنے آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ کیا تو عمادالدین کا قہر و جلال بھول گیا تھا؟"

"غلام کا سر حاضر ہے آقا....." جعفر نے بے تکلف سر جھکا دیا۔

"او نابکار..... یہ بتا تجھے ہماری اجازت کے بغیر اپنا مقام چھوڑنے کی جرأت کیسے ہوئی؟" امیر کا غصہ کچھ اور تیز ہو گیا تھا۔

"غلام اس گستاخی کے لیے موت کا سزاوار ہے۔" جعفر نے بڑی جرأت سے جواب دیا۔ "مگر میرا سر قلم کرنے سے پہلے مجھے وہ خبر سنانے کی اجازت دی جائے جس نے مجھے میرے امیر کی حکم عدولی پر مجبور کیا ہے۔"

اسی وقت امیر زنگی کے سپہ سالار شیرکوہ نے دخل دیتے ہوئے جعفر سے کہا۔ "او نادان! اپنی بے وقت کی موت کو آواز نہ دے اور جلد وہ بات بتا جس نے تجھے موت سے بھی بے پروا کر دیا تھا؟"

پس جعفر نے نہایت ادب سے سپہ سالار کو جواب دیا۔ "سردار محترم! میں وہی بات کہنا چاہتا ہوں۔ براہِ کرم مجھے امیر سے اجازت دلوایئے۔"

امیر زنگی زور سے دہاڑا۔ "او نابکار! بولتا کیوں نہیں۔ تیری زبان کس نے پکڑ رکھی ہے؟"

"مجھے تخلیہ چاہیے آقائے محترم۔" جعفر نے ایک نئی درخواست پیش کر دی۔

سپہ سالار شیرکوہ جعفر کی اس بات پر چونکا۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ "جعفر! کیا تو کوئی اہم خبر لایا ہے؟"

"صرف اہم نہیں بلکہ بہت اہم خبر ہے سردار محترم!" جعفر نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

اسی وقت شیرکوہ نے آگے بڑھ کر امیر عمادالدین زنگی سے کچھ سرگوشی کی اور امیر زنگی خیمے کے اندر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد شیرکوہ نے جعفر کو ساتھ لیا اور وہ بھی امیر کے خیمے میں داخل ہوئے۔ شیرکوہ نے اندر پہنچ کر جعفر سے کہا۔

"جعفر! اب تو امیر کو بتا کہ وہ کیا خبر ہے جس نے تجھے اس قدر گستاخی پر آمادہ کر دیا تھا؟"

واضح رہے کہ اس وقت امیر زنگی کو بھی یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اس کا خاص ہرکارہ اس قدر گستاخ تو نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس نے اس وقت اپنا رویہ اس قدر سخت کر لیا تھا۔

پس جعفر نے سر جھکا کر اس راز سے پردہ اُٹھایا۔ اُس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "اے امیر محترم، میں یہ خبر لے کر حاضر ہوا ہوں کہ الرہا اس وقت بالکل خالی ہے۔"

امیر زنگی اور سپہ سالار دونوں ہی اپنی جگہ سے اُچھل پڑے۔ امیر نے بے یقینی سے کہا۔ "تو..... تو کیا کہہ رہا ہے؟ ہوش بھی ہے تجھے؟"

"میں بالکل سچ عرض کر رہا ہوں امیر عالی

مقام۔" جعفر نے اور زیادہ مضبوط لہجہ اختیار کیا۔ "امیر محترم، اس بات کا یقین کریں کہ شاہ جوسیلین اپنے بہترین دوستوں کے ساتھ الرہا چھوڑ کر تل باشر میں گرمیاں گزارنے چلا گیا ہے۔"

"جعفر، پھر سوچ لے تو کیا کہہ رہا ہے؟" امیر زنگی کو اب بھی یقین نہیں آیا تھا۔

"اے امیر....." جعفر نے تفصیل بتانا شروع کی۔ "میں شاہ جوسیلین کو تل باشر پہنچا کے یہ خبر دینے آپ کے پاس آیا ہوں۔"

امیر جو فوراً ہی اس خبر سے متاثر ہو کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا، اُس نے سر اُٹھایا اور جعفر سے نرمی سے پوچھا۔ "الرہا میں اس وقت کتنی فوج ہے؟"

"اس وقت الرہا میں صرف عارضی فوج ہے۔" جعفر نے مزید انکشاف کیا۔ "الرہا کا انتظام شاہ جوسیلین، ارمنی اور کالدی تاجروں کے حوالے کر گیا ہے۔"

"الرہا..... میرے خوابوں کی تعبیر....." یہ کہتے ہوئے امیر زنگی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "اے مظلوموں کی سرزمین میں آ رہا ہوں، میں آ رہا ہوں۔ مجھے اپنا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا محسوس ہو رہا ہے۔"

اب امیر کی آنکھوں میں ان دیکھے سنہرے خواب لہرا رہے تھے اور جعفر سکوت کے عالم میں سر جھکائے کھڑا تھا۔

امیر زنگی جعفر کی لائی ہوئی خبر سے اس قدر خوش ہوا تھا کہ اُس نے رات کے کھانے پر جعفر کو اپنے دسترخوان پر جگہ دی۔ دوسری طرف سالار لشکر کو حکم ہوا کہ ضروری انتظام میں فوراً مصروف ہو جائے۔

کھانا ختم ہوتے ہی خیمہ گاہ کا سامان سمیٹا جانے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے چند ساعتوں کے بعد امیر زنگی کا پورا لشکر بڑی خاموشی اور نظم و ضبط کے ساتھ الرہا کی طرف روانہ ہو گیا۔ امیر زنگی اپنے ساتھ صرف خیمہ گاہ کا سامان لے گیا تھا اور خیموں کو اسی طرح ایستادہ چھوڑ دیا گیا تھا۔ امیر زنگی نے الرہا جانے کے لیے بڑا ٹیڑھا راستہ اختیار کیا۔ یہ راستہ جنگلوں اور ویرانوں سے گزرتا تھا۔ دراصل امیر زنگی جلد از جلد الرہا پہنچنا چاہتا تھا اور یہ بھی چاہتا تھا کہ اُس کے لشکر کی نقل و حرکت کی خبر زیادہ نہ پھیلنے پائے۔ اس احتیاط کا یہ نتیجہ ہوا کہ امیر کے لشکر کی خبر عام نہ ہوئی اور لوگوں کو اسلامی لشکر کی خبر اُس وقت ملی جب لشکر الرہا کی فصیلوں کے قریب پہنچ چکا تھا۔

الرہا عیسائیوں کی ایک مضبوط چوکی تھی۔ اُس کی فصیلیں اس قدر بلند اور مضبوط تھیں کہ انہیں توڑنا ناممکن نظر آتا تھا۔ قلعہ کے اندر غیر مستقل فوج تھی جسے پورے سال کی تنخواہ پیشگی دے کر قلعہ میں روک لیا گیا تھا۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ امیر زنگی اس مضبوط قلعہ کو توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے قلعہ والوں کو پیغام بھیجا۔

"اگر قلعہ حوالے کر دیا جائے تو یہاں کے باسیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔"

مگر ارمنی تاجروں کو قلعہ کی فصیلوں پر پورا اعتماد تھا اور ان کے خیال میں بلکہ یقین میں یہ بات تھی کہ قلعہ ناقابلِ تسخیر ہے۔

امیر نے احتیاطاً قلعہ والوں کو اوپر تلے کئی پیغام بھیجے مگر قلعہ والوں نے قلعہ حوالے کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ محاصرہ طول کھینچ رہا تھا اور امیر زنگی کو قلعہ پر فوری قبضے کی ضرورت تھی۔ پس امیر نے قلعے کی دیواروں کے نیچے سرنگیں کھدوائیں اور ان میں بارود بھر کر آگ لگا دی۔ یوں وہ مضبوط دیواریں رُوئی کے گالوں کی طرح اُڑ گئیں اور اسلامی لشکر قلعہ میں داخل ہو گیا۔ ایسے موقعوں پر فاتح لشکر بے قابو ہو جاتا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جوسیلین اور عیسائی حکمرانوں نے مسلمانوں پر جو ظلم و ستم ڈھائے تھے اس کا انتقام لینے کا موقع آ گیا تھا۔ چنانچہ امیر زنگی کے لشکر نے دل بھر کے انتقام لیا اور قلعے کے لشکر کا بیشتر حصہ قتل کر دیا گیا۔ خوب صورت عمارتیں مٹی کا ڈھیر بن گئیں۔ جواں عمر عیسائی لڑکوں اور لڑکیوں کو غلام و کنیز بنانے کے لیے گرفتار کر لیا گیا۔

پھر امیر زنگی قلعہ کے اندر گیا تو قلعہ کی خوب صورتی دیکھ کر حیران ہو گیا۔ امیر نے حکم دیا کہ قتل و غارت گری فوراً بند کی جائے۔ لوگوں کو امان دی جائے اور لوٹا ہوا مال واپس کر دیا جائے۔ الرہا میں کافی نقصان ہوا مگر امیر زنگی نے اُس کی رونق بحال کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔ اس کا اعتراف خود مغرب کے مؤرخین نے کیا ہے۔

ترن کوزی اور فادر فلپ تل باشر چھوڑ کے الرہا آ گئے تھے۔ الرہا میں ترن کوزی کا دشمن لارنس بھی موجود تھا۔ ترن کوزی کو یقین تھا کہ جعفر کی گرفتاری میں لارنس کا ہاتھ تھا۔ مگر الرہا پہنچ جانے کے بعد وہ لارنس یا جعفر کسی کو نہ پا سکی۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ فادر فلپ اور ترن کوزی ایک عبادت گاہ میں داخل ہوئے کہ اچانک ان کا سامنا جعفر سے ہو گیا۔ اُنہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا مگر قدرت کو اُن کا ملاپ منظور تھا اس لیے دو بچھڑے ہوئے دل ہمیشہ کے لیے ایک جان دو قالب ہو گئے۔

ترن کوزی اور جعفر کا اسلامی طریقے سے نکاح ہوا جس میں امیر زنگی نے بھی شرکت کی اور امیر نے جعفر کو اُس کی خدمات کے صلہ میں الرہا میں ایک چھوٹی سی جاگیر عطا کی۔ شادی کے اختتام پر فادر فلپ نے انکشاف کیا کہ ترن کوزی دراصل ایک مسلمان خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی ماں ترن کوزی کو جنم دینے کے بعد فادر فلپ کی عبادت گاہ میں فوت ہو گئی تھی۔ جعفر کی سفارش پر فادر فلپ کو الرہا کی سب سے بڑی عبادت گاہ کا لارڈ پادری بنا دیا گیا۔

❁ ❁ ❁ ❁

الرہا میں عیسائیوں کا تسلط ختم کر دیا گیا۔ گزشتہ ایک صدی سے کچلے ہوئے مسلمانوں نے سکھ کا سانس لیا۔ نصرانی جھنڈا سرنگوں اور اسلامی پرچم سربلند ہوا۔ عیسائیوں نے کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق اپنی شکست کی حسب مرضی تعبیریں شروع کر دیں۔

کسی نے کہا، شاہ جوسیلین، الرہا میں موجود نہ تھا اس لیے شکست ہوئی۔

کسی نے شکست کا یہ عذر پیش کیا۔

الرہا کی بہترین فوج تل باشر چلی گئی تھی اس لیے الرہا کو شکست ہوئی۔

ایک وجہ یہ بھی پیش کی گئی کہ الرہا کے عیسائی تاجر مسلمانوں سے مل گئے تھے اس لیے شکست ہوئی۔

الرہا کے عیسائیوں نے یہ الزام لگایا کہ امیر زنگی نے الرہا میں قتل عام کیا۔ عورتیں، بچے اور بوڑھے تک قتل کر دیے گئے۔ صلیبیں توڑ دی گئیں اور عبادت گاہوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔

مگر شکوہ کرنے والے اور الزام لگانے والے یہ بھول گئے کہ صرف ساٹھ سال پہلے جب عیسائیوں نے مسلمان علاقوں پر قبضہ کیا تھا تو عیسائی سورماؤں نے مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کے رکھ دیا تھا۔ انہوں نے وہاں کوئی مسجد نہ چھوڑی تھی۔ مسلمانوں کو زرق برق لباس پہننا ممنوع قرار دیا گیا تھا۔

قلعہ والے اس حقیقت کو بھول گئے کہ چند سال پہلے ہی امیر زنگی نے عیسائیوں کے متحدہ لشکر کے سامنے جس میں شہنشاہ قسطنطنیہ کا لشکر بھی شامل تھا۔ اپنے خیمے لگائے تھے جنہیں دیکھ کر شہنشاہ ''کامنی کس'' امیر زنگی کی جرأت سے اس قدر خائف ہوا کہ

رات کے اندھیرے میں میدان میں سامانِ حرب چھوڑ کے چپکے سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

بہرحال یہ ایک عام روش ہے کہ شکست کھانے والے، فاتح کو ہمیشہ درندہ صفت کہتے ہیں اور اسے طرح طرح کے بُرے ناموں سے پکارتے ہیں۔

فاتح بیت المقدس

سلطان صلاح الدین ایوبی کو فاتح بیت المقدس کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ یہ لقب اسے واقعی زیب دیتا ہے۔ کیونکہ مؤرخ عام طور سے صلاح الدین پر کچھ اس طرح تبصرہ کرتے ہیں۔

خدا کی راہ میں لڑنا صلاح الدین کا ایک دلی جذبہ تھا۔ اس کا دل ہمیشہ اس میں لپٹا رہتا تھا اور اسی میں اس نے جان و تن کو کھپا دیا تھا۔ آخری تین سالوں میں تو سوائے جہاد کے اور کوئی خیال اس کے دل میں آتا ہی نہ تھا۔ سوائے جہاد کے وہ کسی موضوع پر بات ہی نہ کرتا۔ اس نے ہر عیش و آرام اور بال بچوں میں رہنے کی خوشی کو اس خدمت پر قربان کر رکھا تھا۔ ایک دن اس نے اپنے دوست سے پوچھا۔ موتوں میں سب سے شان دار موت کون سی ہے؟ اس کے دوست نے جواب دیا۔ خدا کی راہ میں جان دینا سب سے بہتر موت ہے۔ صلاح الدین مسکرایا اور کہا۔ میں اُسی شان دار موت کے دروازے کی طرف جا رہا ہوں۔''

آپ جانتے ہیں کہ خدا کی راہ میں جہاد کا یہ شوق اور اس شان دار موت کا خواہش مند کون تھا۔ یہ سرفروش اور اسلام کا نام ور مجاہد صلاح الدین ایوبی تھا۔ ایسا مجاہد جسے نہ صرف مسلمان محبت سے یاد کرتے ہیں بلکہ اس کے دشمن بھی اس کا نام عزت اور احترام سے لیتے ہیں۔

فاتح بیت المقدس سلطان صلاح الدین ایوبی، کردوں کے ایک بڑے قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے دادا کا نام شادی تھا۔ شادی کے دو بیٹے تھے۔ نجم الدین ایوب اور شیرکوہ۔ چنانچہ شادی اپنے دونوں بیٹوں کو لے کر وطن سے نکلا اور بغداد پہنچا۔ وہاں سے تکریت گیا اور وہیں بس گیا۔ تکریت اس وقت کافی مشہور قلعہ تھا۔ شادی کے انتقال کے بعد نجم الدین ایوب اور شیرکوہ تکریت سے چل کر موصل کے حاکم عمادالدین زنگی کے پاس پہنچے۔ اس وقت مسلمانوں کی کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو چکی تھیں۔ ان میں موصل کافی بڑی ریاست تھی اور یہاں کا حاکم بڑا نیک اور بہادر تھا۔ اس نے قلعہ بعلبک کی حفاظت کا انتظام نجم الدین کے سپرد کر دیا۔ عمادالدین کے قتل کے بعد نجم الدین نے دمشق کے سلطان کی ملازمت قبول کر لی اور اس کا بھائی شیرکوہ، عمادالدین کے بیٹے نورالدین زنگی کی خدمت میں جا پہنچا جو اس وقت حلب کا والی تھا۔

سلطان صلاح الدین کی پیدائش اس رات ہوئی جب اس کا باپ نجم الدین تکریت سے نکل کر عمادالدین زنگی کے پاس جا رہا تھا۔ سلطان نورالدین زنگی نے جب دمشق فتح کیا تو نجم الدین نے بھی اس کی ملازمت اختیار کر لی۔ صلاح الدین اس وقت سولہ برس کا تھا۔ باپ اور چچا کے ساتھ اس نے بھی سلطان نورالدین زنگی کی خدمت میں جانا شروع کر دیا۔ نورالدین نے اسے دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ یہ نوجوان ذہین اور سمجھ دار ہے۔ وہ اپنے عام درباریوں سے زیادہ صلاح الدین کی عزت کرتا۔ صلاح الدین نے بھی دیکھ لیا کہ اس کے آقا میں کس قدر خوبیاں ہیں۔ وہ شریف ہے، عالی حوصلہ ہے، نیک و ہم درد اور بڑا دلیر اور بہادر ہے۔ اس نے (صلاح الدین نے) بھی کوشش کی کہ وہ ان خوبیوں کو اپنے اندر جذب کر لے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہمیں صلاح الدین کے بچپن کے حالات زیادہ معلوم نہیں۔ صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اسے دینیات، حدیث اور فقہ کے مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ شاعری سے بھی اسے عشق تھا۔ اس نے کئی استادوں کی شاگردی اختیار کی تھی لیکن اس کا سب سے بڑا استاد نورالدین زنگی تھا۔

صلاح الدین فطرتاً تنہائی پسند تھا۔ سلطان نورالدین زنگی نے کئی بڑی لڑائیاں لڑیں جن میں شیرکوہ برابر شریک رہا مگر ہم صلاح الدین کا نام کہیں نہیں دیکھتے۔ سب سے پہلی جنگ جس میں وہ شامل ہوا وہ ہے جب شیرکوہ نے مصر پر حملہ کیا۔ یہ واقعہ ۱۱۶۴ء کا ہے۔ اس وقت مصر پر خلیفہ السعامند کی حکومت تھی مگر وہ کم زور اور دوسروں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ پھر عیسائی وہاں حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ سلطان نورالدین کے لیے جو عیسائیوں کو اپنے ملک سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا، یہ ضروری تھا کہ اُس کا مصر پر قبضہ ہو جاتا۔ اسے اس کوشش میں کامیابی ہوئی۔ شیرکوہ وہاں کا وزیراعلیٰ مقرر ہوا اور اس کے انتقال کے بعد یہ عہدہ صلاح الدین کے ہاتھ آیا۔

سلطان نورالدین کے برسراقتدار آنے سے پہلے عباسی خلافت جس کا دبدبہ کبھی دور دور تک پھیلا ہوا تھا، کمزور ہو چکی تھی اور کئی حصوں میں بٹ چکی تھی۔ عیسائی جو مسلمانوں کے پرانے دشمن تھے، اس موقع کی تاک میں تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کا آپس میں اتفاق نہیں ہے اور وہ غیر منظم ہیں تو انہوں نے ایک دم ایشیاء کوچک پر حملہ کر دیا۔ وہ فتح پر فتح حاصل کرتے ہوئے ملک شام تک آ پہنچے اور بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے یہاں چار ریاستیں قائم کیں۔ الرہا، انطاکیہ، طرابلس اور بیت المقدس۔ بیت المقدس کی فتح سے مسلمانوں کو سخت دھچکا لگا۔ تاریخ میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی ان لڑائیوں کو ''صلیبی لڑائیاں'' کہا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ پہلی صلیبی جنگ تھی۔ بیت المقدس کا حاکم گاڈفرے کو مقرر کیا گیا اور باقی تین ریاستوں کو بھی اس کے ماتحت کر دیا گیا۔ مگر مسلمانوں کی یہ شکست عارضی تھی۔ عیسائیوں کے اس حملے سے اسلامی دنیا کے ستون ہل گئے مگر وہ گرے نہیں تھے۔ مسلمانوں کو یقین تھا کہ کوئی خدا کا بندہ ضرور اُٹھے گا اور انہیں متحد کر کے عیسائیوں کو اسلامی سرزمین سے باہر نکال دے گا۔ اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ کئی اللہ کے شیر پیدا ہوئے جنہوں نے عیسائیوں کے ہوش ٹھکانے لگا دیئے۔ ان میں پہلا نمبر عماد الدین زنگی کا ہے۔ جس نے ۱۱۴۲ء میں عیسائیوں کو شکست دے کر اُن کی ریاست الرہا پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد سلطان نورالدین زنگی اُٹھا جس نے اپنی ساری زندگی جہاد کے لیے وقف کر دی۔

الرہا کی شکست کے بعد عیسائیوں نے دوسری صلیبی جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ آپ کو یہ علم ہو چکا ہے کہ اس میں (صلیبی جنگ) یورپ کے بڑے بڑے بادشاہ اپنی فوجیں بھیجتے تھے اور عیسائیوں کا مذہبی پیشوا پوپ بھی ان کی مدد کرتا تھا۔ چنانچہ دوسری صلیبی جنگ کے لیے بھی انہوں نے بہت بڑا لشکر جمع کر لیا تھا۔ مگر سلطان نورالدین زنگی نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ اُس نے عیسائیوں کا طوفان پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔ ایک طرف اُس نے ایک تنظیم الشان سلطنت قائم کر دی اور دوسری طرف صلیبیوں کو روک کر اُن کی فتوحات کا سلسلہ ختم کر دیا۔ سلطان کی وفات ایک بڑا سانحہ تھا۔ اُس میں بے شمار خوبیاں تھیں۔ واقعی وہ خدا کی راہ میں مجاہد تھا۔

مؤرخ لکھتے ہیں:۔

''خلفاء راشدینؓ اور عمر بن عبدالعزیز کے سوا

نورالدین سے بہتر کوئی اور فرمانروا اُن کی نظر سے نہیں گزرا۔''

سلطان نورالدین زنگی کی وفات پر عیسائیوں میں بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ انہوں نے اپنی کوششیں پھر شروع کر دیں۔ چنانچہ شام کی طرف سے اُن کی فوجیں حرکت میں آئیں اور دمشق کے قریب پہنچ گئیں۔ یہاں نورالدین کے بیٹے اور ان کے وزیر کمزور تھے۔ انہوں نے اُن سے صلح کر لی۔ اس سے عیسائیوں کے حوصلے اور بڑھ گئے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے مصر پر حملہ کر کے اسے ختم کر دینا چاہیے۔ پس انہوں نے ایک بڑا بحری بیڑہ جس میں ۲۸۲ جہاز تھے جمع کیا اور مصر کی بندرگاہ اسکندریہ پر دھاوا بول دیا۔ صلاح الدین نے جو وہاں کا وزیراعظم اور مختارکل تھا یہ خبر سنی تو جلدی سے وہاں ایک لشکر بھیج دیا۔ عیسائیوں کو شکست ہوئی اور اُن کے کئی جہاز ڈوب گئے۔

سلطان نورالدین زنگی کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں اور رشتے داروں نے الگ الگ حکومتیں قائم کر لیں۔ اسکندریہ کے واقعہ کے بعد صلاح الدین کو اس بات کا سختی سے احساس ہوا کہ جب تک ساری ریاستوں کو ایک کر کے ان کا اندرونی نظام ٹھیک نہیں کر لے گا اس وقت تک عیسائیوں کے مقابلے پر مشکل ہو گی مگر دقت یہ تھی کہ کئی ریاستوں کے حاکم اُس کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ تھے۔ وہ اکثر دشمن سے بھی مل جاتے تھے اس لیے صلاح الدین کو مجبور ہو کے انہیں اپنے قبضہ میں کرنا پڑا۔ کسی کو ڈانٹ ڈپٹ کی، کسی سے مروت کا سلوک۔ پس ۱۱۷۴ء سے ۱۱۸۸ء یعنی تقریباً چودہ سال اس کوشش میں صرف ہوئے۔ یہ بات نہیں کہ اس طویل عرصے میں اُس کی عیسائیوں سے ایک لڑائی بھی نہیں ہوئی۔ اس عرصہ میں کئی چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوئیں۔ ان میں کہیں صلاح الدین کو فتح ہوئی اور کہیں عیسائیوں کو۔ مگر صلاح الدین نے اس طرف زیادہ توجہ نہ دی۔ اُس کا پہلا مقصد یہ تھا کہ ایک مضبوط حکومت قائم ہو جائے اور مدافعت اور حفاظت کا پورا پورا انتظام کیا جائے۔ اس مقصد میں بالآخر وہ کامیاب ہوا۔

چناں چہ اس نے ایک بڑی متحدہ سلطنت قائم کر لی۔ اس حکومت کی حدیں جنوب میں سوڈان کی آخری سرحد تک، مغرب میں برقہ تک، شمال میں آرمینیا تک اور مشرق میں موصل تک پہنچتی تھیں۔

اب ادھر صلاح الدین تھا۔ اُدھر دشمنوں میں طرابلس شام کا حاکم ریجنڈ بڑا لائق اور بہادر تھا۔ کرک کا حاکم ولی ریجی نالڈ بھی بڑا دلیر تھا۔ مگر اُس میں خرابی یہ تھی کہ خواہ مخواہ لڑائی مول لیتا تھا اور معاہدوں کی پابندی نہ کرتا تھا۔ سلطان صلاح الدین کو خون بہانے کا شوق نہیں تھا مگر وہ مجبور تھا۔ حالات ایسے تھے کہ اُس کے لیے لڑنا ضروری تھا۔ جب وہ ہر طرح سے مضبوط ہو گیا تو اُس نے فیصلہ کیا کہ عیسائیوں کو دوسرے کنارے پر جسے وہ عبور کر کے آئے تھے، دھکیل دے۔ دوسری جانب عیسائی اس کوشش میں تھے کہ اپنے اس نئے دشمن کو کچل کر رکھ دیں۔ ان میں ریجی نالڈ پیش پیش تھا۔ اُس میں اور صلاح الدین میں چار سال کے لیے یعنی ۱۱۸۴ء سے ۱۱۸۸ء تک عارضی صلح ہو چکی تھی۔ مگر ریجی نالڈ اس عارضی صلح سے اُکتا چکا تھا۔ پس اس نے معاہدہ کے خلاف ایک قافلہ کو جو کرک کے قریب سے گزر رہا تھا، لوٹ لیا۔ بہت سے لوگ قید ہو گئے کئی قتل کر دیئے گئے۔ صلاح الدین کو خبر ملی تو وہ بہت جز بز ہوا اور اس نے قسم کھائی کہ ریجی نالڈ اُس کے ہاتھ آیا تو وہ اُسے اپنے ہاتھ سے قتل کرے گا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

۱۱۸۷ء میں گرمیوں کے مہینے میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے جہاد کی عام منادی کرادی اور اپنے ماتحت حاکموں اور بادشاہوں کو حکم دیا کہ وہ اپنا اپنا لشکر لے کر اُس کے پاس پہنچ جائیں۔ چنانچہ چند دنوں میں ایک بڑا لشکر جمع ہو گیا۔ اُدھر عیسائیوں نے بھی خوب خوب تیاریاں کر لی تھیں۔ پچاس ہزار عیسائی صفوریہ کے مشہور شہر میں مسلمانوں کے مقابلے کے لیے جمع ہوئے۔ سلطان نے صفوریہ کا رخ کیا۔ یہ جمعہ کا دن تھا اور وہ اکثر جمعہ کے دن کو جنگ کے لیے مناسب سمجھتا تھا۔ راستہ میں عیسائیوں کا ایک بڑا مرکز طبریہ پڑتا تھا۔ مسلمانوں نے شہر پر قبضہ کر لیا مگر طبریہ کا قلعہ فتح نہ کر سکے تھے۔ جب عیسائیوں نے سنا کہ طبریہ کا شہر ان کے ہاتھ سے نکل گیا ہے تو وہ صفوریہ سے قلعہ والوں کی مدد کے لیے روانہ ہوئے۔

ادھر سلطان صلاح الدین نے پھرتی سے طبریہ کو چھوڑ کر دشمن کا رخ کیا۔ لشکر کو پانی کے کنارے اتارا اور اس کے سامنے جو پانی کے تالاب تھے وہ سب خشک کروا دیے۔ اس وقت بڑی شدید گرمی پڑ رہی تھی۔

عیسائیوں کو پانی کی بڑی دشواری پیش آئی مگر وہ کسی نہ کسی طرح اسلامی لشکر کے قریب پہنچ کر ٹھہر گئے۔ مسلمانوں نے کچھ رات عبادت میں اور کچھ آرام کرنے میں گزاری۔ اس دوران صلاح الدین نے انہیں ضروری ہدایات اور احکامات دیے۔

دوسرے دن عیسائیوں کی یہ کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح پانی تک پہنچ جائیں۔ صلاح الدین کو پہلے یہ علم تھا کہ ایسی کوشش ہو گی چنانچہ اس نے اس کوشش کو ناکام کرنے کی ٹھانی۔ اس نے انہیں چکر دے دلا کر ایک دائرے میں جکڑ لیا ان کے لیے اس دائرے سے نکلنا بہت مشکل تھا۔ انہوں نے لڑ بھڑ کر بحیرۂ طبریہ کی طرف نکل جانا چاہا لیکن صلاح الدین خود ان کے سامنے جم گیا۔ عیسائیوں نے بھی پورا زور صرف کر دیا۔ بڑی خون ریز جنگ ہوئی صلاح الدین نے فوج کے ہر حصے میں جا کر سپاہیوں کو جوش دلایا اور انہیں ضروری ہدایات دیتا رہا۔ جب عیسائیوں نے دیکھا کہ بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے تو انہوں نے آخری مقابلے کے لیے جان کی بازی لگا دی۔ ان کے لگاتار حملوں سے مسلمانوں کی صفیں درہم برہم ہو گئیں مگر ہر حملے میں عیسائیوں کی کافی تعداد قتل ہو جاتی تھی اور ان کی قوت برابر گھٹتی جا رہی تھی۔ آخر مسلمانوں نے انہیں ہر طرف سے گھیر لیا۔ انہوں نے کوہ حطین میں پناہ لینے کی کوشش کی مگر راستہ ہر طرف سے بند تھا۔ صرف ٹھوڑی سی فوج کوہِ حطین کی سمت جا سکی۔ مسلمانوں نے چاروں طرف سے حملہ کر کے مقدس صلیب کو جو حضرت مسیح کی سولی کی شکل میں بنی ہوئی تھی ان سے چھین لی۔ اس سے عیسائیوں میں بڑی بے دلی پھیل گئی اور انہوں نے آخری کوشش کی مگر وہ مسلمانوں کے حملے کو نہ روک سکے۔ مسلمان یلغار کرتے ہوئے شاہ بیت المقدس گائی کے خیمے تک جا پہنچے اور اس کو گرا دیا۔ عیسائیوں نے جب دیکھا کہ ان کی قوت بالکل جواب دے چکی ہے اور جنگ جاری رکھنے میں موت کے سوا کچھ حاصل نہیں تو انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

مسلمانوں نے بادشاہ گائی، ریجی نالڈ اور کئی بڑے بڑے امیروں کو گرفتار کر لیا۔ قیدیوں کی اس قدر کثرت تھی کہ ان پر نظر پڑتی تو خیال گزرتا جیسے سارا عیسائی لشکر پکڑا گیا ہے۔ ادھر میدان جنگ میں پڑی ہوئی لاشیں نظر آتیں تو اندازہ ہوتا جیسے کوئی زندہ نہ بچا ہو گا۔

جنگ ختم ہونے کے بعد معزز قیدی، سلطان کے سامنے پیش کیے گئے۔ بادشاہ گائی کو سلطان نے اپنے پہلو میں جگہ دی۔ باقی امیروں کو بھی ان کے مراتب

کے مطابق بٹھایا گیا۔ یہ بیان ہو چکا ہے کہ سلطان صلاح الدین نے قسم کھائی تھی کہ اگر ریجی نالڈ اس کے قبضے میں آیا تو اسے اپنے ہاتھ سے قتل کرے گا۔ چنانچہ سلطان نے پہلے اس کے سامنے سلام پیش کیا۔ اس کے انکار پر اپنے ہاتھ سے اس کا سر اڑا کر اپنی قسم پوری کی۔ ریجی نالڈ کا انجام دیکھ کر گائی ڈر گیا۔

سلطان نے اسے اطمینان دلایا اور کہا۔

"بادشاہوں کا یہ دستور نہیں کہ وہ دوسرے بادشاہ کو قتل کریں۔ ریجی نالڈ کو تو خود اپنی زیادتیوں کی وجہ سے اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔"

"حطین" کی شکست سے عیسائیوں کی قوت بہت کمزور پڑ گئی۔ اسلامی فوجوں نے حطین کی فتح کے بعد صرف ایک دن آرام کیا اور پھر ایک زبردست سیلاب کی طرح ملک میں پھیلنا شروع کیا۔ اب فوجوں کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ کسی شہر کے سامنے آئیں اور اس کی دیواریں گر پڑیں۔ اور شہر کی فوج اپنے ہتھیار ڈال دے۔ صرف چند مضبوط قلعے ایسے تھے جنہوں نے کچھ ہمت کی۔ لیکن ان میں سے کوئی قلعہ ایسا نہ تھا جس نے ایک ہفتہ سے زیادہ مقابلہ کیا ہو۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے طبریہ پر قبضہ کیا گیا جس نے ایک ہفتہ سے زیادہ مقابلہ کیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے طبریہ پر قبضہ کیا گیا۔ پھر فلسطین کی بندرگاہ اور تجارت کی منڈی عکہ پر حملہ ہوا۔ وہاں کے باشندوں نے اطاعت قبول کر لی۔ سلطان نے انہیں اجازت دی کہ وہ اگر چاہیں تو عکہ رہ سکتے ہیں اور چاہیں تو اپنا مال لے کر چلے جائیں۔ عکہ کی جامعہ مسجد کو عیسائیوں نے گرجا بنا لیا تھا۔ تقریباً ایک سو سال بعد صلاح الدین نے اسے پھر مسجد بنایا اور وہاں جمعہ کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد کئی اور چھوٹے چھوٹے شہر فتح ہوئے اور ان کے بعد فلسطین کے خوب صورت اور مضبوط شہر بیروت پر قبضہ کیا۔ بیروت کے بعد ساحلی شہروں میں صور اور عقلان دو بڑے شہر رہ گئے تھے۔ صور کا حاکم کونریڈ تھا۔ اس کے پاس زبردست فوج تھی۔ اسے فتح کرنے کے لیے کچھ وقت چاہیے تھا۔ اس لیے سلطان نے پہلے عقلان کا رخ کیا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ مگر شہر والوں نے چند روز بعد جان کی امان چاہی اور شہر مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔

عقلان کی فتح کے بعد بیت المقدس کا راستہ صاف ہو گیا مگر اس پر قبضہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ وہاں بہت سے شکست کھائے ہوئے فوجی جمع ہو گئے تھے جن کی تعداد ساٹھ ہزار سے بھی زیادہ تھی۔ بیت المقدس مسلمانوں کے لیے اتنا ہی مقدس تھا جتنا عیسائیوں کے لیے۔ اس لیے سلطان وہاں خونریزی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پس اس نے عیسائیوں کو پیغام بھیجا کہ شہر میرے حوالے کر دو۔ اس کے معاوضہ میں تم کو اتنا علاقہ دوں گا کہ جتنا تم سنبھال سکو۔ مگر عیسائیوں نے انکار کر دیا۔ اب سلطان مجبور تھا کہ جنگ کرے۔

پس جنگ شروع ہو گئی اور کئی روز تک پرزور مقابلہ ہوتا رہا۔ مسلمان سپاہی شہر پناہ کو توڑنا چاہتے تھے مگر اس کے اوپر سے تیر چلائے جا رہے تھے۔ باہر بھی عیسائی سپاہی لڑ رہے تھے اس لیے مسلمان شہر تک نہ پہنچ سکے تھے۔ آخر ایک مرتبہ مسلمانوں نے یلغار کر کے عیسائیوں کو اندر کی طرف دھکیل دیا اور بڑھتے ہوئے شہر پناہ تک پہنچ گئے اور بھاری پتھر مار کر اسے توڑ ڈالا۔ جب عیسائیوں نے دیکھا کہ وہ شہر کو نہیں بچا سکتے اور ان کی موت یقینی ہے تو وہ شہر حوالے کرنے پر تیار ہو گئے۔ پہلے تو سلطان نے انکار کیا پھر اس خیال سے کہ کہیں شہر کی بے حرمتی نہ ہو وہ مان گیا۔ شرط یہ قرار پائی کہ بیت المقدس کے تمام عیسائی فی مرد دس دینار،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فی عورت پانچ دینار اور فی بچہ دو دینار ادا کریں گے۔ اور چالیس دن کے اندر جن کا فدیہ ادا نہ ہوگا وہ غلام شمار کیے جائیں گے۔ اس طرح پورے اکیانوے سال بعد خدا کا یہ گھر پھر مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔ اتفاق دیکھیے کہ وہ تاریخ معراجِ نبوی کی ہے۔

آپ کو شاید معلوم ہو کہ جب عیسائیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کیا تو انہوں نے مسلمانوں پر بڑے ظلم ڈھائے تھے۔ سلطان چاہتا تو اس کا بدلہ لے سکتا تھا مگر اس نے عیسائیوں سے بڑی فیاضی اور شرافت کا سلوک کیا۔ اس بات کو عیسائی بھی مانتے ہیں۔

عیسائیوں نے پچھلے ایک سو سال میں بیت المقدس کی حالت بگاڑ دی تھی۔ سلطان نے وہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک کر دیا۔ مسجد اقصیٰ کو نجاستوں سے پاک کیا اور اس میں وہ خوب صورت منبر رکھوایا جو سلطان نورالدین زنگی نے اپنے عہد میں بنوایا تھا کہ وہ بیت المقدس فتح کر کے اسے مسجد میں رکھوائے گا۔

بیت المقدس پر مسلمانوں کے قبضہ نے ساری عیسائی دنیا میں ایک تہلکہ برپا کر دیا اور تیسری صلیبی جنگ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اس کے لیے پادریوں نے یورپ کا دورہ کر کے اپنی پرجوش تقریروں سے مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کے دلوں میں آگ لگا دی۔ پوپ نے فتویٰ دیا۔

"جو شخص اس مقدس جنگ میں شریک ہوگا اس کے سارے گناہ دھل جائیں گے۔"

غرض تھوڑے عرصہ میں ایک بڑا لشکر تیار ہو گیا۔ فرانس، جرمنی، اٹلی اور سسلی کے بادشاہ اس میں شریک تھے۔ اتنے بہت سے بادشاہوں نے پہلے کبھی حصہ نہ لیا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ پیش پیش انگلستان کا بادشاہ رچرڈ تھا۔ اس عظیم الشان لشکر نے سب سے پہلے عکہ کا محاصرہ کیا۔ سلطان صلاح الدین نے پورے تین سال تک بڑی بہادری کے ساتھ یورپ کی اس متحدہ قوت کا مقابلہ کیا۔ اس مدت میں سو سے زیادہ لڑائیاں ہوئیں اور نوے بڑے معرکے۔ آخر سلطان نے شہر کو چند شرطوں پر عیسائیوں کے حوالے کر دیا۔

عکہ پر قبضہ کرنے کے بعد عیسائیوں نے "یافا" جسے مسلمانوں نے خالی کر دیا تھا۔ اپنے قبضہ میں کر لیا۔ چونکہ سلطان، عقلان کی حفاظت نہیں کر سکتا تھا اس لیے اسے برباد کر دیا گیا۔ اب عیسائی بیت المقدس کی طرف بڑھے مگر سلطان نے اس کی حفاظت کا ایسا اعلیٰ انتظام کیا تھا کہ عیسائی ذرہ برابر کامیابی نہ حاصل کر سکے۔ اِدھر اُدھر لڑائیاں ہوتی رہیں جو بے نتیجہ ثابت ہوئیں۔ ان لڑائیوں سے تنگ آ کر کئی بادشاہ اور امیر یورپ واپس چلے گئے مگر شاہ رچرڈ برابر میدان میں ڈٹا رہا۔ رچرڈ بیت المقدس فتح کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہا مگر ناکام رہا۔ آخر تنگ آ کر اسے صلح کرنی پڑی۔

صلح کی شرط یہ تھی کہ عکہ سے لے کر یافا تک کے ساحل پر عیسائی قابض رہیں گے اور وہاں سے لے کر جنوب کا ساحلی علاقہ صلاح الدین کے قبضہ میں رہے گا۔

اس جنگ میں یورپ کے لاکھوں سپاہی، کئی بادشاہ اور سیکڑوں امیر کام آئے اور بے اندازہ دولت برباد ہوئی۔ اس کے مقابلہ میں عیسائیوں کو حاصل کچھ نہ ہوا۔ مسلمانوں کو بھی کافی نقصان اٹھانا پڑا لیکن ان کو اس کے بدلے میں فلسطین کا تقریباً پورا علاقہ مل گیا۔ اس تیسری صلیبی جنگ میں تمام مسیحی دنیا کی طاقت مقابلہ کرنے آئی مگر سلطان صلاح الدین کی قوت کو ٹس سے مس نہ کر سکی۔

صلح کے بعد سلطان نے فوجوں کو آرام دینے کے

لیے ان کو وطن واپس کر دیا اور خود چند ماہ کے لیے فلسطین میں ٹھہر گیا اور انتظام کرنے کے بعد دمشق واپس آ گیا۔ کئی سال سے اس کی صحت بگڑ رہی تھی مگر وہ جہاد میں اس قدر مصروف تھا کہ آرام کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ بیماری کی وجہ سے رمضان کے بہت سے روزے قضا ہو گئے تھے۔ طبیب نے روکا کہ صحت پر برا اثر پڑے گا۔

سلطان نے جواب دیا۔ "معلوم نہیں، آئندہ کیا پیش آئے۔"

اور پھر کل قضا روزے پورے کیے۔ اس سے اس کی صحت مزید بگڑ گئی اور بخار آنے لگا۔ آخر منگل کے دن ۴ مارچ ۱۱۹۳ء فجر کے وقت سلطان نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ اس وقت کل ۵۷ سال کی عمر تھی۔ غسل کے بعد عصر کے وقت اسی مکان میں جس میں بیمار ہوئے تھے، اس مجاہد اعظم کو سپردِ خاک کیا گیا۔ میت کے ہمراہ وہ تلوار بھی رکھ دی گئی جو ہمیشہ خدا کی راہ میں بے نیام رہی اور اب اس کو چلانے والا ہاتھ باقی نہ رہ گیا تھا۔

سلطان صلاح الدین کی موت سے اسلامی دنیا میں صف ماتم بچھ گئی۔ کوئی دل ایسا نہ تھا جو اس غم میں رنجیدہ نہ ہوا ہو اور کوئی آنکھ نہ تھی جو اس کے ماتم میں نہ روئی ہو۔ میت کو دفن کر کے سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے آئے اور دروازے بند کر کے بیٹھ گئے۔ گلی کوچوں میں کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ قبر پر لوگ قرآن پڑھتے اور رو رو کے خدا سے دعائیں مانگتے کہ جو شخص یہاں سویا ہوا ہے اس پر ہمیشہ خدا کی رحمت برستی رہے۔

سلطان صلاح الدین بہت بہادر اور نڈر انسان تھا۔ کیسا ہی خطرناک مرحلہ کیوں نہ ہو وہ بالکل نہ گھبراتا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ عیسائیوں کی بہت بڑی تعداد ہے اور ان کی امدادی فوجیں لگاتار آ رہی ہیں لیکن سلطان صلاح الدین پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ بلکہ اس سے اس کا حوصلہ بڑھ جاتا تھا۔ وہ ہر سال موسم سرما میں فوجوں کو ان کے وطن واپس بھیج دیتا تھا اور خود تھوڑی سی فوج کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرتا رہتا تھا۔

جنگ کے زمانہ میں دشمنوں کی طاقت اور حالات معلوم کرنے کے لیے خطرے کی پروا کیے بغیر ان کے گرد ایک دو مرتبہ ضرور چکر لگاتا تھا۔ عین جب لڑائی زور و شور سے ہو رہی ہوتو فوجوں کی صفوں میں گھوم پھر کر ان کی ترتیب قائم کرتا اور سپاہیوں کو ضروری ہدایات دیتا تھا۔ وہ اس سلسلے میں دشمنوں کی فوجوں کے بالکل قریب پہنچ جاتا تھا۔ اس نے کبھی پروا نہیں کی کہ دشمن کی تعداد زیادہ ہے اور اس کو کبھی اہمیت نہ دی۔ مگر اس کے باوجود وہ جنگی چالوں سے غافل نہ رہتا تھا۔ وہ اپنے فوجی افسروں کی رائے توجہ سے سنتا اور جو اچھی ہوتی اس پر عمل کرتا تھا۔

صلاح الدین کی ساری عمر میدانِ جنگ ہی میں گزری۔ کئی بار سخت بیمار ہوا لیکن اس کے جہاد میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ ہمیشہ اور ہر وقت جہاد ہی میں مصروف رہتا تھا۔ اس کو جہاد کا اس قدر شوق تھا کہ اس کے دل و دماغ پر دن رات جہاد ہی چھایا رہتا تھا۔ جہاد کے سوا نہ وہ کسی موضوع پر بات کرتا اور نہ کسی کی کوئی اور بات سنتا تھا۔ غرض یہ کہ جہاد اس کا اوڑھنا بچھونا تھا اس لیے اس نے اپنے بیوی بچے، وطن، گھر بار اور آرام کے سارے سامان چھوڑ دیے تھے۔ بس خیمے کی زندگی اختیار کر لی تھی جس کے گرد آگ تیز ہوا کے جھکڑ چلتے۔

صلاح الدین کو جہاد میں جس قدر دقتیں اور مشکلات پیش آئیں اتنا ہی اس میں صبر و استقلال بڑھتا گیا۔ جو لوگ اس کے زیادہ قریب رہنا چاہتے تھے وہ جہاد کو اس کا وسیلہ بناتے تھے۔ اس کا یہ حال اور جہاد میں اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی محبت دیکھ کر کئی علماء نے جہاد پر مختلف انداز سے کتابیں لکھیں۔ جنہیں سلطان صلاح الدین نہایت دلچسپی اور انہماک سے پڑھا کرتا تھا۔

سلطان کی ہمت اور استقلال کا یہ عالم تھا کہ جس زمانہ میں وہ عکہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا تو اس کے نچلے دھڑ میں بہت سے پھوڑے نکل آئے تھے۔ اس قدر تکلیف بڑھ گئی تھی کہ دسترخوان پر نہ بیٹھا جاتا تھا لیکن اس عالم میں بھی صبح سے ظہر تک اور عصر سے مغرب تک برابر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا رہتا تھا۔ جب لوگوں نے اس کے اس صبر اور برداشت پر حیرانی کا اظہار کیا تو اس نے کہا۔

"جب میں گھوڑے پر سوار ہو جاتا ہوں تو تکلیف ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن گھوڑے سے اترتا ہوں تو پھر وہ (تکلیف) واپس آجاتی ہے۔"

ایک بار سلطان بیمار تھا۔ عیسائیوں کو اس کی خبر ملی تو وہ ایک اسلامی شہر کی جانب بڑھے۔ سلطان اسی بیماری کی حالت میں ان کے مقابلہ پر نکل کھڑا ہوا۔ گرمی بہت سخت تھی۔ سلطان نے دھوپ سے بچنے کے لیے چہرے پر رومال ڈال لیا تھا۔ وہ تھوڑی دور چل کر ٹھہر جاتا تھا۔ اس طرح اس نے سارا سفر طے کیا اور عیسائیوں کے قریب پہنچ کر ان کی تدبیر ناکام بنادی۔

اسی طرح ایک اور شہر کے محاصرے کے دوران سخت سردی پڑ رہی تھی۔ بارش ہونے سے سردی اور چمک گئی تھی۔ اس حالت میں اس نے پوری رات جاگ کر اپنے سامنے پانچ خیمے لگوائیں۔

پھر ایک جنگ کے دوران سلطان کو اس کے نوجوان بیٹے اسمٰعیل کی موت کی خبر ملی۔ سلطان نے یہ واقعہ کسی دوسرے سے بیان نہیں کیا اور نہ یہ ظاہر ہونے دیا کہ اس پر کیسا افسوس ناک واقعہ گزرا ہے۔ البتہ جب وہ بیٹے کے انتقال کا خط پڑھتا تو آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ اسی طرح نوجوان بھتیجے تقی الدین کی موت کی خبر آئی تو اتنا رنج ہوا کہ ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ تقی الدین سے اسے بے حد محبت تھی۔ مگر اس نے صرف چند خاص لوگوں کو یہ خبر بتائی اور انہیں تاکید کر دی کہ خبر عام نہ ہونے پائے۔ سلطان کو اپنے بچوں سے بڑی محبت تھی مگر خدا کی راہ میں سب کو چھوڑ دیا۔

سلطان صلاح الدین صرف مجاہد ہی نہیں بلکہ اخلاق و کردار کا بھی مکمل نمونہ تھا۔ بیماری کی حالت میں بھی امام کو گھر سے بلا کر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتا تھا۔ ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ سلطان صلاح الدین ایوبی نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ان کی تمدنی اور علمی زندگی کے لیے بہت سے کام کیے۔ اس نے اپنی ساری سلطنت میں مدرسے اور کالج قائم کیے۔ بڑے بڑے شہروں میں مسافر خانے، شفاخانے اور مسجدیں اور سرائیں تعمیر ہوئیں۔ صوفیوں کے لیے خانقاہیں بنوائیں۔ سلطان پر خدا کی لاکھ لاکھ رحمتیں ہوں۔ آیئے اس کے حق میں دعائے خیر کریں کیونکہ اس عظیم فاتح نے اپنی پوری زندگی اسلام کے پھیلانے میں صرف کر دی۔

"بیت المقدس۔ عظمت اور قدامت"

دنیا کی تمام زبانوں کے مؤرخین اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ دنیا کا کوئی شہر بیت المقدس (یروشلم) سے زیادہ قدیم نہیں ہے اور شاید تاریخ اس کے قدیم دور کی داستان محفوظ نہ کر سکی۔ بہرحال جس حد تک تاریخ بتاتی ہے اس کے مطابق یہاں پہلے پہل آل سام ۲۵۰۰ یعنی ڈھائی ہزار سال قبل مسیح آباد ہوئے۔

آل سام کے یہ قبائل جزیرۃ العرب سے ہجرت کر کے یہاں پہنچے تھے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ یہ قبائل کنعانی یا فونیقی تھے۔ ان قبائل کی ایک شاخ

جبوسیوں کے نام سے بھی مشہور تھی۔

۲۰۰۸ (ق۔م) میں شاہ لیم یا شالیم بادشاہ کی حکومت تھی اور سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ شہر ارجو دریائے دجلہ اور فرات کے سنگم پر واقع تھا، سے ہجرت کر کے اس علاقے میں پہنچے تھے اور حبرون کے مقام پر قیام کیا تھا۔ یہی حبرون بعد میں "الخلیل" کے نام سے مشہور ہوا تھا۔ اس علاقے میں برآمد ہونے والی تختیوں اور مقدس کتابوں کی روایات سے یہ پتا چلتا ہے کہ یہاں کا حاکم بھی حضرت ابراہیمؑ کی طرح ہی عبادت کرتا اور خود کو خدا کا بھیجا ہوا فرشتہ بتاتا تھا۔

کتاب پیدائش اور ابن کثیر کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ حضرت ابراہیمؑ خاص قوت اور طاقت کے مالک ہو گئے تھے۔

پھر جب دمشق کے بادشاہوں نے جناب لوطؑ سے جو وادیٔ اردن میں مقیم تھے، گستاخی کی تو حضرت ابراہیمؑ اپنے آدمیوں کو لے کر دمشق والوں سے برسرِ پیکار ہوئے اور انہیں شکست سے دوچار کر کے دمشق تک ان کا تعاقب کیا تھا۔

اس سلسلے میں ابن کثیر کا بیان ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ اس فتح کے بعد لوٹے تو بیت المقدس کے بادشاہ نے جو مصر کا باجگزار تھا، شہر سے باہر نکل کر حضرت ابراہیمؑ کا استقبال کیا۔ یہ بادشاہ یبوسی تھا۔ کتاب پیدائش اور قدیم عرب مؤرخین کی روایت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اسی وادی سے حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو وادیٔ فاران میں چھوڑ گئے تھے اور حضرت ابراہیم نے ۱۷۵ سال کی عمر میں انتقال کیا تو اس شہر کی وادی حبرون میں مدفون ہوئے۔ ان کی وفات کے چالیس سال بعد حضرت یعقوبؑ نے بیت المقدس کے ایک مقام پر "بیت ایل" پر ایک مذبح تعمیر کیا جس کے کھنڈرات پر صدیوں بعد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حضرت سلیمانؑ نے ہیکل کی عمارت بنائی۔

چنانچہ کتاب پیدائش میں ہے۔

یعقوب ان سب لوگوں سمیت جوان کے ساتھ تھے، لوز پہنچا۔ بیت ایل یہی ہے اور ملک کنعان میں ہے۔ وہاں اس نے مذبح بنایا اور اس کا نام ایل "بیت ایل" رکھا۔

اور جب حضرت یعقوبؑ عرصہ دراز تک جلاوطنی گزارنے کے بعد واپس آئے تو ان کا نام "اسرائیل" ہوگیا۔ ان کی یہ جلاوطنی اپنے بڑے بھائی اُدوم کے خوف سے تھی۔ جب وہ بھائی سے مطمئن ہوگئے اور واپس آئے تو بھائی اُدوم نے ایثار کرتے ہوئے "اُدومیا" کی طرف پسپائی اختیار کی۔ حضرت ایوب اُدوم کے بیٹے تھے اور حضرت ابراہیم کا دور بائیسویں صدی قبل مسیح بیان کیا جاتا ہے۔

ایل بیت ایل (یعنی بیت ایل کا خدا) کی اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں کہ حضرت یعقوبؑ نے بیت ایل میں خدا کو "عالم رویا" میں دیکھا تھا اور اس کی یاد میں وہاں ایک مذبح بنایا تھا۔

حضرت یعقوبؑ کے صاحب زادے حضرت یوسفؑ جب مصر پہنچے اور بادشاہ ہوئے تو حضرت ابراہیم کے پوتے اسرائیل (یعقوب) کی اولاد اپنے جدامجد کی وفات سے ڈیڑھ سو سال بعد مصر منتقل ہوگئی اور اسے خوب عروج حاصل ہوا۔ لیکن حضرت یوسفؑ کے انتقال کے بعد یہ قوم معتوب ہوئی۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے رحم فرمایا اور مصر میں آمد سے چار سو سال بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس میں مبعوث فرمایا جنہوں نے اسے فرعون کے ظلم و استبداد سے نجات دلائی اور بنی اسرائیل دریائے نیل پار کر کے وادی سینا میں داخل ہوگئے۔

یہ قوم اپنے نبی کی نافرمان اور احسان فراموش ثابت ہوئی اور بتوں کی پوجا کرنے لگی اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اسے ڈانٹ پلائی تو وہ ان پر چڑھ دوڑی۔ مگر اللہ نے اپنے کلیم (موسیٰ) کی حفاظت فرمائی۔ اس کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو بیت المقدس میں داخل ہونے کا حکم دیا تو یہ قوم فرمانِ پیغمبر کی تعمیل سے گریزاں ہوئی اور صاف کہہ دیا۔

"تو اور تیرا رب جائے۔ ان سے لڑے۔ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔"

بنی اسرائیل کی یہ گستاخی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ناگوار گزری۔ انہوں نے یہ سزا دی کہ جب تک موجودہ نسل کے تمام بالغ مرنہیں جاتے وہ وادی "تیہ" میں ہی بھٹکتی پھرے۔

طبری کے مطابق یہ عرصہ چالیس سال پر محیط ہے۔ اس عرصہ میں ہلاک ہونے والے یہودیوں کی تعداد تین لاکھ سے زیادہ بتائی گئی ہے۔ بیت المقدس میں وہ دو سو سال بعد داخل ہوئے۔

تواریخ میں درج ہے کہ یشوع بن نون نے ۱۴۵۱ قبل مسیح میں بیت المقدس پر حملہ کیا تھا۔ اس زمانہ میں "اُدونی صدق" یروشلم کا بادشاہ تھا۔ حبرون، یرموت، لکیس اور عجلون کے بادشاہ اس کے معاون و مددگار تھے اور وہ سب کے سب عموری تھے۔ یشوع نے انہیں جبعون کے مقام پر شکست دی۔ پانچوں بادشاہ مارے گئے اور کنعان پر بنی اسرائیل کا قبضہ ہوگیا۔

بائبل کے مطابق یروشلم اس وقت بھی مقدس شمار ہوتا تھا۔ اسرائیل نے کامیابی کے بعد "حبرون" کو اپنا دارالحکومت قرار دیا اور ان کی سلطنت اردن، شام اور یمن کی سرحدوں تک جا پہنچی۔ آثارِ قدیمہ کی کھدائی بتاتی ہے کہ یشوع بن نون کی آمد سے پانچ سو سال قبل برنجی دور شروع ہو چکا تھا۔ اور مقامی لوگ تانبے اور ٹین

استعمال کرنی دھات کا استعمال کرتے تھے۔

بائبل گواہ ہے کہ جب بنی اسرائیل فراعنہ مصر کے تحت ذلت کی زندگی گزارنے اور چالیس سال تک وادی تیہ میں بھٹکنے کے بعد فلسطین میں داخل ہوئے تو اس وقت حضرت ابراہیمؑ کو انتقال کیے تقریباً پانچ سو سال گزر چکے تھے اور اس وقت بنی اسرائیل حد درجہ خدا پرست ہوگئے تھے۔

یشوع بن نون نے ارض فلسطین کی تقسیم میں یروشلم، یہوداہ کو دیا۔ لیکن بائبل کا بیان ہے کہ یہوداہ نے اپنے بھائی شمعون کی مدد سے لڑ کر اس شہر پر قبضہ کیا اور یہ واقعہ ۱۴۰۰ قبل مسیح کا ہے۔

بائبل گواہی دیتی ہے کہ باوجود اس کے کہ یہوداہ نے یروشلم میں لوگوں کو تہہ تیغ کرنے اور شہر تباہ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ بنی بنیمین جنہیں یہوداہ آگے بڑھتے ہوئے شہر کی نگرانی سونپ گیا تھا۔ یبوسیوں کو جو یروشلم میں رہتے تھے۔ انہیں نہ نکال سکے۔ پھر جب بنی اسرائیل طاقت کے زور پر راہِ ہدایت سے بھٹک گئے اور انہوں نے احکامِ الٰہی کو پسِ پشت ڈال دیا اور وہ جذبہ جس نے انہیں فاتح بنایا تھا، دم توڑ گیا تو وہ ذلیل ہوگئے۔ البتہ کبھی کبھی ان میں سے کسی کی غیرتِ ایمانی جوش مارتی اور ان کے جذبہ کو ہوا دیتی تو وہ وقتی طور پر اُبھر آتے لیکن اس کی موت کے ساتھ پھر ذلت و رسوائی میں ڈوب جاتے تھے۔ یہاں تک کہ یبوسیوں نے انہیں وہاں سے نکال دیا اور یروشلم ان کے لیے اجنبی شہر بن گیا۔

اس دور میں ان پر قاضی حکومت کرتے تھے لیکن ان کی قومی زندگی طوائف الملوکی کا شکار تھی کہ ہر شخص اپنی مرضی کا مالک تھا۔ خود قاضی اور کاہن اپنی قوم کی بداعمالیوں میں برابر کے شریک تھے۔ اللہ نے سموئیلؑ نبی کو جو یہودیوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد دوسرے نبی شمار ہوتے ہیں، معبوث فرمایا۔

سموئیلؑ نبی نے یہودیوں کو صنم پرستی سے چھٹکارا اور فلسطینیوں کی غلامی سے نجات دلوائی۔ چنانچہ اللہ کی شریعت پر عمل کرنے سے اسرائیلیوں پر ماضی کی شان و شوکت لوٹ آئی۔ حضرت سموئیلؑ جب اپنی آخری منزل پر پہنچے تو انہوں نے بنی اسرائیل کی منشا کے مطابق ان پر حضرت طالوت کو بادشاہ مقرر کر دیا۔ ان کے حاکم ہونے کے تیس سال قبل یعنی ۱۰۵۰ ق۔م شدودی، بنی اسرائیل کو شکست دے کر تابوت سکینہ لے گئے تھے جو سات ماہ بعد انہوں نے خود ہی واپس کر دیا تھا۔

۱۰۲۰ ق۔م میں طالوت کو بادشاہت ملی اور اس کا سارا عرصہ فلسطینیوں سے لڑائیوں میں گزرا۔ ان جنگوں میں ایک نوجوان نے تلوار کے خوب جوہر دکھائے اور مشرکین کا سالارِ اعلیٰ جالوت بھی اس جوان کے ہاتھ سے مارا گیا۔ یہ نوجوان حضرت داؤدؑ تھے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ سموئیلؑ نبی کی آمد تک یہود باقاعدہ قوم کی حیثیت حاصل نہیں کر سکے تھے بلکہ ان کے قبائل کی انفرادیت برقرار تھی اور وہ ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ اس صورت حال نے انہیں شدید نقصان پہنچایا تھا۔ حضرت سموئیلؑ آئے تو ان کی قبائلی انفرادیت ختم کر کے اسے ایک متحد قوم کی صورت دے دی۔

سموئیلؑ ایک روحانی آمر تھے۔ وہ ایک وقت میں بادشاہ بھی تھے اور رہنما بھی اور انہیں قاضی القضات، استاد اور ایک پیغمبر کے فرائض انجام دینا پڑے۔ اگرچہ انہوں نے مخالف قبائل کو اکٹھا کر دیا لیکن ساؤل (طالوت) کے عہد میں بھی ان کی قبائلی عصبیت نہ ختم ہو سکی۔ پھر حضرت داؤدؑ کا زمانہ آیا۔ یہود کا پہلا دارالحکومت حبرون تھا۔ طالوت کی تخت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نشینی اسی شہر میں ہوئی اور وہ یہیں سے فوجی جنگوں اور شہری مہموں کی نگرانی کرتا رہا۔ طالوت شاہی آداب کا حامل تھا۔

انسائیکلو پیڈیا میں اس شہر مقدس کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔

یہ ۳۳ صدیاں پرانا شہر ہے۔ اس نے قدرت اور انسانوں کے ہاتھوں تکلیفیں ہی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ یہ شہر کئی بار اجڑا اور بسا اور کئی بار زلزلوں نے اسے کھنڈر بنا دیا۔ بیت المقدس کا بیس مرتبہ محاصرہ کیا گیا اور اٹھارہ مرتبہ یہ اجڑ کے دوبارہ تعمیر ہوا۔

ہادریان اور بخت نصر کے عہد میں اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی تھی۔ اس مقدس شہر پر مذہب کی تبدیلی کے چھ دور گزرے ہیں۔ بیت المقدس پر وہ وقت بھی آیا کہ اسے برباد کر کے زمین کے برابر کر دیا گیا۔ اس کے گلی کوچے اور عمارتیں برباد اور شہری جلا وطن ہوئے۔

"مختلف نام"

اس شہر مقدس کو مختلف قوموں نے مختلف ناموں سے نوازا۔ یہودی اور عیسائی آج بھی بڑے فخر سے "یروشلم" کہتے ہیں۔ اس کا سب سے پرانا نام جیبوس (Jebus) ہے۔ یروشلم کا نام حضرت داؤدؑ کے عہد مبارک میں اختیار کیا گیا لیکن یہودی ربیوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے منسوب کرنے کے لیے یہ کہا کہ آپ نے اسے جریح (Jereh) کہا تھا اور "شلم" کا اضافہ "شلیم یا شالیم" نے کیا جو ۲۰۰۰ ق۔م میں یہاں کا حاکم تھا۔ مگر رینالڈ اور ایوالڈ کا کہنا ہے کہ یہ دو طبرانی الفاظ "یرو" اور "شلم" کا مرکب ہے جس کے معنی ورثہ امن Inheritrence of Peace ہے۔ ایک دوسرے یورپی مؤرخ نے اس کے معنی "اساس امن" قرار دیئے ہیں۔ اس طرح بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دو شہر جبلس اور سلم تھے جو ایک ہو گئے اور نام بھی مرکب ہو گیا۔ جو لوگ اسے دو طبرانی لفظوں کا مرکب قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک اصل لفظ نام "جروزلم" ہے۔ بعض اسے عبرانی زبان کا مرکب قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ یاقوت نے "بری شلم" بغیر تشدد کے لکھا ہے جو یہودیوں کے زمانے میں مروج تھے لیکن مسلمانوں نے ہمیشہ اسے "بیت المقدس" یا "پاک ترین مقام" کے نام سے پکارا ہے۔

قیصر ہادریان نے یہودیوں سے خالی کرانے کے بعد ۱۳۰ میں شہر کو "ایلیا کاپی تولی نا" کے نام سے پکارا ہے۔ اس کا پہلا جز "الیا" کی شکل میں عربی میں محفوظ رہا۔ عربوں کے لیے یہ بے معنی لفظ تھا لہٰذا طرح طرح کے افسانے مشہور ہو گئے۔

یاقوت لکھتا ہے۔

کعب کی سند سے روایت کی جاتی ہے کہ اس مقدس شہر کا نام "الیا" اس لیے ہوا کہ اسے ایک عورت الیا نے آباد کیا تھا۔ ایک اور جگہ لکھا ہے کہ الیا کے معنی بیت اللہ کے ہیں۔ ایک روایت میں یہ بھی نقل ہے کہ یہ اپنے بانی الیا کے نام پر ہے جو روم بن سام بن نوح کا بیٹا تھا اور دمشق، حمص اور فلسطین اس کے بھائیوں کے نام تھے۔

شعرائے کرام نے یروشلم کو کہیں کہیں "البلاط" کے نام سے بھی یاد کیا ہے جس کے معنی دربار یا شاہی محل ہے۔ اس کے علاوہ اسے "گولڈن سٹی" یعنی سنہری شہر بھی کہا جاتا ہے جو اب تک رائج ہے۔ یہ اس لیے کہ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو اس کی کرنوں سے سنہری پتھروں سے بنے مکانات جگمگا اٹھتے ہیں۔

بیت المقدس کو امن کا شہر (City of Peace) بھی کہتے ہیں لیکن جب اس کو اس نام

سے پکارا جاتا ہے تو تاریخ اس نام کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتی ہے کیونکہ اس شہر کی قدیم تاریخ میں مشکل سے بیس سال ایسے ملیں گے جن کے دوران یہاں کے باشندوں کو امن و سکون دیکھنا نصیب ہوا ہو۔ ورنہ نوعِ انسانی کی خونچکاں تاریخ یہاں اپنے آپ کو بار بار دہراتی ہے۔

ان واقعات کو اگر یکجا کیا جائے تو یہاں کی لڑائیوں کی فہرست مکمل نہیں ہو سکتی۔ مجروح ہونے والوں اور مرنے والوں کی گنتی انسان کو تھکا دیتی ہے اور یہاں کی لڑائیوں کی فہرست مرتب کرنے کے لیے عمریں درکار ہیں۔ اس کے باوجود یروشلم یا بیت المقدس اپنی جگہ موجود ہے۔ اس کی تقدیس میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔

یہ کرۂ ارض کی مختلف اقوام کے لیے آج بھی امن کا شہر ہے۔ یہودیوں نے اسے اس وقت مقدس قرار دیا جب انہوں نے "انٹی اوکس اپی فینس" کو شکست دی۔ یہ دو سو قبل مسیح کا واقعہ ہے۔ عیسائیوں کے نزدیک یہ اس لیے مقدس ہے کہ "صلیب المصلوب" اسی جگہ تھی۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی شہر میں مصلوب ہوئے۔ لیکن مسلمانوں کے دین نے روزِ اول ہی سے اسے مقدس قرار دیا ہے۔ اس کی بنیاد یبوسی بادشاہ صادق ملیک نے رکھی، جو ایک عرب تھا۔

جب حضرت یعقوبؑ عرصہ دراز جلاوطنی میں گزارنے کے بعد واپس آئے تو اس کا نام "اسرائیل" ہو گیا۔ ان کی جلاوطنی اپنے بڑے بھائی ادوم کے خوف سے تھی۔ جب وہ بھائی مطمئن ہو گئے اور واپس آئے تو بھائی ادوم نے ایثار کرتے ہوئے ادومیا کی طرف پسپائی کی۔ حضرت ایوبؑ نے بیت ایل میں خدا کو رویا میں دیکھا اور اس کی یاد میں وہاں ایک مذبح بنا دیا۔

حضرت یعقوبؑ کے بیٹے حضرت یوسفؑ جب امتدادِ زمانہ میں مصر پہنچے اور بادشاہ ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ کے پوتے اسرائیل (یعقوبؑ) کی اولاد اپنے جد امجد کی وفات سے ڈیڑھ دو سو برس بعد مصر میں منتقل ہو گئی اور اسے خوب عروج حاصل ہوا۔ لیکن حضرت یوسف کے انتقال کے بعد یہ قوم معتوب ہوئی۔ حتیٰ کہ اللہ نے رحم فرمایا اور مصر میں آمد کے چار سو سال بعد حضرت موسیٰؑ کو اس میں معبوث کیا۔ جنہوں نے اسے فرعون کے پنجہ ظلم و ستم سے نجات دلائی اور بنی اسرائیل دریائے نیل پار کر کے وادی سینا میں داخل ہو گئے۔

یہ قوم اپنے نبی کی نافرمان اور احسان فراموش ثابت ہوئی اور بتوں کی پوجا کرنے لگی۔ اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اسے ڈانٹ پلائی تو ان پر چڑھ دوڑی۔ مگر اللہ نے اپنے کلیم کی حفاظت فرمائی۔ اس کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو بیت المقدس میں داخل ہونے کا حکم دیا تو یہ قوم ان کے حکم کی تعمیل سے نافرمان اور گریزاں ہوئی اور صاف کہہ دیا۔

"تو اور تیرا رب جائے۔ ان سے لڑے۔ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔"

بنی اسرائیل کی یہ گستاخی خداوند اور موسیٰ علیہ السلام کو نا گوار گزری۔ اور انہیں یہ سزا دی کہ جب تک موجودہ نسل کے تمام بالغ مر نہیں جاتے وہ وادیٔ "تیہ" میں ہی بھٹکتی رہی۔

طبری کے مطابق یہ عرصہ چالیس سال پر محیط ہے۔ اس عرصہ میں ہلاک ہونے والے یہودیوں کی تعداد تین لاکھ سے زیادہ بتائی گئی ہے۔ بیت المقدس میں وہ دو سو سال بعد داخل ہوئے۔

تاریخ کے مطابق یشوع بن نون نے ۱۴۵۱ قبل مسیح میں بیت المقدس پر حملہ کیا۔ اس زمانہ میں "اُدونی صدق" یروشلم کا بادشاہ تھا۔ حبرون، یرموت، لکیس اور عجلون کے بادشاہ اس کے معاون و مددگار تھے اور وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سب کے سب عموری تھے۔ یشوع نے انہیں جبعون کے مقام پر شکست دی۔ پانچوں بادشاہ مارے گئے اور کنعان پر بنی اسرائیل کا قبضہ ہوگیا۔

بائبل کے مطابق یروشلم اس وقت بھی مقدس شمار ہوتا تھا۔ اسرائیل نے کامیابی کے بعد ''حبرون'' کو اپنا دارالحکومت قرار دیا اور ان کی سلطنت اردن، شام اور یمن کی سرحدوں تک جا پہنچی۔

آثارِ قدیمہ کی کھدائی بتاتی ہے کہ یشوع بن نون کی آمد سے پانچ سو سال قبل برنجی دور شروع ہو چکا تھا۔

''حضرت داؤدؑ''

حضرت داؤدؑ نے اسرائیلیوں کی متحدہ طاقت کے ساتھ جنوب کی طرف سے ''بیت المقدس'' پر حملہ کیا۔ زیریں حصہ با آسانی فتح ہوگیا مگر بالائی حصے کے مکین ڈٹے رہے اور حضرت داؤدؑ کی یوں تضحیک کی کہ لولے لنگڑے لوگوں کو فصیل پر چڑھا کر کھڑا کر دیا اور پیغام بھجوایا کہ پہلے انہیں قابو میں لائیے۔

اس پر حضرت داؤدؑ نے زبردست حملہ کیا اور آخر بالائی شہر فتح ہوگیا۔ حضرت داؤدؑ کی فوج تقریباً اسی ہزار تھی۔ شہر پر قبضہ کے بعد حضرت داؤدؑ نے یبوسیوں کو شہر بدر کر دیا۔ اس سے پورے فلسطین پر ان کی حکومت قائم ہوگئی اور ان کی عظمت میں بے حد اضافہ ہوا۔

ہمسایہ سلطنتیں خوف زدہ ہو کر متحد ہوگئیں اور حضرت داؤدؑ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا لیکن وہ یروشلم تک نہ پہنچ سکیں بلکہ اثنائے راہ میں شکست کھا کر پسپا ہوگئیں جس کے بعد حضرت داؤدؑ کی طاقت سے مرعوب ہو کر بہت سے ہمسایہ حکمرانوں نے ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔

جنگ اور صلح کے اسی دور میں حضرت داؤدؑ نے بالائی اور زیریں شہر کو ایک کر دیا اور شہر کے گرد ایک مضبوط فصیل تعمیر کرائی۔ اس کے علاوہ جبل زیتون پر شاہی محل اور وادی میں شاہی باغ تعمیر کرایا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بنی اسرائیل نے یروشلم پر قبضہ کیا۔

حضرت داؤدؑ کو اپنے بقیہ دورِ حکومت میں سکون نہ مل سکا۔ البتہ ان جنگوں کا نتیجہ ان کے حق میں مفید نکلا۔ بنی اسرائیل جو اب تک قبائلی عصبیت کا شکار تھے اور مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے وہ سب ایک قوم بن گئے اور بنی اسرائیل کی عزت و وقار میں اضافہ ہوا۔ مالِ غنیمت اور دوستی کے خواہاں حکمرانوں کے نذرانوں سے خزانہ بھر گیا۔ شہر کی دولت میں اضافہ ہوا اور لوگ خوش حال ہوگئے۔

''تابوت سکینہ''

اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کی ہڈیاں اور کپڑے بند تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے اپنے ہمراہ لائے تھے اور حضرت داؤدؑ سے قبل فلسطینی اسرائیلیوں کو شکست دے کر اسے اپنے ساتھ اشدود لے گئے تھے۔

حضرت داؤدؑ کی زبردست خواہش تھی کہ وہ اس کے لیے ایک مستقل گھر بنائیں تاکہ یہ چیزیں محفوظ رہ سکیں۔ مگر اسرائیلیات کے مطابق اللہ نے انہیں بتایا کہ اللہ کا مستقل گھر ان کے بیٹے کے عہد میں تعمیر کیا جائے گا۔ اس سے وہ بددل نہیں ہوئے بلکہ وہ اس کی تعمیر کے لیے ضروری سامان جمع کرتے رہے۔ انہوں نے لبنان سے دیودار کی لکڑی منگوائی۔ آرائش کے لیے مختلف علاقوں سے قیمتی پتھر حاصل کیے۔ الغرض وہ اپنے بیٹے کا کام آسان بنانے کے لیے متواتر مصروف رہے۔ یہاں تک کہ آخری ایام میں اپنے بیٹے سلیمانؑ کو اس گھر، معبد یا ہیکل کا وہ خاکہ بھی تفصیلاً سمجھا دیا جسے انہوں نے عالم رویا میں دیکھا تھا۔

۱۰۱۵ ق۔م میں ان کا انتقال ہوا اور حضرت سلیمانؑ

تخت نشین ہوئے۔ ان کی سلطنت ایک طرف یمن اور دوسری طرف فرات تک پھیل گئی تھی۔ چنانچہ ۱۰۱۲ ق۔م میں انہوں نے ہیکل کی تعمیر شروع کرائی۔

ہیکل اسی جگہ تعمیر ہوا جسے حضرت داؤدؑ نے منتخب کیا۔ مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہودی کبھی بھی اچھے معمار نہیں رہے۔ اس لیے حضرت سلیمانؑ نے ہیکل کی تعمیر کے لیے لبنان اور صور سے معمار منگوائے۔ ہیکل کی تعمیر سات سال تک جاری رہی اور دو لاکھ آدمی کام کرتے رہے۔ بے شمار دولت خرچ ہوئی۔ حضرت داؤدؑ وراثت میں ایک کروڑ تیس ہزار پونڈ سونا اور ۱۷۰ ہزار پونڈ چاندی چھوڑ گئے تھے۔ اس دولت کے علاوہ شہزادوں کے نذرانے اور دنیا کے زرخیز ترین خطہ کا سات سالہ ریونیو بھی اس میں خرچ ہوا۔

بائبل کی کتاب سلاطین میں دی گئی تفصیل کے مطابق ہیکل سلیمانی بلاشبہ فنِ تعمیر کا ایک عظیم شاہکار تھا۔ اس کی لمبائی ۹۰ فٹ، چوڑائی ۳۰ فٹ اور اونچائی پینتالیس فٹ تھی اور اس کے اندر پاک ترین جگہ بنائی گئی تھی جہاں خداوند کے عہد کا صندوق (تابوت سکینہ) رکھا گیا۔

تابوت سکینہ بخت نصر کے حملے کے بعد ایسا غائب ہوا کہ آج تک اس کا سراغ نہ لگایا جا سکا۔ ہیکل سلیمانی کی عمارت کوہ حوریہ پر قبتہ الصخرہ سے مغرب میں کچھ دور واقع تھی۔

کہا جاتا ہے کہ ہیکل سلیمانی اس دور کے فنِ تعمیر کا شاہکار تھا۔ اس وقت تک اس سے بہتر اور کوئی عمارت نہ تھی۔ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے رعیوں اور خادموں کے لیے بھی رہائش گاہیں بنائیں۔ اس طرح آئندہ آنے والا ہر بادشاہ اس کی بارہ دریوں اور برآمدوں میں اضافہ کرتا رہا۔ حتیٰ کہ ''تابوت سکینہ'' کا کمرہ ان مختلف ادوار کی عمارتوں میں چاروں طرف سے گھر گیا۔

''حضرت سلیمانؑ کا محل''

حضرت سلیمانؑ نے اپنے لیے بھی ایک عظیم محل تیار کرایا تھا جو ہیکل سلیمانی کے بعد دوسری عمارت تھی۔ اس کی تعمیر پر تیرہ سال کا عرصہ لگا تھا اور اس کی اہم عمارت ۱۵۰ فٹ لمبی، ۷۵ فٹ چوڑی اور ۴۵ فٹ اونچی تھی۔ اس عمارت کی تین منزلیں تھیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی شان و شوکت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ خادموں اور نجی ملازموں کی تعداد ہزاروں کے اوپر تھی۔ کھانے کی میز اور برتن سونے کے تھے۔ ان کی اس شان و شوکت نے ساری دنیا کو حیران کر دیا تھا۔

چنانچہ ''ملکہ بلقیس سبا'' بھی متاثر ہوئی اور ایک عظیم فوج کے ساتھ شاہانہ وقار سے یروشلم میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے کارواں میں سیکڑوں اونٹ تھے جو خوشبوؤں سے لدے ہوئے تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ بیت المقدس نے اس کے بعد آج تک کہیں ایسی خوشبوئیں نہیں دیکھیں۔ مزید برآں سونا اور بیش قیمت جواہرات تھے اور ایک اندازے کے مطابق ملکہ ۴۰ قنطار سونا لائی تھی۔

جوفیس لکھتا ہے کہ حضرت سلیمان نے شہر پناہ کو اور مضبوط کیا اور ہیکل کی پہاڑی کو فصیل کے اندر لے لیا۔ شہر کو پانی کی فراہمی کے لیے دور کی وادیوں سے نہریں کھودی گئی تھیں۔ چشمے اور حوض بنائے گئے تھے۔ ان میں سے کنواری کا چشمہ آج بھی دورِ سلیمانی کے فنِ تعمیر کا عظیم شاہکار ہے۔

انہوں نے دوسری عمارتیں بھی بنائیں۔ سڑکوں کو پختہ کرایا۔ چنانچہ بیت المقدس اپنے دور کا خوب صورت ترین شہر بن گیا اور عظیم تجارتی کارواں اس شہر تک آنے لگے۔

حضرت سلیمانؑ نے ایک بحری بیڑہ بنایا تھا جو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہرکولیس کے روایتی شہر اور برطانیہ تک جاتا تھا۔ کولمبس نے جب شمالی امریکا دریافت کیا تو اس کا خیال تھا کہ حضرت سلیمانؑ کی دولت کا خزانہ ویسٹ انڈیز میں ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سلیمانی بحریہ نہایت فعال تھی اور دور دور تک پہنچتی تھی۔ مختصر یہ کہ حضرت سلیمانؑ کے دور میں سلطنت اسرائیل اپنے عروج پر تھی۔

حضرت سلیمانؑ علیہ السلام کا انتقال ۹۷۵ق۔م میں ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ان کی سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ جنوبی سلطنت یہودا تھی جس میں روم اور جنوبی فلسطین شامل تھا اور اس کا صدر مقام یروشلم تھا۔

دوسری شمالی سلطنت اسرائیل جو شمالی فلسطین اور شرق اردن پر مشتمل تھی۔ اس کا دارالسلطنت سامرہ (نابلس) قرار پایا۔ جنوبی حکومت کا بادشاہ رحعام بن سلمان اور شمالی کا یربعام تھا۔ دونوں ریاستوں میں ٹھن گئی اور یہودا نے خدا کے حضور بدی کی اور گناہوں سے اس کی غیرت کو للکارا کیونکہ انہوں نے اپنے لیے ہر اونچے ٹیلے پر، ہر درخت کے نیچے، اونچے مقام، ستون اور یسیرتیں بنائیں یعنی غیراللہ کی پرستش شروع کی۔ اس ملک میں لوطی بھی تھے۔ وہ ان سب سے مکروہ کام کرتے تھے جن کو خداوند نے بنی اسرائیل کے سامنے سے نکال دیا تھا۔

پانچویں سال شاہ مصر سی ساق (سی شاک) نے یروشلم کی طرف پیش قدمی کی اور بغیر کسی مزاحمت کے شہر میں داخل ہوگیا۔ اس نے ہیکل سلیمانی اور شاہی خزانوں کو لوٹا اور عبادت گاہ کی تمام قیمتی چیزیں لے گیا۔

یہ بیت المقدس کے سترہ محاصروں میں سے پہلا اور سب سے کم نقصان دہ حملہ تھا۔ سلیمان کا بیٹا مصر کا باجگزار بن گیا۔ پھر ایسی افتاد شروع ہوئی کہ سلیمان سے ہیرودوس اعظم تک بیت المقدس کئی حملہ آوروں کا نشانہ بنا۔ بار بار اندرونی انتشار کا شکار ہوا اور اس پر اتنی مصیبتیں آئیں کہ اس کی ہیئت ہی بدل گئی۔ گہری وادیاں ملبے سے اٹ گئیں اور ان کی حالت اس قدر بگڑ گئی کہ اگر پہلے کا کوئی باشندہ اسے دیکھتا تو پہچان نہ پاتا۔

یہ دونوں ریاستیں آپس میں برابر لڑتی رہیں۔ یہی نہیں بلکہ بنی اسرائیل میں حرام کاری، عیاشی اور بدمعاشی اس قدر بڑھی کہ وہ کم زور ہو گئے اور توحید سے منحرف ہوکر کنعان کے قدیم قبائل کی طرح بت پرستی پر بھی مائل ہو گئے۔ وہ اپنے خدا یہودا کی مورتیاں بنانے اور دیوی دیوتاؤں کی طرح ان مورتیوں سے عجیب وغریب روایات منسوب کرنے لگے۔ انہوں نے توریت میں اپنی حسب منشاء ردوبدل کرلیا۔ ولی اور کاہن اپنے مفادات کے تحت توریت کی عبارتیں تک مسخ کردیتے۔

اس دور میں جو بھی ان کی اصلاح کے لیے جدوجہد کرتا بنی اسرائیل اس کا مذاق اڑاتے، اذیتیں دیتے اور اسے قتل کرنے سے بھی گریز نہ کرتے۔ پس قدرت نے انہیں سزا دی اور ذلت ورسوائی ان کا مقدر ہوکر رہ گئی۔

جب بنی اسرائیل باہم متصادم اور متحارب تھے اور خدا کے بجائے بتوں کی پرستش کرنے لگے تو ۸۹۹ ق۔م میں جبکہ یہودا کا بادشاہ یہولرام تھا تو فلسطینیوں اور عربوں کی متحدہ طاقت نے یروشلم پر حملہ کیا۔ انہوں نے ہیکل کو لوٹا اور شاہ کے گھر میں گھس کر جو کچھ ملا، لے گئے۔ یہاں تک کہ شاہ، اس کی بیویاں اور بچے سوائے سب سے چھوٹے بچے کے، سب کو قیدی بنا کر لے گئے۔

یہ حملہ محض لوٹ مار کی خاطر تھا۔ اس لیے حملہ آوروں نے شہر کو نقصان نہیں پہنچایا۔ مگر اس حملے کے

فوراً بعد شاہ اسرائیل یروشلم پر حملہ آور ہوا۔ اس نے ہیکل کے سونے چاندی کے برتنوں کو سمیٹا اور سامرہ واپس چلا گیا۔

پھر ایک عرصہ تک یہودا کی سلطنت سنبھل نہ سکی بلکہ مقامی باشندوں نے شاہ یہودا "امصیاہ" کے خلاف بغاوت کر کے اسے قتل کردیا اور یوں بیت المقدس بنی اسرائیل کے قبضے سے نکل گیا لیکن امصیاہ کا بیٹا عزیاہ یہودا کا وارث ہوا۔ وہ سولہ برس کا تھا جب تخت سلطنت پر بیٹھا۔ چونکہ وہ خدا کا طالب ہوا اس لیے خدا نے اسے کامیاب کیا اور وہ یروشلم پر اپنا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے معبد اور شکستہ فصیل کی مرمت کرائی۔ اسرائیلی فوج کو ازسرنو منظم کیا اور کھیتی باڑی پر بھی توجہ دی۔ لیکن جب وہ زور آور ہوا تو بہک گیا اور اپنے خدا کی نافرمانی کرنے لگا۔ چنانچہ ایک زلزلہ آیا جس کے جھٹکوں سے شہر کی بنیادیں ہل گئیں۔ شاہی باغ تباہ ہوگیا اور فصیل میں بھی دراڑیں پڑ گئیں۔

عزیاہ کے بعد اس کا بیٹا "یوتام" تخت نشین ہوا۔ یوتام انبیاء کی بتائی ہوئی راہ پر قائم رہا اور سولہ برس تک کامیابی سے حکومت کرتا رہا۔ اس کے مرنے کے بعد آضر بادشاہ ہوا۔ وہ انتہائی مکار اور گمراہ تھا۔ اس کے دورِ حکومت میں ۷۴۰ق۔م میں شامی فوجوں نے یروشلم پر حملہ کردیا۔ شدید جنگ ہوئی اور آخر شام کا مطیع ہو گیا۔ لیکن شامی فوجوں کے لوٹتے ہی شمالی بادشاہت نے حملہ کردیا۔ یہودا کی کمزور سلطنت مقابلہ نہ کرسکی۔ حملہ آوروں نے شہر کو لوٹا اور دو لاکھ عورتوں کو گرفتار کر کے ساتھ لے گئے۔ لیکن سامرہ پہنچتے ہی انہیں آزاد کر دیا۔ آخر بادشاہ نے ادومیوں اور فلستیوں کے مقابلہ کے لیے شاہ اشد تگلت پلنا سے مدد طلب کی۔ یہ امداد اس کے لیے خطرناک ثابت ہوئی۔ کیونکہ تگلت پلنا آیا تو سہی لیکن اس کی مدد کرنے کی بجائے ہیکل کا قیمتی سامان لوٹ کر اشوریہ لے گیا۔

اضر کے بعد اس کا بیٹا حزقیاہ پچیس برس کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ اس نے ۷۴۰ق۔م سے ۷۰۰ ق۔م تک حکومت کی۔ حزقیاہ نے قوم کو بت پرستی سے نجات دلائی اور ہیکل سلیمانی کی عظمت کو بحال کیا۔ اس کے عہد میں آشوری بادشاہ سنحرب نے یروشلم پر حملہ کیا لیکن ابھی محاصرہ جاری تھا کہ ہیضہ کی وبا پھوٹ پڑی جس سے اس کے سردار اور جنرل مرنے لگے اور وہ محاصرہ اٹھا کر چلا گیا۔

حزقیاہ کے بعد اس کا بیٹا منسی بارہ برس کی عمر میں تخت سلطنت پر بیٹھا اور یروشلم پر پچپن برس تک حکومت کی۔ اس کے عہد میں بنی اسرائیل پھر راہِ حق سے بھٹک گئے اور بت پرستی نے زور پکڑا اور بدمعاشی اور عیاشی کا غلبہ ہوا۔ جس کے نتیجے میں ۶۶۷ق۔م میں آمور کے سپہ سالاروں نے اس پر حملہ کیا تو یروشلم والے مقابلہ نہ کرسکے۔ حملہ آور منسی کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر بابل لے گئے اور چند سال قید رکھنے کے بعد اسے واپس بھیج دیا۔ پھر بادشاہ ہونے کے بعد منسی نے کچھ تعمیراتی کام کرایا اور بیت اللہ کو بتوں سے پاک کیا۔

منسی کا جانشین بائیس سالہ رمون صرف دو سال حاکم رہا۔ پھر اس کے غلاموں نے اسے قتل کردیا۔ اس کا بیٹا یوسیاہ ۶۴۳ق۔م میں بادشاہ ہوا۔ اس نے ۳۱ سال تک یروشلم پر حکومت کی۔ اس کے عہد میں ہیکل کی عظمت بحال ہوئی مگر یہ بادشاہ مصری بادشاہ نکوہ سے مقابلہ کرتا ہوا مارا گیا۔ اس کا بیٹا یہوا اس کا جانشین ہوا۔ پھر فرعون مصر نکوہ نے اسے بھی شکست دی اور تاوان میں ایک سو قنطار چاندی، ایک قنطار سونا وصول کر کے اور یہوآضر کو قید کر کے ساتھ لے گئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور اس کے بیٹے یقیم کو اپنے باجگزار کے طور پر بیت المقدس میں سلطنت یہودا کا بادشاہ بنایا۔

یہویقیم کی بادشاہت کو گیارہ سال گزرے تھے کہ ۶۰۷ ق۔م میں قاہر اور جابر بخت نصر نے حملہ کیا اور یہویقیم کو گرفتار کر کے بابل لے گیا اور اس کے بیٹے یہویاکین کے نام سے اپنے باجگزار کے طور پر یروشلم کا بادشاہ بنایا۔ مصر کے سازشی ربیوں اور کاہنوں کے کہنے پر یہویاکین نے فرعون مصر سے ساز باز کر کے بخت نصر کے خلاف بغاوت کر دی۔ جب بخت کو اس کی خبر ملی تو وہ طیش کے عالم میں بابل سے نکلا اس نے پہلے اس مصری فوج کو جو یہویاکین کی مدد کو آ رہی تھی، شکست دی پھر یروشلم کا محاصرہ کر لیا۔ اس جنگ میں بے شمار یہودی مارے گئے۔ بادشاہ گرفتار ہو کر قتل ہوا اور دس ہزار گرفتار یہودیوں کے ساتھ بابل پہنچایا گیا۔ بخت نصر نے ہیکل کے قیمتی برتنوں کو سمیٹا اور یہویاکین کے بھائی صوقیاہ سے وفاداری کا حلف لے کر اسے تخت نشین کیا اور خود بابل واپس ہو گیا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ صرف چند سال وہاں سکون رہا مگر یہودیوں نے پھر شرارتیں شروع کر دیں۔ موجودہ بادشاہ صوقیاہ، بخت نصر سے باغی ہو گیا۔ یہ تیسری بدعہدی اور بغاوت تھی۔ بخت نصر یہودیوں سے تنگ آ گیا تھا اور اب اس نے فیصلہ کیا کہ وہ یہودی قوم ہی کو ختم کر دے گا۔ چنانچہ اس نے اپنے لشکر کو یہودیوں کے قتل عام کا حکم دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یروشلم کی گلیاں خون کی ندیاں بن گئیں۔ انہوں نے خدا کے گھر کو بھی پھونک دیا اور اسے زمین کے برابر کر دیا۔ یہاں تک کہ پورا یروشلم خاک کا ڈھیر بن گیا۔ ہر طرف دھواں چھایا ہوا تھا۔

پھر بخت نصر نے یہودیوں کے تمام صحیفے نذر آتش کر دیے اور پچاس ہزار مرد و زن یہودیوں کو قیدی بنا کر واپس ہوا اور انہیں دوسرے علاقوں میں بھاگ جانے کو کہا اور انہیں مار بھگایا۔ یہ یہودیوں کی پہلی قومی تباہی اور بربادی تھی۔ اس الٹ پھیر میں ہیکل سلیمانی کا نام و نشان مٹ گیا اور توریت بھی غائب ہو گئی۔ اس بیان میں ہے کہ بابل کے زمانہ اسیری میں یہودی توریت کو یاد کر کے رویا کرتے تھے اور آج تک اس تباہی کی یاد میں "سلیمان کے روزے" رکھتے ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بابل میں یہودی غلاموں کو دریائے فرات کے کنارے آباد کیا گیا اور انہوں نے اس بستی کا نام "تل ابیب" رکھا۔ یعنی یہ اس دور کی یاد تازہ کرتی ہے۔

یہ واقعہ ۵۸۸ ق۔م میں پیش آیا تھا۔ اس کے بعد پچاس سال تک یہ شہر تباہ اور برباد پڑا رہا۔ یہودی زائر ضرور آتے۔ وہ یروشلم کے کھنڈرات پر اسرائیل کی واپسی کے لیے دعائیں مانگتے تھے۔ جو وہاں پہنچ نہ پاتے وہ فرات کے کنارے بیٹھ کر یروشلم کی یاد میں رویا کرتے تھے۔

اس دورِ غلامی میں "دانیال" اور "عزیر" نبی یہودیوں کی رہنمائی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ صہیونیت کی پہلی تحریک کا آغاز ہوا۔

صہیونیت کا لفظ صہیون سے نکلا۔ صہیون دراصل بیت المقدس کی اس پہاڑی کا نام ہے جہاں حضرت داؤدؑ نے یروشلم فتح کرنے کے بعد جشن منایا تھا۔ بنی اسرائیل اسی نسبت سے صہیون کو مقدس سمجھتے اور یروشلم کو "دختر صہیون" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ صہیونی تحریک کا مقصد یروشلم کو دوبارہ حاصل کرنا اور ہیکل سلیمانی کو از سر نو تعمیر کرنا تھا۔ ایک طویل زمانہ کے بعد ۵۳۹ ق۔م میں جب ایران کے کسریٰ خسرو نے بابل کو فتح کیا تو اس نے عام اعلان کرا دیا کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہودی اپنے وطن فلسطین واپس جا سکتے ہیں۔ یوں یہودیوں کے قافلے فلسطین جانے لگے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ سارے یہودی تو واپس نہ جا سکے پھر بھی چالیس پینتالیس ہزار افراد واپس چلے گئے۔ ان جانے والوں کو بخت نصر کے لوٹے ہوئے برتن بھی دے دیئے گئے تھے۔ اس وقت ان کا قائد تھا "شیس نصر"۔

یہودیوں کی واپسی کے چھ ماہ کے بعد ہی "ہیکل" کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ مگر معمار بے دلی سے کام کرتے تھے۔ چنانچہ یہ تعمیر بیس سال میں مکمل ہوئی۔ اس کی تعمیر کا سال ۵۱۶ق۔م بتایا جاتا ہے۔ اس وقت یہودی فقیہ عزرا نے اپنی یادداشت کی بناء پر "توریت" تالیف کی۔ اس توریت میں ردوبدل بھی کیا گیا اور کچھ باتیں بھی اپنی طرف سے شامل کی گئیں۔

ہیکل اور شہر کی تعمیر کے بعد فصیل شہر کی تعمیر کی اجازت شاہ ایران اردشیر وانی نے نشہ کے عالم میں دی اور یہ فصیل ۴۴۵ق۔م میں مکمل ہوئی۔ پھر جب ۳۳۲ق۔م میں سکندر اعظم نے ایران کے بادشاہ دارا کو شکست دی اور یروشلم کی طرف بڑھا تو چالاک یہودیوں نے سکندر کا مقابلہ کرنے کی بجائے شہر سے تیس میل باہر جا کر اس کا استقبال کیا۔ چنانچہ سکندر نے شہر کو کوئی نقصان نہ پہنچایا۔ یہاں یہ خیال بھی رکھیے کہ سکندر اعظم کا اسی شہر میں انتقال ہوا اور اس کی لاش کو سونے کے تابوت میں بند کر کے اسکندریہ پہنچایا گیا۔

سکندر اعظم کی موت پر اس کی سلطنت کے حصے بخرے ہوئے تو یروشلم مصر کے یونانی حکمرانوں کے حصے میں آیا اور اس دور میں بہت سے یہودی مصر کے دربار میں ملازم ہوئے تھے۔ یہودیوں نے بہت جلد اثر و رسوخ پیدا کر لیا۔ یوں یونانی تہذیب نے یہودیوں کی نجی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔

پھر یروشلم پر ۲۰۳ق۔م میں انطوخیوس اعظم شامی نے حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے صرف چار سال بعد سکندر اعظم کا جنرل "سکوپس" پھر یروشلم پر قابض ہو گیا۔ اس نے اپنے مفادات کے لیے شہر میں مستقل طور پر فوج کی چھاؤنی قائم کر دی۔ لیکن شامی بادشاہ نے حملہ کر کے مصریوں کو شہر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ یہودیوں نے اس وقت انطوخیوس کی مدد کی تھی لیکن یہ بادشاہ یہودیوں کا دوست ثابت نہیں ہوا بلکہ اس نے یہودیوں کے داخلی انتشار کو اور ہوا دی۔

اس کے بعد ۱۷۰ق۔م میں اس شہر کو اپی فین یونانی نے تباہ کیا۔ محلات جلا دیے۔ عبادت گاہیں لوٹ لیں اور لوگوں کو ان کے مذہب سے منحرف کرنے کی کوشش کی۔ جو قانون الٰہی کی کتاب پڑھتا اسے سخت سزا دی جاتی۔

اس زمانہ میں حکابی نام کا ایک کاہن تھا۔ اس نے اپنی تحریک چلائی۔ اس تحریک نے تقریباً اسی ہزار یہودیوں کو قتل کر ڈالا اور جشن فتح منایا۔ اس کی یاد میں آج بھی یہودی "عید ہوکہ" کے نام سے مناتے ہیں۔

پھر انطوخیوس مصری نے ۱۶۸ق۔م میں چڑھائی کر کے شہر فتح کر لیا۔ لیکن ۶۵ق۔م میں اندرونی خلفشار پیدا ہوا اور رومیوں نے مداخلت کی اور ارسٹوبوس روم کا باجگوار ہو گیا۔ مگر اس نے خراج ادا نہ کیا اس لیے رومی جنرل پومپائی نے ۶۳ق۔م میں شہر کا محاصرہ کر کے ہیکل تباہ کر دیا۔ مزید یہ کہ بارہ ہزار قیدی اس کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ پھر آئندہ تیئیس سال تک شہر قدرے محفوظ رہا۔ پھر ۴۰ق۔م میں جولیس سیزر نے پارتھیں فوجوں کی مدد سے یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ اس کی وفات پر اس کا بیٹا ہیرود اعظم یہاں کا بادشاہ بنا۔ اس کے بعد یروشلم کی تاریخ کا وہ دور شروع ہوا جو عظیم دور بھی

تھا اور خوفناک بھی۔ ہیرود اعظم کے دور میں بیت المقدس نے دوبارہ سلیمانؑ کے عہد کی عظمت حاصل کر لی۔ اس نے شہر کے گرد تیسری مرتبہ فصیل بنائی اور ہیکل سلیمانی کو از سر نو عظمت بخشی۔ ہیرود نے شہر کی وادیوں میں تھیٹر، سیر گاہیں اور سرکس کے لیے ہال تعمیر کرائے۔

ہیرود کے توسیع شدہ ہیکل کا رقبہ ایک ہزار مربع فٹ تھا مگر شان و شوکت میں سلیمان کے ہیکل سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اس نے ہیکل رعایا کے دل جیتنے کے لیے بنوایا تھا۔ لیکن وہ رعایا کے دل نہ جیت سکا۔ رعیت اس سے نفرت کرتی تھی اور یہودی ربیوں نے کبھی ہیکل کی تعمیر کے سلسلے میں ہیرود کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا۔

ہیرود نے بھی سلیمانؑ کی طرح شہر میں فن تعمیر کے کئی شاہکار قائم کیے۔ ان دنوں (سکندر اور ہیرود) شاہوں پر بیرونی اثرات تھے اور دونوں تعمیر شدہ عمارتیں غیر ملکی فن تعمیر کا نمونہ تھیں۔ حضرت سلیمانؑ نے اس سلسلے میں مصر سے اثر لیا تھا تو ہیرود نے یونان اور روما کی نقل اتاری تھی۔ دونوں نے شہر کے گرد فصیل بنائی اور کوہ حوریہ کو ہیکل سے زینت بخشی۔

حضرت سلیمانؑ نے معبد یہودا سے عقیدت اور اس کی رضا کے لیے تعمیر کیا تھا۔

حضرت سلیمانؑ کے عہد میں شہر مذہبی تھا مگر اس کے بعد ایسے لوگ سامنے آئے جن کی شخصیت عوام کی گمراہی کا سبب بنی۔ انہی لوگوں میں "یشوع" تھا جس نے "ابی اعظم" ہونے کا دعویٰ کیا اور اپنا نام "جاسو" رکھا تھا۔ اس نے ہیکل کے باہر سرکس، اسٹیڈیم اور تھیٹر وغیرہ قائم کیے۔ ہیرود کی سرپرستی میں ان تفریحات کو فروغ حاصل ہوا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ہیرود نے اپنی بھتیجی سے دوسری

غزل

موج لبِ دریا کو چومتی ہے
جب کوئی ناؤ پانی میں ڈوبتی ہے
سکتے میں رہ گیا دلِ ناشاد
مفلسی کیسا ناچتی جھومتی ہے
کیا دل میں بس گیا ہے تیرے
کیسی آنکھوں سے روشنی پھوٹتی ہے
گلِ رنگین کی خواہش میں بے تاب
تتلی رگِ گل کے کانٹے چومتی ہے
بیٹھے بیٹھے تمتما اٹھتا ہے چہرہ
جس طرح کھیل کھیل میں روٹھتی ہے
تلخیٔ ایام سہتے ہوئے زندگی
جہاں رنگ و بو میں گھومتی ہے
خلاف رخ دیکھنے دے عکسِ جمیل
نگاہ پرنم کار فرما ڈھونڈتی ہے
بادِ طوفاں کی بدولت..... دیکھ
خاکِ آشفتہ عرش کو چھوتی ہے
جب حسنِ یار بیان کرتا ہے شاہد
کوئی نیلی پیلی صورت گھومتی ہے

(سید عبداللہ شاہد۔ حیدرآباد)

شادی کی تو حضرت یحییٰ علیہ السلام نے اسے خلافِ شرع بتایا اور احتجاج کیا۔ ہیرود نے غصے میں آ کر حضرت کا سر کاٹ کر بیوی کو نذر کیا۔ ہیرود کے وقت میں برائیاں عروج پر تھیں۔ چنانچہ اس کی موت کے ساتھ ہی یہ سلطنت تین حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ مگر یہ تینوں ریاستیں رومیوں کی باجگزار رہیں۔

"مسیح ناصری"

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت مسیحؑ ہیرود اعظم کے عہد میں پیدا ہوئے۔ ہیرود یہودی نہ تھا بلکہ اہل روم کا باجگزار تھا۔ ہیرود دراصل ادومی تھا جو حضرت یعقوبؑ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے بڑے بھائی لیمو کی اولاد تھے۔ یہودی ان سے ناراض تھے مگر انہوں نے پہلے تو کاہن سردار کی لڑکی سے شادی کی پھر بے شمار دولت خرچ کر کے ہیکل کی ازسرنو تعمیر و تزئین کی۔ یہ شخص بڑا ظالم اور سفاک تھا۔ جب اسے ناصرہ میں حضرت عیسیٰؑ کے پیدا ہونے کی خبر ملی تو اس نے ان تمام لڑکوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جن کی عمر دو سال سے کم تھی۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ مرنے سے کچھ وقت پہلے اسے خیال ہوا کہ لوگ اس کی موت کی خبر سن کر خوش ہوں گے تو اس نے فوراً حکم جاری کیا کہ شہر کے تمام سرداروں اور معززین کو بلا کر ایک مکان میں قید کر دیا جائے اور اس کی موت کے بعد ان سب کو قتل کر دیا جائے۔ تاکہ اس کی موت پر لوگ خوش ہونے کی بجائے سرداروں اور معززین شہر کا سوگ منائیں۔

یہ شخص حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے کچھ دنوں بعد مر گیا تھا اور اس کی سلطنت اس کے فرزندوں میں تقسیم کر دی گئی تھی۔ یہودیہ ملک شام کا ایک صوبہ ٹھہرایا گیا اور ''ارخلاؤس'' باپ کی جگہ یہودیہ کا حکمران بنا۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ اس وقت شہر میں دو مذہبی گروہ ''فرلسی'' اور ''فقیہ'' تھے۔ ''فرلسی'' قدیم یہودیت کی نمائندگی کرتے تھے اور ''فقیہ'' لبرل تھے مگر یہ دونوں گروہ اپنے اپنے عقائد میں شدت پسند تھے۔ ان دو کے علاوہ ایک گروہ ایسا بھی تھا جس میں مذہب کا فقدان (لامذہب) تھا۔ وہ انسانی جذبات کو اہمیت دیتے تھے اور عیش و عشرت کو مقصد زندگی کہتے تھے۔ یہ بیت المقدس کے تھیٹروں اور کلبوں کی سرپرستی کرتے تھے۔ پہلے دو طبقوں میں نیک اور سادہ لوگ شامل تھے جبکہ تیسرے طبقہ کی سرپرستی بادشاہ اور اس کے درباری کرتے تھے۔

اس طبقاتی تقسیم کی وجہ سے شہر میں مختلف زبانیں رائج تھیں۔

۱۔ عبرانی۔ یہ زبان صرف ربی اور کاہن، ہیکل کی عبادت کے دوران استعمال کرتے تھے۔

۲۔ آرامی۔ یہ عام فلسطینیوں کی زبان تھی۔ حضرت عیسیٰ اور ان کے حواری آرامی زبان بولتے تھے۔

۳۔ یونانی۔ یہ سادہ زبان شاہی دربار اور کیمپ میں رائج تھی۔

ربی اور کاہن دوسروں کو اپنے سے کمتر سمجھتے تھے اور ان سے نفرت کرتے تھے۔ ان کے خیال میں جو شخص عبرانی نہیں بول اور سمجھ سکتا وہ ''بے روح'' تھا۔

تاریخ کے مطابق حضرت عیسیٰؑ بارہ سال کی عمر میں بیت المقدس تشریف لائے اور انہوں نے لوگوں کے سامنے خود کو اللہ کا فرستادہ یعنی نبی ہونے کا دعویٰ کیا۔ لوگوں نے ان کے دعوے کو جھٹلایا۔ اس پر حضرت عیسیٰؑ نے ہیکل کی طرف انگلی اٹھائی اور تباہی کی خبر دیتے ہوئے فرمایا۔

''اس کی ایک اینٹ بھی اپنی جگہ نہیں رہے گی۔''

اس کے بعد وہ ناصرہ لوٹ گئے۔ پھر ۲۹ء میں انہوں نے پانچ مرتبہ وہاں کا دورہ کیا اور ہر مرتبہ انہوں نے یہودیوں کو دعوت حق دی لیکن انہوں نے حق کو تسلیم کرنے کی بجائے انہیں ستانا شروع کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے رومیوں کے ساتھ مل کر حضرت عیسیٰؑ کو سولی پر چڑھانے کی سازش کی۔ اس زمانے میں بیت المقدس کا حکمران پنطس پلاطس تھا۔ اس نے حضرت عیسیٰؑ پر الزام لگایا کہ وہ قیصر روم کے خلاف بغاوت پھیلا کر خود بادشاہ بننا چاہتے ہیں۔

حتیٰ کہ انجیل کے مطابق پنطس نے یہودی کاہنوں کے پرزور اصرار پر حضرت عیسیٰؑ کو صلیب دی جائے، انہیں جواب دیا۔

''میں اس راست باز انسان کے خون سے بری ہوں۔''

مگر اس کے باوجود یہود کے مطالبے ماننے پر مجبور ہو گیا اور حضرت عیسیٰؑ کو ۱۶ اپریل ۳۰ء کو صلیب پر چڑھا کر ہلاک کر دیا۔ ہمارے عقیدے کے مطابق قرآن پاک نے حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب یا قتل کیے جانے کی تردید کی ہے اور کہا ہے۔

''نہ انہیں قتل کیا گیا نہ مصلوب، بلکہ وہ شبہ میں ڈال دیے گئے اور انہیں اللہ نے اپنی طرف اٹھا لیا۔''

❀ ❀ ❀

یروشلم اور دوسری مسلم ریاستیں اور حکومتیں

دنیا کے نقشے اور تاریخ عالم پر اگر نظر ڈالی جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ بیسویں صدی عیسوی میں اسلامی سلطنتوں کی تعداد ۲۵ بنتی ہے۔ اس لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جس دور سے ہمارا ناول تعلق رکھتا ہے اس دور کی اسلامی سلطنتوں کے نام اور اس کے مختصر احوال سے آگاہی حاصل کی جائے۔

بیسویں صدی عیسوی کی اسلامی سلطنتوں کے نام اس طرح ہیں۔

۱۔ البانیہ، ۲۔ ترکی، ۳۔ مصر، ۴۔ سوڈان، ۵۔ لیبیا، ۶۔ تیونس، ۷۔ الجیریا، ۸۔ مراکش، ۹۔ نائیجیریا، ۱۰۔ نبوتی، ۱۱۔ صومالیہ، ۱۲۔ تنزانیہ، ۱۳۔ چاڈ، ۱۴۔ ماریٹانیا، ۱۵۔ سعودی عربیہ، ۱۶۔ چھ عرب ریاستیں، اومان، کویت، یمن، قطر، بحرین، متحدہ عرب، ۱۷۔ فلسطین، ۱۸۔ اردن، ۱۹۔ لبنان، ۲۰۔ شام، ۲۱۔ عراق، ۲۲۔ ایران، ۲۳۔ وسط ایشیا کی اسلامی جمہوری ریاستیں، ۲۴۔ افغانستان، ۲۵۔ ملائیشیا۔

مختصر احوال

۱۔ البانیہ

پورے براعظم یورپ میں البانیہ واحد اسلامی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ریاست ہے۔ اس کا رقبہ گیارہ ہزار مربع میل سے زیادہ اور اس کی آبادی تقریباً ۲۱ لاکھ ہے۔ جس میں ۷۰ فی صد مسلمان ہیں۔ اس ریاست کا پایۂ تخت ''ترانہ'' اور سرکاری زبان البانوی ہے۔ اس کی زرعی پیداوار گندم، زیتون، مکئی اور تمباکو ہیں۔ معدنیات میں تیل، خام کروم اور لوہے کی دھاتیں قابل ذکر ہیں، یہاں کی مشہور صنعتیں تیل صاف کرنے، شکر تیار کرنے اور پارچہ بافی پر مشتمل ہیں۔

البانیہ پہلے ترکی کے ماتحت تھا مگر ۱۹۱۲ء میں ترکوں نے اسے معاہدہ کے تحت ایک آزاد ریاست کا درجہ دے دیا۔ ۱۹۲۰ء میں اس ریاست نے جمہوری نظام اختیار کیا۔ پھر ۱۹۲۸ء میں اس کے حکمران احمد زوگو نے زوگ اول کے لقب سے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کیا۔ ۱۹۲۹ء میں مسولینی نے اس ملک پر قبضہ کرلیا تو زوگ اول بھاگ گیا۔ ۱۹۴۳ء میں اٹلی نے اتحادی فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ ۱۹۴۴ء میں انور ہوک کی نگرانی میں البانیہ میں نئی حکومت قائم ہوگئی۔ ۱۹۴۶ء میں البانیہ کا نیا دستور نافذ ہوا۔ ۱۹۵۵ء میں البانیہ اقوام متحدہ کا ممبر بن گیا۔ پھر ۱۹۷۰ء میں البانیہ نے چین کے ساتھ معاہدہ کرلیا۔ ایک سال بعد یوگوسلاویہ اور یونان کے ساتھ تعلقات قائم کرلیے۔ اس وقت البانیہ اقوام متحدہ اور اسلامی سیکرٹریٹ کا ممبر ہے۔

۲۔ ترکی

ریاست کا کل رقبہ تین لاکھ ایک ہزار تین سو بیالس مربع میل ہے اور آبادی ایک کروڑ بیس لاکھ آٹھ ہزار سے کچھ زیادہ ہے جن میں مسلمان ۹۹ فی صد ہیں۔ یہودی اور عیسائی بہت قلیل اقلیت میں ہیں۔ مشہور زرعی پیداوار گندم، جوار، مکئی، زیتون اور کپاس ہے۔ معدنیات میں کرومیم، تانبہ، جست، لوہا اور کوئلہ ہیں۔

یہاں کی صنعتوں میں سگریٹ سازی، پارچہ بافی، کاغذ سازی، شیشہ سازی وغیرہ ہیں۔ بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں بلقانی ریاستوں نے متحد ہوکر ترکی کے یورپی مقبوضات ہتھیا لیے تھے۔ اٹلی نے طرابلس پر قبضہ کرلیا۔ آسٹریا نے بوسنیا اور ہرزیگوینا کے صوبے اپنی سلطنت میں شامل کرلیے۔ خود ترکی کی سلطنت کے اندر یورپی طاقتوں کو ایسی مراعات حاصل تھیں جن کے باعث ترکی کی حاکمیت اعلیٰ پر کاری ضرب پڑتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ترکی چند روز کا مہمان ہے۔ ۱۹۱۴ء میں جب پہلی عالمگیر جنگ شروع ہوئی تو ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ چار سال ترکوں نے داد شجاعت دیتے ہوئے ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء میں ہتھیار ڈال دیے۔ معاہدہ ہوا کہ ترکی کو یورپی اور ایشیائی مقبوضات سے دستبردار ہونا پڑا۔ ترکی کے پاس صرف قسطنطنیہ اور اناطولیہ کا اندرونی حصہ رہ گئے مگر ترکوں نے مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت میں جنگ جاری رکھی۔ ۱۹۲۳ء میں معاہدہ لوزان ہوا جس کی رو سے ایڈریانوپل، تھریس اور سمرنا کے علاقے ترکوں نے واپس لے لیے۔ ۱۹۲۴ء میں مصطفیٰ کمال کی خلافت کو ختم کردیا گیا۔ ترکی نے جدید قسم کی جمہوری حکومت قائم کی اور مصطفیٰ کمال اس کے پہلے صدر ہوئے۔ حاکم اعلیٰ بننے کے بعد مصطفیٰ کمال نے ترکی کی معیشت اور معاشرت، تہذیب و ثقافت اور قوانین کو مغرب کے ڈھانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی اور وہ اپنی کوششوں میں بڑی حد تک کامیاب رہا۔

۱۹۳۸ء میں مصطفیٰ کمال کا انتقال ہوگیا۔ اس کے انتقال کے بعد ان کے جانشین ان کی پالیسی پر عمل پیرا رہے۔ دوسری عالمگیر جنگ میں ترکی

۱۹۴۵ء تک غیر جانب دار رہا۔ پھر اتحادیوں کی طرف سے محوری طاقتوں کے خلاف صف آراء ہوا۔ اس جنگ کے اختتام پر ترکی اقوام متحدہ کا ممبر بن گیا۔ آج کل ترکی ایک طاقت ور ملک ہے اور اس کی مالی ساکھ اچھی ہے۔

۳۔ مصر

بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں مصر کی سیاسی فضا کافی مکدر تھی۔ اس ملک پر برطانوی گرفت روز بروز سخت ہوتی جارہی تھی۔ مگر غیر ملکی راج کے خلاف قومی جذبہ زوروں پر تھا۔ ان حالات میں ۱۹۰۵ء میں مصطفیٰ کمال پاشا نے مصر کو برطانیہ کی غلامی سے چھٹکارا دلانے کی خاطر ایک نئی قومی تحریک شروع کی جس کا مقصد حصول آزادی کے علاوہ خلافت عثمانیہ سے تعلقات مضبوط کرنا تھا۔ پس اس تحریک نے ملک بھر میں ہر دلعزیزی حاصل کرلی۔

بدقسمتی سے ۱۳ جون ۱۹۰۶ء کو چند مصری کسانوں اور برطانوی سپاہیوں کے درمیان جھڑپ ہوگئی۔ انگریز ایجنٹ لارڈ کرومر یہ خبر سن کر آگ بگولہ ہوگیا۔ اس نے بہت سے کسانوں کو گرفتار کرکے انہیں عبرت ناک سزائیں دیں اور تحریک کو عارضی طور پر دبا دیا۔

اس کے بعد ۱۹۱۳ء میں عالمگیر جنگ شروع ہوگئی۔ ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ دوسری طرف انگریزوں نے مصر پر ترکی کی سیادت کو ختم کرکے ملک کو اپنی حفاظت میں لے لیا اور عباس حلمی کی بجائے اس کے چچا حسین کامل کو سلطان بنا دیا۔ ۱۹۱۷ء میں حسین کامل مر گیا۔ اس لیے اسمٰعیل کے چھوٹے بیٹے فواد کو مصر کا سلطان بنا دیا گیا۔

پھر جب ۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہوئی تو سعد زغلول پاشا کی رہنمائی میں وفد پارٹی میدان میں آگئی۔ اس پارٹی نے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔ عوام نے اس کے حق میں زبردست مظاہرے کیے اور پورے ملک میں سیاسی ہیجان پیدا ہوگیا۔ انگریزوں نے حالات پر قابو پانے کے لیے سعد زغلول اور اُن کے تین ساتھیوں کو گرفتار کرکے مالٹا میں نظر بند کردیا۔ اس پر مصری عوام مشتعل ہوگئے۔ انہوں نے ہڑتالیں اور مظاہرے شروع کردیئے۔ انگریزوں نے مصریوں پر بے پناہ مظالم کیے مگر انقلاب کی آگ نہ بجھ سکی۔ تب برطانیہ نے ایک کمیشن مقرر کیا۔ اس کمیشن نے حکومت کو مشورہ دیا کہ وہ مصر سے جلد کوئی معاہدہ کرکے اس جھگڑے کو ختم کرے۔

اس دوران یعنی ۱۹۲۲ء میں مسٹر چرچل وزیر نوآبادیات ہوئے تو اُن کی سفارش پر مصر کی آزادی تسلیم کرلی گئی لیکن خارجی معاملات اور سوڈان کے بارے میں تحفظات رکھے گئے۔ وفد پارٹی نے ان شرائط کو ماننے سے انکار کردیا اور فسادات پھوٹ پڑے۔ سعد زغلول پاشا کو گرفتار کرلیا گیا اور فوج نے نہایت تشدد سے کام لیا اور شورش کو ایک حد تک دبا دیا اور پارلیمانی حکومت قائم کردی گئی۔ یہ جھگڑے ۱۹۲۷ء تک چلتے رہے۔ جب زغلول پاشا کا انتقال ہوا اور نحاس پاشا نے وفد پارٹی کی قیادت سنبھالی۔

۱۹۳۶ء میں شاہ فواد کا انتقال ہوا اور نحاس پاشا کی کوشش سے مصر کا برطانیہ سے نیا معاہدہ ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمی جنگ شروع ہوگئی۔

(باقی آئندہ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

واپسی

اسرار احمد

فکشن نے ادب کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ خواہ امریکہ کے رابرٹ ڈنکن ہوں یا اوہنری اگاتھا کرسٹی ہوں یا پھر مشرق کا سنگھار محترم ابن صفی' انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں پڑھنے والوں کا ایک نیا اور بڑا حلقہ پیدا کیا ہے۔ ان کی تحریروں کا خاصہ ہے کہ وہ آخری چند سطروں میں کہانی بیان کرتے ہیں اور پڑھنے والوں کو چونکا دیتے ہیں۔

زیر نظر کہانی امریکہ کے معروف لکھاری رابرٹ ڈنکن کی ہے جو مختصر کہانیاں لکھنے میں بدطولی رکھتے ہیں۔

ایک مہم جو کا احوال وہ سی گل کے انڈے تلاشنے خطرناک پہاڑی پر گیا تھا

یہ بات نہیں کہ میں دوسروں کے مقابلے میں کوئی لالچی آدمی ہوں لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ خرچ کیے بغیر اگر کوئی چیز ہاتھ لگ جائے تو میں اس سے چوکتا بھی نہیں۔ خصوصاً! کوئی ایسی شے جسے میں خود اپنے ہاتھوں سے توڑ سکوں۔ مثلاً رس بھریاں یا سیگل کے انڈے۔ ان کے لیے تو میں نہ اپنے کپڑوں کے پھٹنے کی پروا کرتا تھا' نہ ان کی گندگی کی۔ میرے ہاتھ پیر کانٹوں سے الجھ الجھ کر زخمی ہوجاتے تھے مگر مجھے ان کے حصول میں جو مزہ ملتا تھا وہ ان معمولی نقصانات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوتا تھا۔ بچپن سے مجھے ان کا بہت شوق تھا بڑے ہوکر بھی یہ شوق رہا بس ذرا ادھر توجہ کم ہوگئی تھی۔ یہ کیفیت جو میں نے بیان کی کوئی انوکھی نہیں کہی جاسکتی ہمارے مشاغل وغیرہ کے پس پشت ان کا وجود ہوتا ضرور ہے۔

اب یہ دوسری بات ہے کہ ایک بات جو مجھے منفعت بخش لگتی تھی دوسرے کو اس میں منافع کم اور نقصان زیادہ دکھائی دیتا تھا۔ مثلاً مجھے اپنی بیوی کی بات یاد آتی ہے۔ اس نے کئی بار مجھے سمجھایا تھا کہ کپڑے پھاڑنے اور کانٹوں سے زخمی ہونے کے بعد یہ جتنے جنگلی پھل میں لاتا ہوں یہ اس بھاؤ مہنگے ہی نہیں بلکہ بہت مہنگے کہے جاسکتے ہیں۔

موسم بہار کے دن آئے تو میرے اندر کا بچہ ہمکا میں نے ساحل کے اس پار دلچسپی کے انداز میں ان پتھریلی پہاڑیوں اور چٹانوں کے پھیلے ہوئے سلسلے کو دیکھا جہاں آبی چڑیاں گھونسلے بنانے والی تھیں۔ مجھے دراصل ان کے انڈوں کا لالچ تھا۔ میں ویسے بھی سیگلوں کے انڈوں کا بڑا شوقین تھا۔ مجھے یہ بے حد مزے دار لگتے تھے۔ مرغی کے انڈے صرف مرغی کے انڈے ہوتے ہیں جب کہ ان انڈوں کی بات ہی اور تھی۔

پھر میں نے ایک دن اپنی بیوی کی دعائیں لیں۔ پیروں میں ربر کے جوتے پہنے اور ہاتھ میں ٹوکری لے کر ادھر چل پڑا جسے میری بیوی نے پڑوسن سے حاصل کیا تھا۔

یہاں کے سارے راستے میرے دیکھے بھالے تھے۔ میں اب یہاں کی ابھری ہوئی سطح کو تیزی سے عبور کر رہا تھا۔ سطح خشک اور محفوظ

تھی۔ ویسے میں ذرا نروس ہو رہا تھا۔ اوپر سیگلوں کے غول آسمان میں خلاؤں کو کاٹتے ہوئے چکرا رہے تھے۔ کبھی وہ پیروں کو ساکت کر لیتے تھے اور جیسے ایک ہی جگہ منجمد سے ہوجاتے۔ میں نے اپنی نگاہیں چٹانوں پر مرکوز کر رکھی تھیں اور ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔ چٹان کا اوپری حصہ راستے کے مقابلے میں ہموار اور پھیلا ہوا تھا۔ میں ادھر نگاہیں دوڑائے جا رہا تھا اور ایسی جگہ کی تلاش میں تھا جہاں سے انڈوں کے ملنے کے امکانات تھے۔ مجھے خاصی مایوسی ہوئی کیوں کہ یہاں سے میں صرف تین انڈے حاصل کر سکا۔ حالانکہ مجھے کم از کم تین درجن انڈوں کی توقع تھی۔ بلاشبہ وہاں ان چڑیوں کے گھونسلے موجود تھے لیکن وہ تمام کے تمام خالی تھے۔ اب صورت حال یہ تھی کہ آتے وقت میں نے بیوی سے کہا کہ لنچ کے لیے مناسب تعداد میں انڈے ضرور لادوں گا۔ گھر میں چند مہمان متوقع تھے اور میرے پاس صرف تین انڈے تھے۔ میں ان تین انڈوں کے ساتھ واپس ہونے کے لیے تیار نہ تھا۔ جب میں چٹان پر سے اترنے لگا تو راستے میں نوٹ کیا کہ چٹانوں میں سے جو بلند ترین چٹان ہے اس کی ایک کگر کے آس پاس مرغابیوں اور سیگلوں کے بڑے جھنڈ منڈلا رہے ہیں۔ یہ چٹانی چوٹی اس جگہ سے کوئی سو فٹ اوپر تھی مجھے یاد آیا کہ میرا ایک دوست اکثر سیگلوں کے انڈے لاکر بازار میں اچھے مہنگے بیچتا تھا۔ مجھے گمان ہوا کہ وہ ضرور اسی کگر کے گھونسلوں سے انہیں نکالتا ہوگا۔ ذرا غور کریں کہ وہ ایک درجن انڈوں کے ساٹھ پنس وصول کرتا تھا۔ مفت میں اتنا بڑا منافع..... تھا نا؟ میں نے فیصلہ کیا کہ میں بھی اوپر جاؤں۔ میں نے باسکٹ کو دانتوں میں دبایا اور اوپر چڑھنے لگا۔ دس منٹ بعد ہی میں چوٹی پر تھا اور میری باسکٹ میں انڈے ہی انڈے تھے۔ وہاں رک کر میں نے ایک سگریٹ جلائی اور بلندی سے منظر کا جائزہ لیا جو بڑا ہی دلنشیں تھا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی کہ مجھے کافی انڈے مل گئے جو ہفتوں تک چل سکتے تھے۔ میں نے سوچنا شروع کیا میری بیوی اتنے سارے انڈے دیکھ کر کس قدر خوش ہوگی۔ میں نے رقم کی شکل میں اپنی محنت کا حساب لگایا تو اندازہ ہوا کہ تقریباً میں نے دو پونڈ سے زائد کے انڈے حاصل کر لیے تھے۔ دو پونڈ کی رقم کم نہیں ہوتی اور وہ بھی مفت میں۔

بالآخر میں نے اپنی باسکٹ اٹھائی اور اترنے کے لیے راستے کا جائزہ لیا۔ مجھے خاصی پریشانی محسوس ہوئی۔ خدا جانے کس طرح اس جگہ تک چڑھ آیا تھا۔ میری سمجھ میں نہ آسکا کہ یہ کام میں نے کیسے کیا۔ میں اس وقت ایک کھڑی چٹان کی ایک ایسی کگر پر کھڑا تھا جو صرف چار فٹ چوڑی تھی۔ میرے عقب میں چٹان کا ایک عمودی حصہ آسمان تک کھڑا ہوا تھا۔ جس پر چڑھنے کا سوال ہی نہ تھا۔ میں جہاں کھڑا تھا اس کے دونوں جانب گہری کھائی تھی۔ نیچے چٹانی پتھر اور پانی تھا۔ میرے سامنے یہ کگر تنگ ہوتی چلی گئی تھی اور پھر ذرا سا آگے جا کر یہ صرف ایک فٹ چوڑی رہ گئی تھی۔ بالکل کسی تختے کی طرح اس کا وجود تھا۔ البتہ اس کے دونوں جانب بدستور کھائی تھی اور بھیانک گہرائی میں گرنے والے کے لیے کوئی روک بھی نہ تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دفعتاً میرا دل بیٹھنے لگا جب میں نے دیکھ لیا کہ میں کیا کر چکا ہوں تو پھر خطرے نے پوری طرح جکڑ لیا۔ ہوا یوں تھا کہ اوپر آتے وقت میں اپنی دھن میں صرف ایک فٹ چوڑی پٹی یا گگر کو مزے سے عبور کر کے آ گیا تھا۔ اپنی دھن اور انڈوں کی بازیابی کے چکر میں، میں نے شاید اس خطرے پر کوئی توجہ ہی نہیں دی تھی اور اپنا توازن برقرار رکھتے ہوئے میں نے یہ پٹی پار کر لی تھی لیکن اب معاملہ مختلف تھا۔ میرے اعصاب جواب دے گئے تھے میں تو گھبراہٹ میں اس جگہ کھڑا بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ جہاں گگر خاصی چوڑی تھی۔ پھر میں نے چیونٹی کی رفتار سے گگر کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ ادھر جدھر وہ سمٹتی ہوئی تنگ ہو رہی تھی۔ اس کے دونوں جانب کھائی تھی۔ پوری پٹی صرف فٹ بھر چوڑی تھی جب کہ مجھے کم از کم پانچ گز تک اس پر چلنا تھا تب کہیں میں خطرے سے باہر ہوتا۔

پہلے میں نے دھن میں غرق ہونے کی وجہ سے اسے پار کر لیا مگر اب مجھے پتا تھا کہ اس کو دوسری بار عبور کرنا ممکن نہ ہوگا۔ لیکن واپسی کے لیے ضروری تھا کہ میں اسے عبور کروں کوئی اور متبادل راستہ بھی نہ تھا۔ یہی صورت تھی کہ میں کسی طرح اعصاب مضبوط کر لوں۔ میں نے ایک اور سگریٹ جلایا۔ میرے پاس ایک طریقہ تھا کہ ایک بار قدم جما کر اپنی نگاہوں کو سامنے جما دوں اور پھر برق رفتاری سے دوڑتے ہوئے اس پانچ گز کے فاصلے کو پار کر جاؤں۔ میں نے سگریٹ کے چند کش لگا کر اسے پھینک دیا پھر میں نے گگر پر پیر جمایا۔ سیدھ کا تعین کیا۔ اپنی نگاہیں سامنے ایک نکتے پر مرکوز کیں اور دوڑ لگا دی۔ صرف دو سیکنڈ کی بات تھی میں یہاں سے نکل سکتا تھا۔ یکا یک ایک سیگل میرے بالکل سر کے پاس سے پرواز کرتی ہوئی گزری اور میرا توازن لمحہ بھر کے لیے بگڑ گیا۔

بعد میں، میں نے اپنے آپ کو سمندر کے کنارے ساحل پر بیٹھے ہوئے پایا۔ مجھے پتا نہ تھا کہ میں یہاں کب سے پڑا تھا۔ شاید مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ یا پھر سو گیا تھا۔ پھر شاید لہروں نے مجھے جگایا تھا۔ میں نے اپنی باسکٹ اٹھائی پھر اپنے کاٹج کو جانے والے راستے پر چل دیا۔ میرے ذہن میں اپنی بیوی کا خیال تھا۔ میں نے تصور میں اسے کھانے کی میز پر اپنا انتظار کرتے دیکھا جب کہ میرے مہمان مسلسل باتیں کیے جا رہے تھے۔

میں نے گھر کا دروازہ کھولنے سے قبل باسکٹ کو اپنی پشت پر چھپا لیا۔ کمرہ بالکل خالی تھا اور میز پر کھانا بھی نہیں لگا ہوا تھا۔ میں اوپر کی منزل پر چلا گیا۔ باسکٹ میرے ہاتھ میں بدستور دبی تھی۔ میں نے وہاں اوپری کمرے میں اپنی بیوی کو بستر پر پڑے پایا۔ وہ رو رہی تھی اور سسکیاں بھر رہی تھی۔ میں نے اس سے دریافت بھی کیا کہ ہوا کیا ہے لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا اور منہ چھپائے پڑی رہی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے چھوا۔ اس کی پیشانی پر جب میں نے ہاتھ رکھا تو وہ ایک بار گی چیخ اٹھی۔ اس نے تیزی سے بستر چھوڑ دیا اور پھر وہ دروازے سے نکل کر باہر سیڑھیوں کی سمت بھاگ اٹھی۔ میں چکرایا ہوا سا اس کے پیچھے چل پڑا۔ نیچے پتا چلا کہ وہ گھر سے ہی باہر چلی گئی۔ رات کا وقت تھا۔ لہٰذا میں نے اسے نہیں ڈھونڈا اور گھر میں پلٹ

آیا جو کہ اب بالکل خالی تھا۔ پھر اپنے دارالمطالعہ میں جا کر لیٹ گیا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ چکر کیا ہے۔ میں اچھا خاصا پریشان بھی تھا اور متعجب بھی۔

میں وہاں کتنی دیر سویا رہا اس کا مجھے پتا نہ تھا۔ ویسے لگتا یہی تھا جیسے میں ایک نہیں بلکہ کئی راتیں سوتا رہا ہوں۔ تاہم جب میں جاگا تو دنیا کا ماحول تقریباً وہی تھا۔ کاٹج سے لگ کر ایک جھرنا بہتا تھا۔ میں نے اس کی آواز سنی۔ میرا دارالمطالعہ سٹنگ روم سے ملحق تھا۔ دروازے کے ادھر سے مجھے وہاں متعدد آوازیں سنائی دے رہی تھی۔ آگ بھی شاید چیخ رہی تھی۔ یقیناً گھر میں کوئی کھانے کی تقریب ہو رہی تھی۔

جبھی آگ جلائی گئی ورنہ مئی کے مہینے میں ہم آگ نہیں جلاتے میں نے کان لگا کر سنا۔ میری بہن بھی وہاں موجود تھی۔ شاید کافی سرو کر رہی تھی۔ میری بیوی بھی تھی اور ساتھ ہی ساتھ دو مرد اور بھی تھے۔ ان میں سے ایک تو میرا پڑوسی تھا جب کہ دوسرا مرد میرے گھرانے سے متعلق تھا۔ یہ دونوں ہمارے ہاں اکثر شام کو گپ شپ کرنے آیا کرتے تھے۔ میں نے آوازوں کو سنا۔ اب میری بیوی رو دھو نہیں رہی تھی۔ کمرے میں ریڈیو بھی بج رہا تھا۔ میں نے بہت آہستگی سے سٹنگ روم کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ میں نے دیکھا میرا پڑوسی میری کرسی پر بیٹھا ہوا ہے لہٰذا میں دیوان کی طرف چل دیا۔

کسی نے میری جانب توجہ نہیں دی نہ ہی کسی نے مجھے مخاطب کرنے کی کوشش کی۔ شاید عدم توجہ کی بنا پر ہی وہاں مجھے کافی بھی نہیں پیش کی گئی۔ وہ سب لوگ آپس میں مصروف گفتگو تھے۔

میری بیوی اس وقت خاصی شاداں اور بھلی لگ رہی تھی۔ اس کی گود میں سلائیاں اور اون کا گولا پڑا ہوا تھا۔ میں نے بھویں سکوڑ کر سوچا آخر میں نے کیا کیا ہے کہ یہ لوگ سرے سے میری طرف کوئی توجہ نہیں دے رہے ہیں؟

پھر میں چل پڑا میں سیدھا اپنی بیوی کی طرف بڑھا۔ میں نے اپنے ہاتھ میں دبی ہوئی سیگل کے انڈوں کی باسکٹ کو اس کی گود میں رکھ دیا اور آہستگی سے اس کی نظریں سلائیوں پر سے اٹھیں اور پھر وہ ایک بلند چیخ کے ساتھ اٹھی اور بھاگنے لگی۔ میری بہن اس کے پیچھے جھپٹی۔ اسی لمحے میرے گھرانے والے آدمی نے میرے پڑوسی سے کہا۔

''بھابی کے اعصاب بے حد کمزور ہو گئے ہیں یہ دوسرا موقع ہے کہ انہیں گمان ہوا ہے کہ ان کے شوہر نے انڈوں کی باسکٹ ان کی گود میں ڈالی ہے ہمیں انہیں یہاں سے لے ہی جانا ہوگا۔''

پھر میری سمجھ میں ساری بات آ گئی۔ میں دوبارہ کمرے سے نکل کر اپنے دارالمطالعہ کو چل پڑا۔

میرا اب لوگوں سے رابطہ ختم ہو چکا تھا۔ بلند چٹان کی ایک فٹ چوڑی پٹی کو عبور کرنے کی جو کوشش میں نے کی تھی میں اس میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملاقات

محبت ایک ایسا پھول ہے۔ جس کے لیے زرخیز زمین کا ہونا کافی نہیں یہ کھلنے پر آتا ہے تو سنگلاخ چٹانوں کا سینہ بھی چیر دیتا ہے اور کیچڑ میں کنول بن کر بھی دیکھنے والوں کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔
دو محبت کرنے والوں کا فسانۂ عجیب' وہ ایک دوسرے کو بن دیکھے ہی دل دے بیٹھے تھے

محبت کرنے والوں کے لیے بے وفاؤں کی سرزمین سے تحفۂ خاص

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو میں نے ایک ہاتھ اپنے سامنے کھلی فائل پر رکھ دیا اور دوسرے سے ریسیور اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''جیمز فارورڈنگ کمپنی' گڈ مارننگ!''

''یہ جیمز فارورڈنگ کمپنی کا ہی دفتر ہونا چاہیے میری!'' دوسری طرف سے مانوس آواز سنائی دی تو میں ہنس پڑی۔

''کیسے ہو جم!'' میں نے پوچھا۔

''بالکل ٹھیک ٹھاک تم کیسی ہو؟''

''میں بھی بالکل ٹھیک ہوں۔''

''آج لوڈ کتنا ہوگا۔''

''ابھی بتاتی ہوں۔ ہولڈ آن۔'' یہ کہہ کر میں نے آج بھیجے جانے والے مال کی فائل دیکھی اور بولی۔ ''چار ٹن!''

''ٹھیک' ہمارا ٹرالر گیارہ بجے تک پہنچ جائے گا۔ یہ بتاؤ تمہاری ہفتہ وار چھٹیاں کیسی گزریں؟'' جم نے پوچھا۔

''کوئی خاص نہیں حالانکہ موسم خاصا اچھا تھا تم اپنی سناؤ۔''

''میں سنیچر کو فٹ بال کھیلتا رہا اتوار کو سوتا رہا۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم دونوں ایک جیسے بندے ہیں۔''

''ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو۔''

''ایسا ہی ہے اتنے عرصے سے تم سے روزانہ بات ہوتی ہے۔ جس سے میں نے یہی اندازہ لگایا ہے۔''

''اندازے غلط بھی ہو سکتے ہیں جم۔''

''کبھی کبھی' اچھا میری کل بات ہوگی بائے۔''

''بائے بائے۔'' میں نے کہا اور ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

میرے ساتھ کام کرنے والی جین نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور بولی۔ ''وہی تمہارا محبوب بات کر رہا ہوگا۔''

''اوہ خداوند! میرا کوئی محبوب نہیں وہ جم تھا۔''

''وہ بھی تو تمہارا محبوب ہو سکتا ہے۔''

''میں تو کبھی اس سے ملی بھی نہیں۔ نہ اس نے مجھے دیکھا ہے۔ نہ میں نے اسے۔ بس گزشتہ دو برسوں سے فون پر بات ہو جاتی ہے۔''

''تو پھر اس سے بات کرتے وقت تمہارے چہرے پر محبت کے رنگ کیوں آ جاتے ہیں۔ لہجے میں بھی رس گھل جاتا ہے۔'' جین نے بحث شروع کر دی۔

''وہ رنگ اور لہجے کا رس تمہاری اپنی دریافت ہے۔ وہ لندن میں رہتا ہے اور میں یہاں جب ہم ایک دوسرے سے ملے ہی نہیں تو ہمیں محبت کیسے ہو سکتی ہے؟''

''محبت معجزے بھی دکھاتی ہے۔'' جین کا اصرار

جاری تھا۔

''میں معجزوں کی قائل ہی نہیں۔ البتہ تم یہ کہہ سکتی ہو کہ روزانہ فون پر باتیں کرتے کرتے ہم ایک دوسرے کے دوست بن گئے ہیں۔''

''چلو یہی سہی' پہلے دوستی ہوتی ہے اور پھر یہی دوستی محبت میں بدل جاتی ہے۔''

''میں تم سے بحث نہیں کر سکتی جین۔ مجھے کام کرنے دو۔ انوائس ادھورا ہے اور ہیری گیارہ بجے تک آ جائے گا۔''

ہیری جم کا ٹرک ڈرائیور تھا اور جم لندن میں ہمارا ایجنٹ۔ میں بھیجے جانے والے مال کا انوائس مکمل کرنے لگی لیکن جین زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکی۔ ''اچھا یہ بتاؤ جم کیسا ہوگا۔''

''میرے خیال میں ساٹھ سال کا بوڑھا۔''

''مگر تم نے بتایا تھا کہ وہ ہر سنیچر کو فٹ بال کھیلتا ہے۔ کیا ساٹھ سالہ بوڑھا فٹ بال کھیل سکتا ہے؟'' جین پھر بحث پر اتر آئی۔ ''تم نے اپنے ذہن میں اس کی تصوراتی تصویر تو بنائی ہوگی۔ قد کاٹھ کیسا ہوگا اس کا تمہارے تصور کے مطابق۔''

''ہاں' یہ بتا سکتی ہوں میں' میرے ذہن میں اس کی جو تصوراتی تصویر ابھرتی ہے اس کے مطابق وہ چار فٹ دس انچ لمبا ہے۔ آدھے بال اڑ چکے ہیں اس کی ناک چپٹی اور کان تھوڑے سے بڑے ہیں اور فٹ بال کھیلنے کی وجہ سے اس کی ٹانگیں قدرے خمیدہ ہیں۔''

جین نے جم کے اس حلیے پر قہقہہ لگایا۔ ''بس بس اس بے چارے کا حلیہ مزید مت بگاڑو۔ تم نے تو اسے کسی سرکس کا مسخرا سمجھ لیا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اپنی دفتری ذمے داری کی وجہ سے نرمی سے بات کرتی ہو۔''

''بالکل ٹھیک سمجھیں تم۔''

گیارہ بجے جم کی فرم کا ڈرائیور پہنچ گیا۔ میں نے ضروری کاغذات پر دستخط کر کے اسے دیے تو وہ بولا۔ ''جم سلام کہہ رہا تھا۔''

''میری طرف سے بھی اسے سلام کہہ دینا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ایک بات تو بتاؤ' ہیری!'' جین بیچ میں بول اٹھی۔ ''جم کی شکل وصورت کیسی ہے؟''

''اچھی ہے مگر وہ مجھ جیسا وجیہہ وشکیل نہیں۔'' ہیری نے ہنستے ہوئے بتایا۔

''اگر تم اپنے آپ کو وجیہہ وشکیل سمجھتے ہو تو میں سمجھ گئی کہ وہ کیسا ہوگا۔'' میں نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

''مذاق چھوڑو ہیری۔ سچ سچ بتاؤ وہ کیسا ہے۔'' جینی بولی۔

''وہ سچ مچ وجیہہ وشکیل جوان ہے۔ کبھی تم لوگ لندن آؤ اور خود دیکھ لو۔''

''وہ کیوں نہیں آتا۔'' جین نے پوچھا۔

''وہ تو آنا چاہتا ہے مگر ذمے داریاں اسے وہاں سے ہلنے کی بھی اجازت نہیں دیتیں۔ جب سے اسے میں نے میری کا حلیہ بتایا ہے وہ اس سے ملنے کے لیے بے تاب ہے۔''

یہ سن کر جین نے میری طرف دیکھا اور تالیاں بجاتے ہوئے بولی۔ ''معجزہ رونما ہونے والا ہے۔''

''کوئی نہیں۔'' پھر میں نے ہیری سے پوچھا۔ ''تم نے اسے میرے بارے میں کیا بتایا ہے؟''

''یہ تو میں تمہیں ہرگز نہیں بتاؤں گا۔ ورنہ تم مغرور ہو جاؤ گی۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔ خدا حافظ۔''

یہ کہہ کر ہیری چلا گیا اور ہم دوبارہ کام میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مصروف ہوگئیں میں لنچ کے لیے اٹھنے والی تھی کہ فون کی گھنٹی پھر چیخ اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ ''جیمز فارورڈنگ کمپنی۔''

''میں ایوان کے پولیس اسٹیشن سے بول رہا ہوں۔ آپ کو ایک حادثے کے متعلق اطلاع دینا ہے۔''

مجھے جھرجھری آ گئی۔ ''کیسا حادثہ کس کا حادثہ؟'' میں نے پوچھا۔

''ٹرالر میں آپ کی فرم کا سامان لدا ہوا تھا۔ جو اب سڑک پر بکھرا ہوا ہے اور سڑک بند ہوگئی ہے۔ یہ حادثہ ایوان سے چند میل پہلے ہوا ہے۔''

یہ سن کر میرا دل ڈوبنے لگا میں نے پوچھا۔ ''ڈرائیور تو ٹھیک ٹھاک ہے نا؟''

''نہیں خاتون اسے کافی چوٹیں آئی ہیں۔ وہ ایوان کے اسپتال میں ہے۔''

''کیا آپ لوگوں نے اس کی کمپنی کو حادثے کی اطلاع دی ہے؟''

''نہیں خاتون ڈرائیور کی حالت بہت خراب تھی اس لیے ہم نے کاغذات تلاش کرنے کے بجائے پہلے اسے اسپتال پہنچانا ضروری سمجھا۔ کیا آپ ہمیں اس کی کمپنی کا نام پتا بتا سکتی ہیں؟''

میں نے اسے جم کی کمپنی کا نام اور پتا اور فون نمبر دیتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی انہیں فون کر دوں گی۔''

''شکریہ! برائے مہربانی اپنے سامان کے لیے فوراً کوئی دوسرا ٹرالر بھجوا دیں۔ ہم زیادہ دیر تک سڑک بند نہیں رکھ سکتے۔''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے کہا اور ٹرالر کا بندوبست کر کے جم کو فون کیا۔

''شکریہ میری۔'' جم بولا۔ ''ابھی ابھی مجھے ایوان پولیس کا فون بھی ملا تھا۔ میں ہیری کی بیوی کو لینے جا رہا ہوں۔ وہاں سے ہم سیدھے ایوان روانہ ہو جائیں گے اور چند گھنٹوں میں پہنچ جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے میں تمہیں اسپتال میں ملوں گی۔''

یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ یہ میں نے کیا کہہ دیا۔ کیا جم سے ملنے کی خواہش میرے لاشعور میں موجود تھی؟

دوسرے ٹرالر کے کاغذات تیار کرنے کے بعد میں ایوان روانہ ہوگئی۔ پہلے میں نے جائے حادثہ کا معائنہ کیا۔ ٹرالر کی حالت دیکھ کر تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ بے چارے ہیری کا بچنا محال ہے۔ وہ تقریباً چکنا چور ہو چکا تھا۔ اس کے بعد میں اسپتال چلی گئی۔

اسپتال میں داخل ہوتے وقت مجھے یہ احساس ہو چکا تھا کہ ہیری جاں بر نہیں ہو سکا ہوگا۔ استقبالیہ کلرک نے مجھے انتظار گاہ میں جانے کی ہدایت کی۔ اس وقت تین بج رہے تھے۔ جم نے کہا تھا کہ وہ اور ہیری کی بیوی تین بجے تک پہنچ جائیں گے مگر انتظار گاہ خالی تھی یا تو وہ ہیری کے پاس تھے یا اب تک نہیں پہنچ پائے تھے۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی لیکن ہیجان کی وجہ سے اٹھ کر ٹہلنے لگی۔

آج گیارہ بجے ہیری کتنا تندرست و توانا تھا اور اب یا تو وہ مر چکا تھا یا پھر جاں کنی کے عذاب سے گزر رہا تھا۔ میں انہی سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی اس لیے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز تو نہ سن سکی البتہ اپنے عقب میں قدموں کی چاپ نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک خوبرو جوان آدمی کونے والی کرسی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے چہرے پر فکر اور دکھ کے سائے تھے۔ وہ کرسی پر ڈھے سا گیا۔ اس کی بڑی بڑی بھوری آنکھوں سے غم جھلک رہا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ وہ جم

ہوگا۔ میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔ ''کیا میں ہم سے مخاطب ہوں؟''

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میری ہی مجھے اس طرح مخاطب کر سکتی ہے۔''

''میرا خیال تھا کہ تم ایسے نہیں ہو گے۔'' میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔

''اوہ تو میں نے تمہیں مایوس کیا ہے۔'' وہ بولا۔

''نہیں، نہیں بلکہ میرا خیال تھا کہ تم گنجے ہو گے۔''

وہ ہنس دیا۔ ''ہیری نے تمہارے متعلق جو کچھ بتایا تھا تم اس سے زیادہ ہو۔''

''ہیری کیسا ہے؟'' میں نے موضوع بدلنے کے لیے کہا۔

''اس کی حالت مخدوش ہے۔ اس وقت وہ کوما میں ہے۔ جو چند گھنٹوں میں بھی ختم ہو سکتا ہے اور ہفتوں بھی جاری رہ سکتا ہے۔''

''اس کی بیوی کا کیا حال ہے؟''

''اپنی بڑی ہمت والی ہے۔ اس وقت وہ ہیری کے پاس ہے میں نے سوچا کہ اسے تنہائی میں ہیری سے بات کرنے کا موقع دوں۔ شاید وہ اس سے کوئی بات کرے جس سے ہیری کو ہوش آ جائے کچھ دیر کے بعد میں اسے لے آؤں گا۔''

''تم بہت پریشان دکھائی دے رہے ہو۔ ہم دونوں ایک ایک کپ کافی کیوں نہ پی لیں۔''

جم نے میری طرف متفکر نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تجویز اچھی ہے۔ آؤ اپنی کو ساتھ لے چلیں۔''

اپنی عام حالات میں کافی خوش شکل ہوگی لیکن اس وقت رونے سے اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور چہرے پر بھی زردی کھنڈ رہی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کافی پینے کے بعد جب انتظار گاہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ڈاکٹر آیا اور اس نے بتایا کہ ہیری کو سر میں گہری چوٹ آئی ہے۔ ایک کلائی اور دو پسلیاں ٹوٹ گئی ہیں اور جسم کے مختلف حصوں میں بھی زخم آئے ہیں۔ اگر وہ چند گھنٹوں کے اندر اندر ہوش میں آ گیا تو بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ ورنہ کوما میں چند ہفتوں تک یا ہمیشہ کے لیے بھی رہ سکتا ہے۔

''اس کے ہوش میں آنے کے امکانات کیا ہیں؟'' جم نے پوچھا۔

''اس وقت یہ بتانا مشکل ہے لیکن لگتا ہے کہ وہ گہرے کوما میں نہیں ہے۔ ہمیں چند گھنٹے انتظار کرنا اور اس پر نظر رکھنا ہوگی۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر نے اینی کی طرف دیکھا۔ ''مجھے افسوس ہے مسز ہیری کہ موجودہ صورت حال میں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا۔''

اینی نے روتے ہوئے سر جھکا لیا۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد جم مجھ سے بولا۔ ''تمہارے یہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں میری۔ میں اینی کو سنبھال لوں گا۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو جم؟ تم نے خود ہی تو یہ بتایا تھا کہ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق یہ ضروری ہے کہ ہیری کے ساتھ اس وقت باتیں کی جائیں جب تک کہ وہ پوری طرح ہوش میں نہ آ جائے۔ ہم تینوں باری باری اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

''تم یہ زحمت گوارہ کرلوگی؟'' جم نے پوچھا۔

''کیوں نہیں' ہیری تمہارا ملازم ہے تو میرا دوست۔''

وہ ساری رات ہم تینوں باری باری ہیری کے پاس بیٹھ کر مسلسل بولتے رہے۔ صبح کے وقت جب اینی ہیری کے پاس تھی۔ میں اور جم انتظار گاہ میں بیٹھے تھے۔ میں نے جم سے کہا۔ ''مجھے ہیری اور اینی کو دیکھ کر رونا آ جاتا ہے جم! کتنا اچھا جوڑا ہے ان کا مگر تقدیر نے ان پر کیا ستم ڈھایا۔''

''چاہے ہیری کا چہرہ مسخ ہو جائے یا اس کا کوئی عضو کاٹنا پڑے مگر وہ بچ جائے تو بھی اینی اسے ہمیشہ کی طرح چاہے گی۔ جیسے چاہتی رہی ہے۔ وہ ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔''

''اور اگر خدانخواستہ ہیری جاں بر نہ ہو سکا تو؟''

''تو پھر اینی نہ جانے کیا کر بیٹھے۔ وہ ہیری کے بغیر زندہ نہیں رہ سکے گی؟''

میں یہ سن کر لرز گئی جم اٹھ کر میرے پاس آ گیا۔ میں جذباتی ہو کر رونے لگی تو اس نے مجھے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔ مجھے بھی احساس نہ رہا کہ میں نے اپنا سر کب اس کے سینے پر ٹکا دیا۔ کچھ دیر بعد جب میری یہ کیفیت ختم ہو گئی تو میں آنسو پونچھتے ہوئے پیچھے ہٹنے لگی۔ تبھی جم بولا۔ ''ہم اگرچہ ایک دوسرے سے کل ہی ملے ہیں اور ہمیں ملے ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے لیکن ہم ایک دوسرے کو عرصۂ دراز سے جانتے ہیں۔ ہے نا!''

''ہاں۔''

''تو اس طویل جان پہچان کے ناتے میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ میں نہیں جانتا کہ تمہارے محسوسات کیا ہیں مگر میں نے اپنے احساسات سے تمہیں آگاہ کر دیا ہے۔''

''میرے بھی وہی احساسات ہیں جو تمہارے ہیں جم۔''

''اوہ' میں کتنا خوش نصیب ہوں میری!'' ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ انتظار گاہ کا دروازہ کھلا اور

اینی داخل ہوئی تو ہم ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ اینی کی آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی۔

''وہ ہوش میں آ گیا۔ پوری طرح ہوش میں آ گیا ہے۔'' اینی نے فرطِ مسرت سے کپکپاتے لہجے میں کہا اور ہم دونوں سے لپٹ گئی۔ ''میں نے اسے کہا کہ میں ہمیشہ تمہیں تیز رفتار ڈرائیونگ سے منع کرتی تھی مگر تم نے میری ایک نہ سنی۔ اب سن لو کہ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میں بھی مر جاؤں گی مر جاؤں گی۔'' یہ سنتے ہی اس نے بے ساختہ کہا۔ ''نہیں اینی' ایسا مت کہو اور پھر وہ مجھ سے کافی دیر تک باتیں کرتا رہا۔'' اینی یہ بتاتے ہوئے ہنستی بھی جا رہی تھی اور اس کے آنسو بھی بہہ رہے تھے۔

''ڈاکٹر کو معلوم ہے کہ وہ پوری طرح ہوش میں آ گیا ہے؟'' جم نے پوچھا۔

''ہاں' وہ کہتا ہے کہ ہیری بالکل ٹھیک ہو جائے گا اور اتنا کہہ کر وہ رک گئی کیونکہ ڈاکٹر انتظار گاہ میں داخل ہو رہا تھا۔ اینی نے اس سے سوال کیا۔ ''وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا نا ڈاکٹر!''

''ہاں' وہ کوما کی حالت سے نکل آیا ہے اور ہفتے عشرے میں اسپتال سے ڈسچارج کر دیا جائے گا لیکن وہ ڈیڑھ دو ماہ تک ڈرائیونگ نہیں کر سکے گا۔''

''ویسے وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔'' ڈاکٹر نے اینی کی تائید کی اور چلا گیا۔

اینی بہت خوش تھی۔ میرے دل سے بھی سارا بوجھ ہٹ گیا تھا اور جم کے اظہارِ محبت سے دگنی مسرت ہو رہی تھی اتنے میں اینی نے پوچھا ''جب یہاں آئی تھی اور جو کچھ میں نے دیکھا تھا وہ سچ تھا یا مجھے دھوکا ہوا تھا؟''

''نہیں' تم نے جو کچھ دیکھا تھا وہ حقیقت تھا کیوں میری؟'' جم نے بال میرے کورٹ میں پھینک دی۔

''ہاں اینی!'' میں نے شرماتے ہوئے جم کی تائید کی۔ ''ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔''

''اوہ خدا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔'' اینی نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے اوپر کو دیکھا۔

''شکر کس بات کا؟''

''ہیری ہمیشہ مجھے بتایا کرتا تھا کہ تم عرصۂ دراز سے روزانہ ایک دوسرے سے فون پر باتیں کرتے ہو مگر کبھی ملے نہیں اور جب بھی ملو گے ایک دوسرے سے محبت کرنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہیں ایک دوسرے سے ملنے کے لیے قدرت نے ایکسیڈنٹ کو وسیلہ بنایا ہو۔''

''اگر یہ سچ ہے تو پھر مجھے قدرت سے شکایت ہے۔'' جم بولا۔

''کیوں؟''

''اگر قدرت کو ہمیں ایک دوسرے سے ملانا ہی تھا تو اتنی ڈرامائی صورتِ حال میں نہ ملاتا جس نے ہم سب کے دل دہلا دیے مگر خیر ہم اس ڈرامائی صورت حال کا جواب ہیری کو اسی طرح ڈرامائی انداز میں دیں گے۔''

''وہ کیسے؟'' اینی نے پوچھا۔

''جب تک وہ پوری طرح صحت یاب نہ ہو جائے نہ ہم اسے اپنے بارے میں کچھ بتائیں گے اور نہ تم۔ جب وہ صحت یاب ہو جائے گا تو جس پہلی تقریب میں وہ شرکت کرے گا وہ ہماری شادی کی تقریب ہوگی کیوں میری؟''

میں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

⌘

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چکر

اقبال بھٹی

خوابوں میں جینے والے ایک شخص کی روداد' ایک روز اس کے خوابوں کو تعبیر مل گئی مگر.....!

مغرب سے درآمدہ ایک دلچسپ کہانی' اس کا اختتام پڑھ کر آپ کو بھی اس خواب زدہ سے ہمدردی محسوس ہوگی۔

وقت پر فیصلہ نہ کرنے والوں کے لیے ایک سبق آموز کہانی

روز کی مانند ٹھیک ساڑھے سات بجے بن کرامپٹن سڑک پر چلتے چلتے مڑا اور اس گلی میں آ گیا جو پراسپکٹ اسٹریٹ کے نام سے موسوم تھی۔ روشنی تھوڑی تھوڑی بڑھ ضرور رہی تھی لیکن ہوا کے جھونکے آہستہ آہستہ جھکڑوں میں تبدیل ہو رہے تھے۔ ان کی وجہ سے گلی میں جمع پتیاں وغیرہ بگولوں کی شکل میں ناچ رہی تھیں۔

فضا میں ٹھنڈ بڑھی ہوئی تھی۔ بن نے اپنے کوٹ کو بدن کے ساتھ مزید کستے ہوئے برمودا کے گرم دنوں کا تصور کیا۔ ان دنوں جنگ ہو رہی تھی' اس نے سوچا آج کے مقابلے میں کل والے دن کہیں اچھے تھے۔ کم از کم اس زمانے میں زندگی اس قدر یکساں اور بور تو نہ تھی۔ ان دنوں تو یہ عالم تھا کہ وہ صبح سویرے فیکٹری کے لیے چل پڑتا تھا۔ پورا دن وہیں گزرتا تھا' گھر واپسی کے وقت رات ہو رہی ہوتی تھی اور پھر ذرا ہی دیر بعد سونے کا وقت ہو جاتا تھا۔ اب زندگی کوئی زندگی تو نہ تھی' یہ تو بس وجود والی بات تھی۔

بہرحال اتنا ضرور تھا کہ مستقبل سے اسے اچھی امیدیں تھیں۔ اسے امید تھی کہ کبھی نہ کبھی لاٹری کا ٹکٹ اس کے نام بھی نکل آئے گا۔ وہ ہفتے کے ہفتے چھ شلنگ داؤ پر لگایا کرتا تھا۔ فی الحال تو اسے کبھی ایک کوڑی کا نفع نہیں ہوا تھا مگر بات وہی تھی کہ امید پر دنیا قائم ہے.....

ہوا کا ٹھنڈا جھونکا چلا تو وہ عالم خیال سے اصلی دنیا میں لوٹ آیا۔ اس نے سنجیدگی سے سوچا واقعی اس طرح انعام وغیرہ نکلنے والی بات خود فریبی ہی تھی۔ انعامات تو صرف مقدر والوں کے ہی نکلتے ہیں۔ اسے تو بس اسی سڑک پر اسی طرح چلتے رہنا تھا۔ کل آج اور آنے والی کل بھی دنوں میں۔

گلی کے دونوں جانب ٹیریسوں والے چھوٹے چھوٹے مکانات زیادہ تر خالی تھے۔ حقیقتاً انہیں فرسودہ سمجھ کر چھوڑ دیا گیا تھا البتہ گلی کا آخری مکان ان سے قدرے مختلف تھا۔ یہ گلی کی داہنی سمت میں تھا۔ اس کا نمبر تھا بہتر۔ اس کی نچلی منزل پر ایک بورڈ لگا تھا "برائے فروخت" یہ مکان بھی خالی ہی تھا۔

بن نے مکان کو تنقیدی نظروں سے دیکھا جیسے کوئی خریدنے والا دیکھتا ہے' تب اسے احساس ہوا کہ مکان کا صدر دروازہ پوری طرح بند نہیں ہے۔

اسے کچھ پتا نہیں اس نے گیٹ کھول کر اندر گھسنے کی حرکت کیوں کی تھی۔ اس گیٹ سے نکل کر اس نے باغیچہ پار کیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے سامنے اب تنگ سا راستہ ہے جس میں دروازہ موجود تھا چونکہ وہ اندر آ ہی چکا تھا اس نے سوچا اسے ذرا اندر سے بھی دیکھتا چلوں پھر وہ پہلے کمرے میں جا گھسا۔

اندر دیکھنے کے لیے کچھ زیادہ اشیاء نہ تھیں۔ دیواریں گندی تھیں جگہ جگہ کوڑا بکھرا ہوا تھا۔ چھت

میں شگاف پڑے ہوئے تھے' عقبی کمرے کی شکل بھی تقریباً ایسی ہی تھی جہاں لمبی لمبی گھاس اُگ رہی تھی۔ البتہ وہاں اس نے ایک جگہ زمین کھدی دیکھی۔ صاف لگتا تھا جیسے اسے حال ہی میں کھودا گیا ہو۔

اسے کچھ حیرت سی ہوئی۔ بن عقبی دروازے سے نکل کر باغیچہ میں چلا گیا۔ دروازے کے ساتھ ہی ایک پرانا سا پائپ کا ٹکڑا پڑا تھا' بن نے اسے اٹھالیا۔ اس نے اس تازہ کھدی جگہ کو کھودنا شروع کر دیا۔ یکا یک پائپ کسی سخت شے سے ٹکرایا۔ بن کا ذہن چوکنا ہو گیا' اس نے مزید کھدائی کی۔

ذرا ہی دیر میں اس نے زمین سے ایک مستطیل شکل کا پیکٹ کھود نکالا جو بورے میں لپٹا ہوا تھا۔ اسے رسّی سے باندھا گیا تھا۔ اس نے عجلت کے ساتھ اپنی جیب سے قلم تراش نکالا اور رسیاں کاٹیں پھر بورے کو پھاڑ دیا' اندر ایک سستا فائبر سے بنا ہوا اٹیچی کیس دکھائی دیا۔ کانپتی انگلیوں سے اس نے اٹیچی کیس کو چھیڑا۔ وہ غیر مقفل تھا۔ ایک ہلکی کلک کے ساتھ ڈھکنا کھل گیا۔ بن نے کچھ خوف زدہ سا ہو کر اندر دیکھا۔

"اوہ..... میرے خدا!" اس کے منہ سے نکلا! کیونکہ وہاں نوٹ ہی نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ قطاروں میں صفائی سے رکھے ہوئے نوٹ۔ بندھے ہوئے جیسے بینک میں ہوتے ہیں۔

بینک کا تصور ذہن میں آیا تو وہ چونک گیا۔ پچھلے ہی ہفتے مل پڈ کے علاقے میں ایک بینک پر ڈاکا پڑا تھا۔ یقیناً یہ رقم وہیں کی تھی۔ قریب ہی ایک پرانی سی بالٹی اوندھی پڑی تھی۔ کمزوری محسوس کرتے ہوئے بن اسی پر بیٹھ گیا اور اس نئی صورت حال پر غور کرنے لگا۔ معقول بات تو ایک ہی تھی کہ وہ یہ رقم لے جا کر پولیس کے حوالے کر دے لیکن وہ سوچے جا رہا تھا۔ کسی کو کچھ پتا نہیں کہ رقم میرے پاس ہے۔ اس نے اپنے آپ کو سمجھایا پھر کوئی ایسی بات بھی نہیں جس کی بنا پر اس کا رشتہ مجھ سے جوڑا جا سکے' اس وقت اس بریف کیس میں میرے لیے جنت کا ٹکٹ موجود ہے' جس کی مجھے ہمیشہ سے تمنا تھی۔ سمندر کے پار ہزاروں خوب صورت جگہیں ہیں' وہ دنیا دیکھنے کا ممکن تھا۔ اس نے سوچا مجھے یہ رقم رکھ لینی چاہیے' مجھے ملی ہے میں نے چرائی تو نہیں ہے۔

باہر نکل کر اس نے طے کیا کہ مجھے حسب معمول آفس جانا چاہیے کسی قسم کی اچانک تبدیلی ٹھیک نہ ہوگی۔ اس کی وجہ سے باتیں ہو سکتی تھیں۔ ہفتے دو ہفتے کے بعد نوکری چھوڑنا آسان تھا۔ شہر کا چھوڑنا اس سے بھی زیادہ آسان تھا۔ ہزار بہانے وہ بنا سکتا تھا۔ سارا منصوبہ بے حد آسان تھا۔

اپنی دراز میں کیس کو بند کرنے کے بعد وہ کام میں لگ گیا لیکن اس کا ذہن بکھرا ہوا تھا۔ وہ انہماک سے کام نہیں کر پا رہا تھا۔ شاید وہ کچھ زیادہ ہی الجھ گیا تھا۔ دوسروں نے یہ بات بھی محسوس کر لی۔

"کیا بات ہے بن؟" اس کے ساتھی جم نے پوچھا۔ "آج تم غائب سے دکھائی دے رہے ہو؟"

"ہاں..... وہ بات یہ ہے کہ چند سوچیں تنگ کر رہی ہیں' ویسے میں ٹھیک ہوں۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"تم نے آج اپنی دراز بڑی احتیاط سے لاک کی ہے۔ کیا ہے اس کیس میں؟" جم نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

بن کا رنگ اڑ گیا تاہم اس نے بے پروائی کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوگا اس میں؟ کچھ چیزیں بیوی نے دی ہیں ایک صاحب کو پہنچانی ہیں۔"

بیوی کے تذکرے پر اسے دھیان آیا کہ اس کی جانب تو اس نے توجہ ہی نہیں کی۔ وہاں بھی تو آج کے معاملے کی تشریح کرنی تھی اتنی رقم کے بارے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں بتایا جائے یا نہ بتایا جائے' بلاشبہ اس کی بیوی میری وفا شعار عورت تھی اور اس کے بُرے دنوں میں بھی اس کی ساتھی سنگی رہی تھی۔ البتہ وہ بھی جانتا تھا کہ وہ ایک بے حد دیانت دار قسم کے ذہن کی مالک بھی ہے۔ واقعی اسے اس سلسلے میں کافی سوچنا تھا۔

دن جیسے جیسے گزرتا گیا تھا۔ بن آہستہ آہستہ بجھتا گیا۔ ابتداء کی خوشی اب بہت کم ہوگئی تھی۔ سوچوں کے ساتھ نئے مسائل سامنے آرہے تھے۔ بالآخر اس نے سوچا کہ شاید رقم وہ رکھ ہی نہیں سکے گا۔ یہی اچھا نظر آرہا تھا کہ وہ اسے پولیس تک پہنچا دے۔ ہوسکتا ہے اس کے عوض اسے کچھ انعام وغیرہ بھی مل جائے اس طرح یہ بات اسے دل کو لگتی لگ رہی تھی۔ ایمان داری واقعی اچھی چیز ہوتی ہے۔

ابھی وہ اس مسئلے کو علیحدگی سے حل کرنے پر خود کو مبارک باد ہی دے رہا تھا کہ ایک اور بات ذہن میں کھٹکی۔ پولیس کو یہ بھی بتانا پڑتا کہ وہ مکان تک کیسے گیا تھا؟ پولیس سے اس کا سابقہ پہلے کبھی نہیں پڑا تھا تاہم وہ ان لوگوں سے خوف زدہ سا تھا۔ اسے خدشہ ہوا کہ وہ لوگ ممکن ہے اس کی بات کا یقین نہ کریں۔ اسے قانون کا زیادہ پتا نہ تھا لیکن اس نے سن رکھا تھا کہ پولیس انہیں بھی مجرم ہی سمجھتی ہے جو جرم میں کسی بھی طرح ملوث ہوتے ہیں۔ گویا اس طرح اسے جیل بھی ہوسکتی تھی' وہ کانپ کر رہ گیا لیکن اس نے تو طے کرلیا تھا کہ یہ رقم جس کی ہے اسی کو جائے گی۔ وہ اسے رکھنا نہیں چاہتا تھا یہی نہیں وہ اسے جلد سے جلد لوٹا دینا چاہتا تھا۔

پھر کسی طرح سست رفتار دن اختتام کو پہنچا۔ اٹیچی کیس کو مضبوطی سے باندھ کر وہ فیکٹری سے نکلا اور پراسپکٹس اسٹریٹ کی سمت چل دیا۔ اسے بُری طرح اس بات کا احساس تھا کہ اس کے ہاتھ میں دبے اٹیچی کیس کے اندر نوٹ بھرے ہوئے ہیں۔ ایک جگہ ایک پولیس والے کو دیکھ کر اس نے راستہ ہی بدل دیا۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر کانپ اٹھا کہ خود پراسپکٹس اسٹریٹ کے کارنر پر ایک پولیس مین کھڑا ہے۔

لمحہ بھر کے لیے وہ ٹھٹک گیا۔ اس کے دل میں آیا کہ وہ مڑ کر بھاگ لے لیکن کسی طرح اس نے دل کڑا کیا اور چلتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ بالکل پولیس مین کے قریب پہنچ گیا۔

''گڈ ایوننگ!'' اس نے خوامخواہ پولیس مین کو مخاطب کیا۔

اس نے تھوڑا سا گھوم کر بن کو دیکھا پھر جواباً بولا۔

''ایوننگ!''

چلتے ہوئے بن کو یوں لگ رہا تھا جیسے پولیس والے کی آنکھیں اس کی پیٹھ میں چبھ رہی ہوں۔

ایک چوراہے پر وہ رک گیا۔ وہاں ایک دنا میں دیکھنے کا بہانہ بنا کر پلٹ کر اُدھر دیکھا جہاں اس نے پولیس والے کو چھوڑا تھا۔ وہ پولیس والا اب اس جگہ موجود نہ تھا۔

ایک بار پھر بن پراسپکٹس اسٹریٹ کی طرف لپکا پھر کسی نہ کسی طرح فرنٹ ڈور تک پہنچ گیا۔ نمبر بہتر کے گیٹ کو اس نے دھکا دیا مگر وہ نہیں کھلا۔ اس نے دوبارہ دھکا دیا مگر وہ پھر بھی نہیں کھلا۔ جب اسے احساس ہوا کہ دروازہ لاک ہے تو ایک گہری تشویش نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس نے ونڈو کی طرف نگاہ ڈالی لیکن اس سے بھی گزرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ چند لمحوں تک وہ کھڑا سوچتا رہا یکا یک اسے دھیان آیا کہ وہ عقبی طرف سے بھی اندر داخل ہوسکتا ہے پیچھے جا کر وہ دیوار چڑھ سکتا تھا۔

وہ سامنے والے حصے سے گھومتا ہوا عقب میں چلا گیا۔ اس وقت ہر طرف دھندلکا پھیل رہا تھا۔ آس پاس کوئی بھی نہ تھا اس نے پہلے تو کیس کو دیوار کے اوپر سے اندر پھینک دیا پھر اس پر چڑھنے لگا۔ یہ چھوٹی سی دیوار تھی' وہ اندر پہنچ گیا اس نے عجلت کے ساتھ زمین کھودی' بورے میں اٹیچی کیس کو لپیٹا اور گڑھے کے اندر اسے دبا کر وہ مٹی اس کے اوپر ڈالنے لگا ایک دو منٹ کے اندر یہ کام ہوگیا۔ اس نے دیوار پھلانگی اور باہر آگیا۔

گھر پہنچتے پہنچتے اس پر طاری ہونے والا رعشہ بڑی حد تک ختم ہوچکا تھا۔ وہ بار بار دل ہی دل میں توبہ کررہا تھا کہ اب آئندہ وہ ایسے کسی چکر میں خود کو نہیں پھنسائے گا۔ جرم صرف وہی کرسکتے ہیں جن کا دماغ و دل مجرموں کا سا ہوتا ہے۔ یہ شریف آدمیوں کے بس کا روگ نہیں۔

جونہی اپنے گھر میں داخل ہوا چھوٹے سے ہال میں میری نے اس کا استقبال کیا اور خوش دلی سے بولی۔

''ارے تم آگئے' میں تو سمجھی تھی کہ شاید تم اوور ٹائم کے لیے رک گئے ہو۔''

''نہیں! میں ذرا اطمینان سے چلتا ہوں۔''

وہ شام اس نے اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے میں گزاری۔ جس وقت خبرنامے میں لوٹ مار کی وارداتوں کا تذکرہ کیا گیا۔ وہ تھوڑا سا پریشان ضرور ہوا مگر یہ تاثر لمحاتی تھا۔

اگلے دن وہ دوبارہ ہشاش بشاش تھا۔ اس کی خود اعتمادی پلٹ آئی تھی۔ وہ تو یہ تک سوچنے لگا کہ اس نے رقم کو دوبارہ اسی جگہ واپس رکھ کے غلطی کی ہے اسے احساس ہونے لگا کہ اس نے مفت میں اتنی بڑی رقم ضائع کردی ہے۔ بہرحال اس کا ضمیر دستور چوکس تھا' اس نے جلد ہی اپنے ذہن سے رقم کے خیالات نکال دیے اور پراسپکٹس اسٹریٹ نمبر [illegible] سے بے گانہ وار گزرتا چلا گیا۔

تیسرے دن وہ نارمل ہوگیا تھا۔ اس روز وہ ذرا جلدی سے چلا تھا لہٰذا وہ دفتر پہلے ہی پہنچ گیا' فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اخبار پر نظریں دوڑانی شروع کردیں۔

اخبار کے آخری صفحے پر ایک خبر ایسی تھی کہ اس کی نگاہیں وہیں ٹھٹک کر رہ گئیں۔ یہ خبر سنسنی خیز سی تھی' لکھا تھا۔

''بینک سے لوٹی ہوئی رقم کا سراغ مل گیا۔'' بن نے جلدی جلدی خبر پڑھنی شروع کردی۔ ''لوکل پولیس کے ہیڈ کوارٹر سے اطلاع ملی ہے کہ گزشتہ دنوں مل ہڈ بینک سے لوٹی ہوئی رقم کا پتا چلا لیا گیا ہے۔ یہ رقم مجرموں نے پراسپکٹس اسٹریٹ کے ایک مکان کے باغیچے میں گاڑ دی تھی۔ پولیس کو اس کا سراغ اس وقت ملا جب مسٹر میلون نامی ایک بوڑھے پنشنر کے فون پر انسپکٹر براؤن نے اس مکان کا جائزہ لیا۔ مسٹر میلون کا مکان اس مکان کی پشت پر واقع ہے اور وہاں سے اس کا باغیچہ دکھائی دیتا ہے۔

مسٹر میلون نے ہمارے رپورٹر کو بتایا ہے کہ پرسوں شام کو اتفاق سے اس کی نگاہ اس مکان کے باغیچے پر پڑ گئی تھی' وہاں اس نے کسی شخص کو دیوار پھاندتے دیکھا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ اس شخص کا حلیہ اس نے پولیس کو تفصیل سے لکھوا دیا ہے۔

مل ہڈ بینک کے عہدے داروں کا بیان ہے کہ وہ مسٹر میلون کو اس اطلاع کے عوض ایک خطیر رقم بطور انعام پیش کریں گے۔ اس رقم کی ادائیگی آج کل میں ہوجائے گی۔

پولیس کے ایک نمائندے نے ہمیں بتایا ہے کہ مسٹر میلون نے جو حلیہ انہیں لکھوایا ہے اس کی مدد سے انہیں پوری امید ہے کہ وہ جلد ہی متعلقہ مجرم کو گرفتار کرلیں گے۔

❖

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

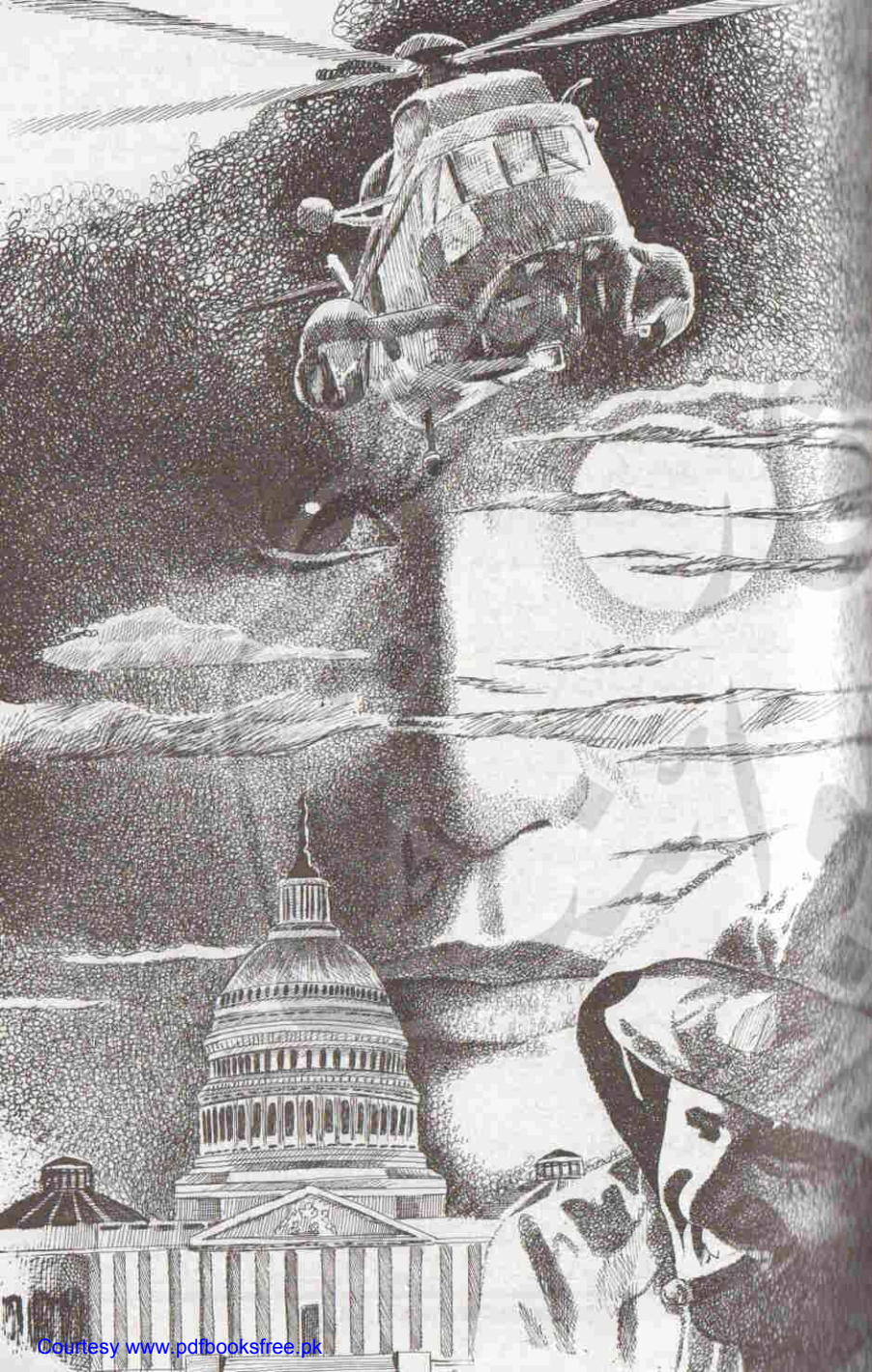

قسط نمبر 2

بازی گر گرئے ہار

حسام بٹ

وقت سب سے بڑا بازی گر ہے۔ اس کی بازی گری اور رنگا رنگی انسانوں کو عجیب تماشے دکھاتی ہے جو لوگ وقت کی آواز نہیں سمجھتے وہ اس کا شکار ہوکر حالات کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں۔ دنیا میں ایسے بھی لوگ گزرے ہیں جنہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں وقت کی باگیں موڑ دیں حالات کا رخ تبدیل کرکے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ تاریخ میں امر ہوکر رہ گئے۔ آج ان کا نام فخر سے لیا جاتا ہے۔

ایک آشفتہ سر نوجوان کی سرگزشت' اس نے پھولوں کی چاہ کی تھی مگر حالات نے اس کا دامن کانٹوں سے بھردیا مگر اس نے وقت کے آگے سپر ڈالنے کی بجائے اس سے مقابلے کی ٹھان لی تھی۔

سطر سطر تجسس قدم قدم ہنگامے لیے نئے افق کی سلسلے وار کہانی

وہ بہت ہی نازک اور سنسنی خیز لمحات تھے۔ میں اور فرحانہ وحشت زدہ نظروں سے ڈرائنگ روم کے دروازے کو دیکھ رہے تھے حالانکہ وہ دستک ڈرائنگ روم کے دروازے پر نہیں بلکہ گھر کے بیرونی دروازے پر ہوئی تھی۔ میں نے پلکیں جھپکتے ہوئے ایک فیصلہ کیا اور فرحانہ کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

''فرحانہ! تم پہلی فرصت میں اپنے گھر پہنچو۔ اگر تمہارے امی ابو میں سے کسی کی آنکھ کھل گئی تو غضب ہو جائے گا۔''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور ڈرائنگ روم کے اندرونی دروازے کی سمت قدم بڑھا دیئے۔ میں نے بھی اس کے ساتھ ہی آگے بڑھتے ہوئے بہ دستور سنجیدگی سے کہا۔

''زینوں اور چھت پر بڑی احتیاط سے جھک کر چلنا۔ باہر گلی میں سے کوئی تمہیں دیکھ نہ پائے......''

''آپ میری فکر نہ کریں اور باہر جا کر دیکھیں' کیا ماجرا ہے۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''میں جیسے آئی تھی ویسے ہی واپس بھی چلی جاؤں گی۔''

جیسے ہی فرحانہ نے زینوں پر قدم رکھا' بیرونی دروازے پر ایک بار پھر زوردار دستک ہوئی۔ اسی لمحے اندرونی کمرے سے امی کی آواز ابھری۔

''اسد! تم جاگ رہے ہو...... دیکھو تو' ہمارا دروازہ کون دھڑ دھڑا رہا ہے۔ خدا کی پناہ! یہ آدھی رات کو کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔''

''میں دیکھ رہا ہوں امی۔'' میں نے بہ آواز بلند تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ مطمئن رہیں۔''

تیسری طوفانی دستک سے پہلے ہی میں بیرونی دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے میں نے کرخت لہجے میں استفسار کیا۔

''کون ہے بھائی......؟''

''بھائی صاحب! دروازہ کھولو۔ آپ کے گھر میں ایک چور گھسا ہے۔'' باہر سے ایک دبنگ مردانہ آواز آئی۔ ''میرا نام بہادر علی ہے۔ میں اور میرا ساتھی کافی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دور سے اس چور کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک آئے ہیں۔"

یہ ایک عجیب وغریب صورت حال تھی۔ سیکنڈ کے دس ویں حصے میں، میں نے دروازہ کھول کر سچویشن کو سمجھنے کا فیصلہ کرلیا۔ اگلے ہی لمحے میں نے دروازہ کھول دیا۔

باہر گلی میں اسٹریٹ لائٹ کی اچھی خاصی روشنی تھی۔ میں نے دو افراد کو پریشانی کے عالم میں کھڑے دیکھا۔ وہ خاصے ہانپے کانپے ہوئے بھی تھے۔ ان کے سینے دھونکنی کی مانند چل رہے تھے۔ میں نے باری باری دونوں کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔

"آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس گھر میں کوئی چور نہیں ہے۔"

"میں نے خود اپنی آنکھوں سے اس شیطان کو آپ کے گھر کی بیرونی دیوار پھلانگ کر اندر کودتے ہوئے دیکھا ہے۔" ان میں سے ایک نے بڑے وثوق سے کہا پھر اپنے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "رستم خان! ہمیں اس گھر کی تلاشی لینا ہوگی۔"

ان میں سے ایک رستم خان اور دوسرا بہادر علی تھا۔ نام دونوں ہی کے بڑے دبنگ تھے مگر اس وقت وہ بڑی پریشانی میں دکھائی دیتے تھے۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بھائی صاحب! میں اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں جاگ رہا تھا۔ اگر کوئی میرے گھر کے اندر کودتا تو میں اس سے بے خبر نہیں رہ سکتا تھا۔ آپ کو میری بات کا یقین کرلینا چاہیے کہ یہاں کوئی چور نہیں ہے۔"

"بھائی! ہم آپ کو جھوٹا نہیں کہہ رہے۔" رستم خان نے کہا۔ "لیکن بہادر نے اس چور کو آپ کے گھر کے اندر کودتے ہوئے دیکھا ہے۔ اگر آپ ایک منٹ کے لیے ہمیں اندر آ کر دیکھ لینے دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔"

بہادر علی لجاجت بھرے لہجے میں بولا۔ "بھائی! ہم ادھر پیٹرول پمپ کے قریب رہتے ہیں۔ وہ چور ہمارے گھر سے زیورات اور قیمتی اشیاء چرا کر فرار ہوا ہے۔ ہم اس کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔ آپ ہماری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کریں۔"

ایک لمحے کو میرے جی میں آئی کہ وہ دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہے۔ پریشانی ان کے چہروں سے مترشح تھی۔ میں نے سوچا۔ میں تو فرحانہ کے ساتھ کسی اور ہی دنیا کی سیر کو نکلا ہوا تھا۔ وہ دنیا جہاں قوتِ گویائی اور سماعت مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے صرف بدن بولتے ہیں اور بدن سنتے ہیں۔ عین ممکن ہے انہی کیف آور بے خبری کے لمحات میں واقعی کوئی چور میرے گھر کے اندر کودا ہو اور مجھے مطلق اس کی خبر نہ ہوئی ہو۔ یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے اور اس سوچ کے ساتھ کہ چور تو آخر چور ہی ہوتا ہے۔ وہ کہیں نقب لگا کر آیا ہے تو میرے گھر میں بھی طبع آزمائی کرسکتا ہے۔ میں نے رستم خان اور بہادر علی کو اپنے گھر کے اندر داخل ہونے کی اجازت دے دی۔

"آجائیں بھائی۔" میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ "لیکن میں آپ لوگوں کو صرف پانچ منٹ دوں گا۔ آپ میرے گھر میں اچھی طرح جھانک کر دیکھ لیں۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔" رستم خان نے کہا۔ "ہمارے لیے پانچ منٹ ہی کافی ہیں۔"

اس دوران میں امی اپنے کمرے سے نکل کر صحن میں آ گئی تھیں۔ انہوں نے دو اجنبی افراد کو میرے ساتھ گھر کے اندر دیکھا تو تشویش بھرے

لہجے میں پوچھا۔

"اسد! یہ کیا ہو رہا ہے۔ کون ہیں یہ لوگ.....؟" جملہ مکمل کرتے کرتے امی کی سانس الجھ گئی تھی۔

"امی! کوئی چور ان کے گھر میں نقب لگا کر بھاگا ہے۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "یہ لوگ پیٹرول پمپ سے اس چور کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ مذکورہ چور ہمارے گھر کے اندر کودا ہے۔"

"اوہ..... تو یہ معاملہ ہے۔" امی نے مدبرانہ انداز سے کہا۔ "اگر ایسی بات ہے تو آپ لوگ بڑے اطمینان سے اس گھر کی تلاشی لے سکتے ہو۔ اللہ غارت کرے ان چوروں کو۔ آج کل تو چوری اور ڈکیتی کی کچھ زیادہ ہی وارداتیں ہو رہی ہیں۔" پھر امی نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"اسد بیٹا! ساری لائٹس آن کردو۔ اگر چور واقعی اس گھر میں چھپا ہوا ہے تو اسے پہلی فرصت میں گرفت میں آجانا چاہیے۔"

میں نے فوراً امی کے حکم کی تعمیل کردی۔ پورا گھر روشن ہوگیا۔ آئندہ پانچ چھ منٹ میں میری معیت میں بہادر علی اور رستم خان نے ہمارے گھر کا چپہ چپہ چھان مارا لیکن مذکورہ چور تو کیا اس کی آمد و شد کا بھی کوئی آثار پکڑ میں نہ آسکا۔

میں نے یکے بعد دیگرے متلاشی افراد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب تو آپ لوگوں کی تسلی ہوگئی۔ میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میرے گھر میں کوئی نہیں کودا....."

ان دونوں نے خجالت بھرے انداز میں ایک دوسرے کو گھورا پھر رستم خان نے کہا۔ "بہادر علی! ہمیں یقیناً دھوکا ہوا ہوگا۔ اگر وہ اس گھر میں کودا ہوتا تو ہماری نظروں سے بچ نہیں سکتا تھا۔"

"ہاں..... مجھے بھی یہی لگ رہا ہے۔" بہادر علی الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ "وہ خبیث چور ہمیں چکمہ دے کر کہیں اور نکل گیا ہے۔"

رستم خان مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "بھائی صاحب! ہمیں معاف کردیں۔ ہماری وجہ سے آپ لوگوں کو بڑی پریشانی ہوئی۔" اس نے لمحاتی توقف کرکے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"ویسے آپ کو بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ ہوسکتا ہے وہ لفنگا گھوم پھر کر آپ کی طرف نکل آئے۔ آج کل ویسے بھی چوریوں کا سیزن چل رہا ہے۔"

بہادر علی نے کہا۔ "وہ ایک دبلا پتلا اور لمبا تڑنگا نوجوان ہے۔ عمر بھی زیادہ نہیں، یہی کوئی پندرہ سولہ سال رہی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "ہم الرٹ رہیں گے۔ آپ ہماری طرف سے بے فکر ہوجائیں۔"

وہ دونوں واپس چلے گئے۔

میں بیرونی دروازہ لاک کرکے آیا تو امی نے کہا۔ "کیسا اندھیر مچا ہوا ہے۔ پندرہ سولہ سال..... یہ عمر تو بچوں کے پڑھ لکھ کر کچھ بننے کی ہے۔ پتا نہیں ہماری نوجوان نسل کو ہو کیا گیا ہے۔ پڑھائی لکھائی اور محنت میں ان کا جی ہی نہیں لگتا۔ ہر کوئی شارٹ کٹ کے چکر میں ہے۔ کسی کو یہ سوچنے کی توفیق نہیں کہ تاریک راہوں کا مسافر کبھی روشنی کا سراغ نہیں پاسکتا۔ ایسے لوگوں کی منزل صرف تباہی اور بربادی ہی ہے..... اللہ رحم کرے۔"

اس افراتفری میں شازیہ بھی بیدار ہوچکی تھی۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "امی! آپ کو اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بات پر فخر ہونا چاہیے کہ آپ کی اولاد آپ کی دکھائی ہوئی روشن راہ پر گامزن ہے۔"

"بے شک! مجھے اس کامیابی پر فخر ہے۔" امی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اور اس کے لیے میں اپنے پروردگار کا جتنا بھی شکر ادا کروں، وہ کم ہے۔"

"چلیں، اب آپ لوگ آرام سے سو جائیں۔" میں نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "اس کم بخت چور کے ایشو نے خواہ مخواہ نیند غارت کردی۔"

امی اپنے بستر پر لیٹ گئیں۔ شازیہ نے واش روم کا رخ کیا اور میں نے ڈرائنگ روم کی جانب قدم بڑھا دیے۔

ابھی میں ڈرائنگ روم کے دروازے تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ شازیہ کی تیز چیخ نے میری سماعت تک رسائی حاصل کرلی۔ میں میکانکی انداز میں پلٹا اور واش روم کی سمت لپک گیا۔ مذکورہ واش روم چھت کی طرف جانے والے زینے کے نیچے بنا ہوا تھا۔ ایک سیکنڈ سے بھی پہلے میں واش روم کے سامنے تھا۔ میری آنکھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔

شازیہ واش روم کے دروازے کے سامنے کھڑی تھی اور اندر سے ایک لمبا تڑنگا سایہ برآمد ہو رہا تھا۔ شازیہ اسی لمحے ڈھینگ کود دیکھ کر چیخی تھی۔ اس سائے کو دیکھ کر میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ ہو نہ ہو، یہ وہی چور ہے جس کے تعاقب میں بہادر علی اور رستم خان ہمارے گھر تک چلے آئے تھے۔

اب وہ سایہ دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھائے میرے سامنے آ گیا تھا اور اس کے خال وخط بھی واضح ہوگئے تھے۔ میں نے بہ غور جائزہ لیا تو وہ مجھے اس نوجوان چور کے حلیے پر بیٹھتا دکھائی دیا جس نے رستم خان اور بہادر علی کے گھر میں نقب لگائی تھی۔

میں نے درشت لہجے میں اس دبلے پتلے دراز قامت نوجوان سے سوال کیا۔ "کون ہو تم؟"

"میں ایک مجبور انسان ہوں سر۔" اس نے لجاجت بھرے انداز میں جواب دیا۔

میں نے آگے بڑھ کر متلاشی انداز میں سرتاپا اس کے بدن پر ہاتھ پھیرائے اور مطمئن ہونے کے بعد بہ دستور سخت انداز میں دریافت کیا۔

"اس مجبور انسان کا کوئی نام تو ہوگا؟"

"میرا نام فیصل ہے سر۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "میں ایک بے ضرر انسان ہوں۔ آپ لوگوں کو مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تو خود اپنی جان بچاتے ہوئے آپ کے گھر میں پناہ لی تھی۔"

"پناہ لی تھی یا دیوار پھلانگ کر گھر میں گھسے تھے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"ایک ہی بات ہے سر۔" وہ سادگی سے بولا۔ "دو شیطان میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ وہ مجھے موت کے گھاٹ اتارنا چاہتے ہیں۔ میں بڑی مشکل سے ان سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہو پایا ہوں۔"

"تم رستم خان اور بہادر علی کی بات کر رہے ہو؟"

"میں ان کے ناموں سے واقف نہیں ہوں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ کرائے کے قاتل ہیں اور میری جان لینا چاہتے ہیں۔"

"ہاتھ نیچے کرلو اور..... میرے ساتھ آؤ۔" میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ اس نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کی۔

میں نے شازیہ کو ہدایت کی کہ کسی پریشانی میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ وہ واش روم سے فارغ ہو کر امی کے پاس جائے۔ میں اس نوجوان کا انٹرویو کرنے کے بعد انہی کے پاس آتا ہوں۔

شازیہ نے اثبات میں گردن ہلائی اور میں فیصل نامی اس نوجوان کو اپنے ساتھ لے کر ڈرائنگ روم میں

آ گیا۔ ویسے میں نے اس کے جسم کو ٹٹول کر اچھی طرح اطمینان کرلیا تھا کہ اس کے پاس ایسی کوئی شے نہیں تھی جس سے مجھے اور میری فیملی کو کوئی نقصان پہنچ سکتا ہو۔ وہ ہر قسم کے اسلحے سے پاک تھا۔ ہم ڈرائنگ روم میں آمنے سامنے بیٹھ چکے تو میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے سوال کیا۔

"تم رستم خان اور بہادر علی سے ناواقفیت ظاہر کر رہے ہو مگر ان کا دعویٰ ہے کہ تم ایک شاطر چور ہو اور ان کے گھر سے جیولری اور قیمتی اشیاء چرا کر فرار ہوئے ہو..... یہ کیا ماجرا ہے؟"

"سر! آپ میری تلاشی لے لیں۔" وہ مسکین سی صورت بناتے ہوئے بولا۔ "وہ دونوں سراسر جھوٹ بول رہے ہیں۔ وہ اسی بہانے آپ کے گھر میں داخل ہو سکتے تھے....." لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک جھرجھری لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے، میں ان کے ہتھے نہیں چڑھا۔ وہ تو مجھے دیکھتے ہی گولی مار دیتے۔" بات ختم کرکے وہ سراسیمہ نظروں سے مجھے تکنے لگا۔

مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ فیصل مجھ سے دروغ گوئی نہیں کر رہا تھا۔ مجھے اس کی باتوں میں دلچسپی محسوس ہوئی تو میں نے پوچھ لیا۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے رستم خان اور بہادر علی نے گھر کا چپہ چپہ چھانا ہے۔ وہ تمہیں ڈھونڈنے کے لیے واش روم بھی گئے تھے۔ اگر تم وہیں چھپے ہوئے تھے تو انہیں نظر کیوں نہیں آئے؟"

"میں پانی والے بڑے ڈرم کے اندر چھپ گیا تھا۔" وہ عام سے لہجے میں بولا۔ "اوپر سے ڈھکنا بھی بند کرلیا تھا۔ وہ جیسے ہی آپ کے گھر سے رخصت ہوئے میں ڈرم سے باہر نکل آیا۔"

ان دنوں لائن کے پانی کی خاصی شارٹیج چل رہی تھی۔ لہٰذا میں نے اضافی پانی کے ذخیرے کے لیے ایک بڑا ڈرم لاکر واش روم کے کونے میں رکھ دیا تھا اور اتفاق سے اس وقت وہ ڈرم خالی تھا۔ فیصل نے اپنی جان بچانے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ اگرچہ تھوڑا رسکی تھا اگر اسے زیادہ دیر ڈرم کے اندر بند بیٹھنا پڑتا تو اس کی سانس بھی رک سکتی تھی تاہم اس تدبیر سے اس کی عقل مندی ثابت ہوتی تھی۔

"فرض کرو میں تمہاری کہانی پر یقین کرلیتا ہوں۔" میں نے بہ دستور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "پھر تمہیں پوری سچائی کے ساتھ بتانا ہوگا کہ وہ دونوں افراد جو تمہارا تعاقب کر رہے تھے وہ کون تھے اور ان کی تم سے کیا دشمنی ہے۔ وہ کیوں تمہاری جان لینا چاہتے ہیں۔"

"جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں، وہ دونوں کرائے کے قاتل ہیں۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "آنٹی نرگس نے انہیں میرے پیچھے لگا رکھا ہے۔ وہ پہلے بھی مجھے قتل کرنے کی دو کوششیں کر چکے ہیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے مجھ پر گاڑی چڑھا دی تھی۔ دوسری بار نیٹی جیٹی کے پل سے دھکا دے کر سمندر میں گرانے کی ٹرائی ماری تھی، لیکن میری قسمت نے ساتھ دیا اور میں دونوں دفعہ بچ گیا بلکہ..... آج تیسری بار میں ان کے شر سے بال بال بچا ہوں۔" بات کے اختتام پر اس نے ایک خوف زدہ جھرجھری لی۔

"تم نے بتایا ہے کہ وہ دونوں کسی آنٹی نرگس کے ایما پر تمہاری جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔" میں نے پوچھا۔ "یہ آنٹی نرگس کون ہے؟"

"آنٹی بہت ہی ذلیل اور کمینی عورت ہے۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ "اور بدقسمتی سے وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میری سوتیلی ماں بھی ہے۔"

فیصل کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہوئے۔ ان لمحات میں وہ مجھے بہت ہی بے بس اور لاچار نظر آیا میں نے استفسار کیا۔

"کیا تمہارے باپ کو ان سنگین حالات کی خبر ہے؟"

"اونہہ.....!" اس کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں پھوٹیں اور وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ "ڈیڈی کو دنیا میں نرگس کے سوا اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ پتا نہیں' اس مکار عورت نے ڈیڈی پر کون سا جادو کر دیا ہے۔"

میرے استفسار پر اس نے مزید بتایا کہ اس کی والدہ مہرالنساء کے انتقال کے کچھ ہی عرصہ بعد اس کے باپ شیخ افضل نے دوسری شادی کر لی تھی بلکہ فیصل کا دعویٰ تھا کہ نرگس نے اپنی اداؤں سے شیخ افضل کو پھانسا تھا۔ فیصل کی نظر میں نرگس اچھے کردار کی مالک نہیں تھی۔ اس نے ایک سازش کے تحت شیخ افضل سے شادی کی تھی۔ شیخ افضل کا فرنیچر کا بزنس تھا اور وہ ایک عالی شان بنگلے میں رہائش پزیر تھا۔ نرگس کے حصول مقاصد کی راہ میں صرف ایک رکاوٹ تھی یعنی' فیصل۔ فیصل شیخ افضل کی اکلوتی اولاد تھا۔ اگر نرگس کسی طرح فیصل کا کانٹا نکالنے میں کامیاب ہو جاتی تو پھر اسے شیخ افضل کی دولت' جائیداد اور کاروبار پر گرفت حاصل کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہوتی۔ نرگس نے اپنی کامیاب چالوں کی مدد سے شیخ افضل کی نگاہ میں فیصل کو نکما' نالائق اور ہڈحرام ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ افضل اپنے بیٹے کو ناپسندیدہ نظر سے دیکھنے لگا تھا تاہم یہ بات طے تھی کہ جب تک فیصل زندہ تھا' نرگس کا منصوبہ پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔

نرگس کو اچھی طرح یہ بھی محسوس ہو گیا تھا کہ فیصل اس کے عزائم سے واقف ہو چکا ہے۔ لہٰذا اب وہ فیصل کا قصہ پاک کرانے کے چکر میں تھی۔

میں نے بڑی توجہ سے فیصل کی داستانِ غم سنی اور اس کے خاموش ہونے پر سوال کیا۔ "کیا تم پڑھتے ہو؟"

"یس سر!" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "میں میٹرک کا اسٹوڈنٹ ہوں۔"

میں نے حیرت سے اسے سرتاپا دیکھا اور پوچھا۔ "تمہاری عمر کیا ہے؟"

میرے محتاط اندازے کے مطابق' وہ لگ بھگ بیس سال کا تھا جبھی مجھے اس کے جواب پر اچنبھا ہوا تھا۔ اس نے میری توقع کے خلاف جواب دیا۔

"سر! میں پندرہ سال کا ہوں.....!"

"اوہ.....!" میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور فیصل سے پوچھا۔ "تمہارے ڈیڈی کا فرنیچر کا بزنس کہاں پر ہے؟"

"نرسری کی فرنیچر مارکیٹ میں۔" اس نے بتایا۔

"اور تمہاری رہائش کہاں ہے؟"

"انکوائری آفس کے قریب۔" وہ بڑے اطمینان سے بولا۔

"اور تم ادھر پیٹرول پمپ پر کیا کر رہے تھے؟"

"پیٹرول پمپ کے حوالے سے ان بدمعاشوں نے آپ سے جھوٹ بولا ہے۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "میں ادھر اپنے ایک دوست سے ملنے آیا ہوا تھا۔ میرے دوست کا نام اشتیاق ہے۔ اس کے باپ کی پشاوری چپل کی دکان ہے۔ وہ جو مین روڈ پر ایک لائن سے چپلوں کی دکانیں....."

"ہاں' ہاں..... میں سمجھ گیا ہوں۔" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "آگے بتاؤ؟"

"دوست کے پاس مجھے خاصی دیر ہو گئی۔" وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "جب میں روڈ کراس کر کے واپسی کے لیے بس کا انتظار کر رہا تھا تو آنٹی نرگس کے غنڈوں نے مجھے دیکھ لیا اور میں نے دوڑ لگا دی۔ اس کے بعد جو ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔" بات کے اختتام پر اس نے کندھے اچکا دیئے۔

میں نے کہا۔ "یہ صورت حال تو خاصی سنگین ہے۔ باہر چاروں طرف تمہارے لیے خطرات ہیں۔ اب تم کیا کرو گے؟"

"مجھے یقین ہے کہ وہ دونوں مایوس ہو کر کہیں چلے گئے ہوں گے۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "اللہ کا شکر ہے کہ میں ایک مرتبہ پھر ان کے شر سے محفوظ رہا ہوں۔ سر! میری وجہ سے آپ کو اور آپ کی فیملی کو آدھی رات کو جو زحمت اٹھانا پڑی اس کے لیے میں بہت شرمندہ ہوں۔ آپ مجھے اجازت دیں۔ اب میں چلوں گا۔" بات کے اختتام پر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھ جاؤ!" میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "اگر تمہارا یقین درست نہ نکلا اور وہ دونوں قاتل اندھیرے میں کہیں گھات لگائے تمہارا انتظار کر رہے ہوئے تو پھر تم کیا کرو گے؟"

ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر سراسیمگی نمودار ہوئی پھر قدرے سنبھل کر بولا۔ "میرا خیال ہے اب ان سے میرا سامنا نہیں ہو گا۔ ویسے بھی میں گھر نہیں جا رہا.....!"

"گھر نہیں جا رہے!" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "پھر کہاں جانے کا ارادہ ہے؟"

"میں اپنی خالہ قمرالنساء کے گھر جاؤں گا۔" اس نے واضح انداز میں بتایا۔ "خالہ کی رہائش حیدری کے علاقے میں ہے۔ میرا خالو پولیس میں سب انسپکٹر ہے۔ میں سوچ رہا ہوں پانی سر سے اونچا ہو رہا ہے۔ اب مجھے مشتاق خالو کو ساری صورت حال سے آگاہ کر دینا چاہیے۔ خالو ہی مجھے اس مصیبت سے نکال سکتے ہیں۔"

"تمہارا ارادہ تو نیک ہے اور دیر ہی سے سہی' بہرحال تم نے یہ عقل مندی کا فیصلہ کیا ہے۔" میں نے سراہنے والی نظر سے اسے دیکھا۔ "تمہاری آنٹی نرگس کے غنڈوں سے کوئی پولیس والا ہی صحیح طور نمٹ سکتا ہے۔" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری جیب میں پیسے کتنے ہیں؟"

"کیوں.....؟" وہ محتاط نظروں سے مجھے تکنے لگا۔

"رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔" میں نے اس کی تشفی کرتے ہوئے کہا۔ "اس وقت حیدری جانے کے لیے تمہیں کوئی بس وغیرہ تو ملے گی نہیں۔ وہاں پہنچنے کا واحد ذریعہ رکشا یا ٹیکسی ہی ہے اور یہ لوگ منہ مانگا کرایہ وصول کریں گے۔ میں نے اسی خیال کے پیش نظر تم سے سوال کیا تھا۔"

"آپ فکر نہ کریں سر۔" وہ اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "میری جیب میں دو ڈھائی سو تو ہوں گے ہی۔"

"تب ٹھیک ہے۔" میں اٹھ کھڑا ہو گیا۔ "میں تمہیں مین روڈ سے رکشا یا ٹیکسی میں بٹھا آتا ہوں۔ اس طرح مجھے بھی اطمینان رہے گا کہ تم صحیح سلامت اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئے ہو۔"

اس نے کوئی اعتراض نہ کیا اور میری تقلید میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے امی کو تازہ ترین صورتِ حالات سے آگاہ کیا اور فیصل کو اپنی معیت میں مین روڈ تک لے آیا۔ گلی میں اور مین روڈ پر سب خیریت رہی۔ میری چوکنا نگاہ رستم خان اور بہادر علی کو راستے بھر کھوجتی رہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ اگر فیصل کی درد بھری کہانی پر من وعن یقین کرلیا جاتا تو پھر باہر اس کے لیے ہر طرف خطرہ ہی خطرہ تھا۔ بہرحال اللہ کے فضل وکرم سے کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہ آیا اور اتفاق سے ایک ایسی ٹیکسی مل گئی جس کا ڈرائیور میرا شناسا تھا۔ وہ مناسب پیسوں میں حیدری جانے کے لیے آمادہ ہوگیا۔ میں نے مذکورہ ڈرائیور سے کہا۔

"فیصل میرا مہمان ہے۔ اس کو صحیح سلامت منزل تک پہنچانا تمہاری ذمے داری ہے۔"

"آپ بالکل فکرمند نہ ہوں۔" ڈرائیور نے کہا۔

"آپ پندرہ بیس منٹ کے بعد فون کرکے اپنے مہمان کے ٹھیک ٹھاک منزل پر پہنچنے کی تصدیق کرلینا۔"

فیصل نے ٹیکسی میں بیٹھنے سے پہلے میرا بے حد شکریہ ادا کیا اور بڑی امید بھرے لہجے میں مستفسر ہوا۔

"سر! آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"اسد..... اسداللہ۔" میں نے جواب دیا۔

"سر! آج آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے میں اسے زندگی بھر یاد رکھوں گا۔" وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔ "اگر کبھی زندگی نے موقع دیا تو میں آپ کا یہ احسان چکانے کی کوشش کروں گا۔"

"پہلی بات تو یہ کہ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "دوسری بات یہ کہ اگر تم اسے احسان ہی سمجھتے ہو تو اس وقت کے انتظار میں نہ رہنا کہ زندگی میں کبھی مجھے تمہاری ضرورت پیش آئے تم یہ احسان کسی کے بھی کام آکر اتار سکتے ہو۔"

وہ مجھ سے بغل گیر ہوتے ہوئے جذباتی لہجے میں بولا۔ "سر! آپ بہت عظیم انسان ہیں....."

"عظیم صرف خدا کی ذات ہے۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "باقی ہم سب انسان ہیں اور بہ وقت ضرورت ہر انسان کو دوسرے انسان کے کام آنا چاہیے۔ جب ہم کسی کی مشکل میں خلوصِ نیت سے اس کی مدد کرتے ہیں تو قدرت کے پاس ہمارا یہ بے لوث عمل ریکارڈ ہوجاتا ہے پھر جب کبھی ہم مشکلات کا شکار ہوتے ہیں تو وہ قادرِ مطلق ہماری مدد کا کوئی وسیلہ پیدا کردیتا ہے۔"

وہ آب دیدہ ہوگیا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے ٹیکسی میں سوار کیا اور ہاتھ ہلاتے ہوئے اس نصیحت کے ساتھ رخصت کردیا۔

"یہ زندگی خدا کی امانت ہے۔ اس کی حفاظت اور دیکھ بھال ہماری ذمے داری ہے۔ مجھے امید ہے تم اپنے مشتاق خالو کی مدد سے جلد از جلد اپنی زندگی کے گرد منڈلاتے ہوئے خطرات کا سدباب کروگے۔"

واپس گھر آکر میں نے امی اور شازیہ کو فیصل کی مصائب زدہ زندگی کے حالات سے مختصراً آگاہ کیا اور سونے کے لیے ڈرائنگ روم میں آگیا۔ جب میں اپنی مخصوص جگہ پر لیٹا تو فیصل کی سوچ میرے ذہن میں موجود تھی۔ اس وقت رات کے لگ بھگ دو بجے تھے اور میں ان خیالات کے ساتھ الجھا ہوا تھا کہ دولت کتنی عجیب وغریب شے ہے۔ اس کے حصول کی خاطر لوگ تمام اخلاقی حدود کو پھلانگ جاتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر کسی انسان کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتے جیسا کہ فیصل کی سوتیلی ماں آنٹی نرگس شیخ افضل کی دولت، جائیداد اور کاروبار پر قبضہ کرنے کے لیے ہر اوچھا ہتھکنڈا آزما رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ نیند مجھے اپنی آغوش میں دبوچ لیتی، فرحانہ چھم سے میرے تصور میں روشن ہوگئی۔ آج وہ ایک نئے رنگ ڈھنگ سے میری زندگی میں آئی تھی۔ آج تک میں نے اس کے بے زبان احساسات سے جو کچھ سمجھا تھا اس کا فرحانہ نے عملی

مظاہرہ کرکے دکھادیا تھا۔ اس کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ اس کے حسین بدن کے اندر اٹھنے والے طوفان کو اچانک جذبات کی زبان مل گئی تھی۔ وہ ایک بڑا خطرہ مول لے کر رات کی تاریکی میں اظہارِ محبت کرنے میری خلوت میں اتر آئی تھی۔ اس کی جذبات کے بوجھ تلے دبی آواز ابھی تک میری سماعت میں نقرئی گھنٹیاں بجارہی تھی۔ میری یادداشت اس کے اظہار کو فراموش نہیں کرسکتی تھی۔

"میں نے جو کچھ کیا، آپ کی محبت سے مجبور ہوکر کیا ہے..... آئی لو یو اسد!"

اس نے اتنی بڑی بات کتنی آسانی سے کہہ دی تھی۔ اظہارِ محبت کی پہل عموماً مرد کی طرف سے ہوا کرتی ہے۔ میرے ضمیر نے ملامت کی۔

"اسدؔ! جو کام تمہارے کرنے کا تھا وہ اس ناتواں پستہ قامت لڑکی نے کر ڈالا۔ تمہاری مردانگی کہاں سوئی ہوئی تھی؟"

عقل عیار ہے۔ دماغ نے ضمیر کی کھنچائی کے جواب میں کہا۔ "کسی کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنا دوسری بات ہے اور اس سے محبت ہوجانا دوسری بات۔ یہ ٹھیک ہے کہ فرحانہ کو مجھ سے محبت ہوگئی ہے لیکن میں نے اسے ہمیشہ ایک اچھی ہونہار اسٹوڈنٹ کی نظر سے دیکھا ہے۔"

بائیں پہلو میں موجود دل نے دھڑک کر گواہی دی۔ "اسد! منافقانہ تاویلوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ تمہیں فرحانہ سے محبت تھی، محبت ہے اور ہمیشہ محبت رہے گی۔ تمہارے مزاج کی احتیاط پسندی نے کبھی تمہیں اظہارِ محبت کرنے کا موقع نہیں دیا جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ لڑکی تمہاری روح کی گہرائیوں میں اتری ہوئی ہے۔"

میں نے معقولیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے دل کا فتویٰ تسلیم کرلیا۔ میرا تجربہ ہے کہ دل جھوٹ نہیں بولتا۔ اس تسلیم ورضا کے بعد بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔

"فرحانہ..... آئی لو یو ٹو....."

اب فرحانہ کی ذات کے حوالے سے میرا ذہن کلیئر تھا۔ اس نے دو گھنٹے پہلے مجھے جذبات اور احساسات کی جن نشاط انگیز منزلوں سے گزارا تھا وہ میری زندگی کا گراں قدر سرمایہ تھا۔ میں ابھی تک اپنی پیشانی پر اس کے گلاب ہونٹوں کی کیف آور تپش کو محسوس کررہا تھا۔ یہ خوش گوار حرارت میرے لہو میں شامل ہوکر رگ رگ اور نس نس میں دوڑ رہی تھی۔

پتا نہیں، کب مجھے نیند آئی۔ ہوش وحواس کے آخری لمحات تک میں فرحانہ کی دل نشیں رفاقت میں یادوں سے لپٹ کر اپنے قلب وجگر کو ان جانی مسرتوں اور آفاقی لذتوں سے روشناس کراتا رہا تھا۔ پھر انہی یادوں کے جلو میں، میں نیند کی گداز اور مہربان وادی میں اتر گیا تھا.....!

○.....○.....○

دن کے گیارہ بجے تھے۔ میں اور خوش ولی، عاطف رشید کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ عاطف صاحب بھی اپنی مخصوص کرسی پر موجود تھے۔ عاطف رشید "برہانی ٹریڈرز" کے ایم ڈی تھے۔ یہ میری ان سے دوسری ملاقات تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں، میں ان کی شخصیت سے مرعوب ہوگیا تھا۔ متاثر کن شخصیت کا مالک یہی عاطف رشید اس وقت گمبھیر صورتِ حالات میں گھرا دکھائی دیتا تھا کیونکہ پچھلے آدھے گھنٹے میں خوش ولی اور میں نے نہایت ہی جامع الفاظ میں اسے خالد رشید کی فارماسیوٹیکل کمپنی میں ہونے والی سنگین گڑبڑ سے آگاہ کردیا تھا۔

"اگر یہ سب صد فیصد درست ہے جیسا کہ آپ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لوگوں نے بیان کیا ہے تو میں سمجھتا ہوں' معاملہ بڑا تشویش ناک..... بلکہ خطرناک ہے۔"

"سر!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے خالد صاحب کی فیکٹری میں کام کرنے کے دوران میں اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا اور جو محسوس کیا اس کی روشنی میں خوش ولی سے تعاون کی درخواست کی تھی۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔"

"میں نے بڑی جاں فشانی سے ڈیلیوری وین کا تعاقب کیا تھا سر۔" خوش ولی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "میرا مشاہدہ اور تجربہ یہ بتاتا ہے کہ آپ کے بھائی کی فارماسیوٹیکل کمپنی میں اندر کے چند بااثر افراد جعلی ادویات کے اس گھناؤنے کھیل میں ملوث ہیں اور....." لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"اور..... میں سمجھتا ہوں ان کالی بھیڑوں کو پکڑنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔"

"میں تمہاری رائے سے متفق اور مطمئن ہوں نوجوان۔" عاطف رشید نے گہری ستائشی نظر سے خوش ولی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس بعض ایسے چیتا صفت افراد موجود ہیں جن کو اگر میں یہ مشن سونپ دوں تو وہ دو چار دنوں میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے رکھ دیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ....." ذرا رک کر عاطف رشید نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"کہ تم دونوں بھی ایک مخصوص حیثیت سے اس مشن میں شامل رہو۔"

"مخصوص حیثیت سے!" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "میں کچھ سمجھا نہیں سر.....؟"

"میں سمجھاتا ہوں....." وہ نہایت ہی متانت سے بولے۔ "مسٹر اسد اللہ! آپ بھائی صاحب کی کمپنی میں حسبِ معمول اپنے فرائض انجام دیتے رہیں گے اور ڈیلیوری وینز کی نقل و حرکت سے اپنے دوست کو آگاہ کرتے رہیں گے لیکن اتنی خامشی اور احتیاط کے ساتھ کہ آپ کے ساتھ کام کرنے والے کسی شخص کو آپ کی ان سرگرمیوں کی بھنک نہیں پڑنا چاہیے۔"

"میں سمجھ گیا سر۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "ان شاء اللہ! میں کسی بھی مرحلے پر آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ میری احتیاط پسندی ہی نے مجھے آپ کے بھائی صاحب سے بات کرنے کو روکا تھا جبھی میں یہ معاملہ آپ کے پاس لے کر آیا ہوں۔"

"یہ آپ نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا ہے۔" وہ توصیفی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "بھائی صاحب جذباتی اور غصیلے انسان ہیں۔ وہ جوش میں آ کر پلک جھپکتے میں اس کھیل کو بگاڑ دیتے۔"

خوش ولی نے شائستہ لہجے میں پوچھا۔ "میرے لیے کیا حکم ہے سر.....؟"

"آپ بہت کام کے آدمی ہو نوجوان!" وہ کھوجتی ہوئی نظر سے خوش ولی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ خود کو بے روزگار سمجھنا چھوڑ دو۔ آج سے آپ میری کمپنی "برہانی ٹریڈرز" کے پینل پر ہو۔ آپ کی پوسٹ کا فیصلہ بعد میں کیا جائے گا۔ فی الحال' آپ میرے ان آدمیوں کے ساتھ مل کر کام کرو گے جنہیں میں یہ مشن سونپنے والا ہوں۔ آپ کل سے میرے آفس کو جوائن کر رہے ہو..... او کے؟"

"یس سر۔" خوش ولی کی مسرت میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ "یہ آپ کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا سر۔"

"اگر آپ اسے احسان مان رہے ہیں تو اپنی کارکردگی سے اس احسان کو اتارنے کی کوشش کرتے

رہنا۔" عاطف رشید نے کسی فلسفی کے سے انداز میں کہا۔ "میں نیک نیت ایمان دار اور محنتی لوگوں کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ اگر آپ اپنی ان اوصاف حمیدہ کا گاہے بہ گاہے عملی مظاہرہ کرتے رہیں گے تو میری کمپنی میں آپ کو ترقی کرنے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔"

"ان الفاظ کے ساتھ آپ نے مجھے زندگی بھر کے لیے خرید لیا ہے سر۔" خوش ولی تشکر سے بوجھل آواز میں بولا۔ "میں آپ کو کبھی مایوس نہیں کروں گا۔"

"گڈ....." عاطف رشید نے مختصراً کہا۔

ہم مزید پانچ منٹ تک عاطف رشید کے عالی شان آفس میں موجود رہے پھر اس نے ضروری ہدایات کے بعد ہمیں رخصت کر دیا۔

ہم ملٹی اسٹوری بلڈنگ کے آٹھویں فلور سے بہ ذریعہ لفٹ نیچے پہنچے تو دونوں کے چہرے تمتما رہے تھے۔ یہ تمتماہٹ خوشی اور کامیابی کی تھی' حوصلے اور یقین کی تھی۔ میں اس بات پر بہت طمانیت محسوس کر رہا تھا کہ خوش ولی کی بے روزگاری کو فل اسٹاپ لگ چکا تھا۔ "برہانی ٹریڈرز" کے پلیٹ فارم سے وہ ایک خوش حال اور کامیاب زندگی کا آغاز کر سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اس بات کی بھی بے پناہ خوشی تھی کہ عاطف رشید نے میری باتوں کو سنجیدگی اور توجہ سے سنا تھا۔ نہ صرف سنا تھا بلکہ وہ براہ راست اس مشن میں کود پڑے تھے۔ مجھے امید تھی کہ فارماسیوٹیکل کمپنی میں پلنے والی خطرناک سازش بہت جلد بے نقاب ہو جائے گی۔

"یار..... سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کون کس کو ٹریٹ دے۔" خوش ولی نے اظہار مسرت کرتے ہوئے کہا۔ "آج ہم دونوں کی خوشی کا دن ہے۔"

"دیکھ خوش ولی!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "بات اصول کی ہونا چاہیے۔ میں نے تمہیں فیکٹری والے معاملے میں ملوث کرتے وقت واضح الفاظ میں کہا تھا کہ اگر اس پہاڑ کو کھودنے کے بعد چوہے کے بجائے کچھ ایسا برآمد ہوا جس کا تم نے ذکر کیا ہے تو میں تمہیں ایک شان دار ڈنر دوں گا۔"

"تو.....؟" اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"تو یہ کہ....." میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "ابھی اس پہاڑ کی کھدائی میں چند روز لگیں گے۔ اس کے بعد ہی "برآمدات" کو دیکھ کر کوئی فیصلہ کیا جا سکے گا کہ مجھ پر ڈنر واجب ہوا ہے یا نہیں جبکہ تم پر ایک ٹریٹ ڈیو ہو چکی ہے۔" بات ختم کر کے میں زیرلب مسکرا دیا۔

"مجھ پر ٹریٹ....." اس نے حیرت سے آنکھیں پٹ پٹائیں۔ "میں کچھ سمجھا نہیں یار؟"

"برہانی ٹریڈرز" میں تمہاری نوکری پکی ہوئی یا نہیں!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ آج کی سب سے بڑی خوش خبری ہے۔"

"ہاں یار! تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "یہ سب کچھ تمہاری کوششوں کے سبب ہوا ہے۔"

"کسی کی بھی کوشش سے ہوا ہے۔" میں نے اصراری انداز میں کہا۔ "یہ بتاؤ' ٹریٹ بنتی ہے یا نہیں؟"

"یو آر رائٹ بنتی ہے..... بالکل بنتی ہے۔"

"تو پھر آج کا لنچ تمہارے ذمے ہے۔" میں نے کہا۔

"ڈن.....!" وہ جلدی سے بولا۔ "مگر ایک شرط ہے۔"

"کیسی شرط؟" میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

"اس لنچ کے لیے تم مجھے کچھ رقم ادھار دو گے۔" وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سادگی سے بولا۔ ”میں پہلی تنخواہ ملتے ہی تمہارا قرض واپس کردوں گا۔ میں نے ابھی صبح بائیک کی ٹینکی فل کرائی ہے۔ جیب میں سو پچاس ہوں گے جو کسی ایمرجنسی کے لیے رکھے ہیں۔“

خوش ولی کی صاف گوئی نے مجھے متاثر کیا۔ ہمارے بیچ اس درجے کی دوستی تشکیل پا چکی تھی کہ ہم ایک دوسرے سے دروغ گوئی کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔ دوستی کا مطلب ہے..... دو+ستی! یعنی دو افراد کا ایک ساتھ ستی ہونا۔ اس نوعیت کے رشتے میں تکلفات اور روایتی مصلحتوں کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ دوستی من وتو کے درمیان حائل فاصلے کے خاتمے کا نام ہے۔

”ٹھیک ہے دوست!“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”تمہارے اور میرے پیسے کوئی الگ الگ نہیں ہیں۔ بتاؤ‘ کہاں لنچ کرا رہے ہو؟“

”ہمیں اپنی اوقات کے مطابق صدر کا رخ کرنا چاہیے۔“ وہ معتدل انداز میں بولا۔ ”وہاں بہت سے ریسٹورنٹ ہیں۔ کہیں بھی بیٹھ جائیں گے۔“

”زینب مارکیٹ کے قریب ایک بہت اچھا ریسٹورنٹ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے وہاں دو چار بار کھانا کھانے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہاں کی ڈشز لذیذ اور معیاری ہیں۔“

”تو ٹھیک ہے‘ پھر زینب مارکیٹ ہی کی طرف چلتے ہیں۔“ وہ بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ ”آؤ بیٹھو۔“

میں خوش ولی کی بائیک پر بیٹھنے لگا تو مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ میں نے نگاہ گھما کر اپنے گردوپیش کا جائزہ لیا اور میری نظر اس گڑبڑ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی جس کا ایک لمحے پہلے مجھے احساس ہوا تھا۔

میں نے سڑک کی دوسری جانب ایک گاڑی کے پاس اسی سوٹڈ بوٹڈ شخص کو کھڑے دیکھا‘ چند روز پہلے میں نے ایک دھواں دھار مکا چلا کر جس کی ناک سے خون کا فوارہ جاری کردیا تھا۔

وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ دو غنڈہ صورت افراد بھی موجود تھے اور وہ ”صاحب“ ہماری جانب اشارہ کرکے انہیں ہدایات دے رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا کہ وہ صاحب اپنی اس دن کی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے ان غنڈوں سے کوئی کام لینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں ریڈ الرٹ ہوگیا۔ یہ بڑے تحریکی لمحات تھے۔

”خوش ولی! تم زینب مارکیٹ کی طرف جانے کے لیے کون سا راستہ لوگے؟“

”جو تم بولو۔“ اس نے کہا۔ ”میں تو شاہین کمپلیکس سے ٹرن لے کر جانا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے مگر شاہین کمپلیکس سے لیفٹ نہیں‘ رائٹ ٹرن لینا ہے۔“ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اور بائیک کی اسپیڈ بھی ذرا کم رکھنا۔“

”رائٹ ٹرن‘ خیریت تو ہے۔“ وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ”اس جانب تو ریلوے کالونی ہے۔“

”ہاں.....“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یار! میرا کچھ دیر کے لیے ریلوے کی پٹڑی کے ساتھ چہل قدمی کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔ اس طرح بھوک کھل جائے گی اور خوب سیر ہوکر لنچ کرسکوں گا۔“

”یار مذاق نہیں کرو۔“ وہ بائیک ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔

”میں بے حد سنجیدہ ہوں خوش ولی۔“ میں نے متعاقبین پر نگاہ رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”تم رائٹ ٹرن لینے کے بعد پاور ہاؤس کی پارکنگ میں بائیک کھڑی کروگے‘ پھر ہم مزے سے ٹہلتے ہوئے

ریلوے کی پٹڑی کی طرف نکل جائیں گے۔“

”اسد! میں اتنے دنوں کے ساتھ کے بعد تمہیں سمجھنے لگا ہوں۔“ وہ بہ دستور ڈرائیونگ کرتے ہوئے بولا۔ ”تمہاری آواز کا اتار چڑھاؤ بتا رہا ہے کہ تم کسی شدید کارروائی کے موڈ میں ہو.....!“

”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”اس وقت دو موٹر سائیکل سوار ہمارے تعاقب میں ہیں۔ مجھے ان کے ارادے خطرناک نظر آرہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ ہم پر اٹیک کریں‘ میں انہیں گھیرنا چاہتا ہوں اور.....“ میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی اور دونوں متعاقبین کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اضافہ کیا۔

”اور اب تم بائیک کی اسپیڈ بڑھا دو۔ میں نے جو روٹ وضع کیا ہے تمہیں اسی پر چلنا ہے۔ اوکے.....!“

”اوکے باس۔“ خوش ولی نے بڑے اعتماد سے کہا۔

بہ مشکل پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ میں اور خوش ولی ریلوے کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ ٹہلتے ہوئے سٹی اسٹیشن کی سمت بڑھ رہے تھے۔ چند قدموں کے فاصلے پر وہ دونوں غنڈے بھی ہمارے پیچھے چلے آرہے تھے۔ یہ قدرے پرسکون اور بھیڑ بھاڑ سے الگ تھلگ جگہ تھی۔ میں نے یہیں پر ان سے نمٹنے کا فیصلہ کیا اور اچانک پلٹ گیا۔

وہ دونوں میری اس میکانکی حرکت پر ایک لمحے کے لیے ٹھٹکے پھر انہوں نے مجھ پر حملہ کردیا۔ اس حملے میں ایک بے ساختگی تھی جیسے وہ کوئی خودکار مشین ہوں۔ ایک بات کی مجھے حیرت ہوئی کہ انہوں نے خوش ولی کو یک سر نظر انداز کردیا تھا۔ وہ گویا نگلی گیدڑوں کی مانند مجھ پر پل پڑے تھے۔

میں نے ایک کے پیٹ میں زوردار لات رسید کی اور دوسرے کو ہینڈ پش سے پیچھے دھکیل دیا۔ میں نے مارشل آرٹس کی باقاعدہ تربیت تو حاصل نہیں کی تھی تاہم کچھ عرصہ پہلے میں جس کلب میں باڈی بلڈنگ کرنے جاتا تھا‘ وہاں عامر نامی ایک لڑکا بھی آیا کرتا تھا۔ اس سے میری اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی۔ عامر مارشل آرٹس میں بلیک بیلٹ تھا۔ وہ گاہے بہ گاہے مجھے جوڈو اور کراٹے کے داؤ پیچ سکھاتا رہتا تھا جن میں‘ سیلف ڈیفنس سرفہرست تھا۔ اس وقت عامر سے حاصل کی گئی ٹریننگ ہی میرے کام آرہی تھی۔

مجھ سے لات کھانے والا فربہ اندام غنڈہ پیٹ پکڑ کر دہرا ہوگیا۔ اس سے قبل کہ وہ سنبھلتا‘ میں نے اس کے جھکے ہوئے کندھوں پر ایک سائیڈ کک جڑ دی۔ وہ قلابازی کھاتے ہوئے پیچھے کو لڑھک گیا۔

دوسرا حملہ آور جسے میں نے ہینڈ پش کے ذریعے دھکیلا تھا اسے خوش ولی نے سنبھال لیا تھا۔ وہ ایک دبلا پتلا شخص تھا اور خاصا پھرتیلا بھی۔ اس نے بلیو جینز پر ٹی شرٹ پہن رکھی تھی جب کہ مجھ سے پٹنے والا فربہ اندام شلوار قمیص میں تھا۔ میں نے پھرتیلے حملہ آور کو خوش ولی پر بھاری پڑتے دیکھا تو چیتے کی مانند جست بھر کر اس جانب بڑھ گیا۔ اس دوران میں وہ خوش ولی کو زمین پر گرانے میں کامیاب ہوچکا تھا۔ وہ دونوں آپس میں بری طرح گتھم گتھا تھے۔

میں نے اس حملہ آور کو شانوں سے تھام کر خوش ولی کے اوپر سے اتارنے کی کوشش کی تو اگلے ہی لمحے مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے رنگ برنگے تارے سے جھلملاتے محسوس ہوئے۔ اس خبیث نے خوش ولی سے جدا ہوتے وقت اندھا دھند پنچ چلا دیا تھا جو سیدھا میری پیشانی پر آکر لگا تھا۔ اس دوران میں وہ میری گرفت سے نکل چکا تھا۔

مجھے سنبھلنے میں دو سے تین سیکنڈ لگے ہوں گے۔ اس دوران میں دبلا پتلا حملہ آور تن کر میرے سامنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھڑا ہو چکا تھا۔ اس کے اسٹائل سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مارشل آرٹس سے بہ خوبی واقف ہے۔ میں بھی کسی باکسر کے اسٹائل میں اس کے سامنے جم گیا۔

میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے میری پنڈلی پر ایک نیچی کک چلائی۔ میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر خود کو بچایا۔ اگلے ہی لمحے اس نے ایک تیز رفتار راؤنڈ ہاؤس کک میرے چہرے پر ماری۔

میں نے بڑی پھرتی سے اس کی کک کو بلاک کیا۔ میرا چہرہ تو محفوظ رہا تاہم کندھے میں اچھا خاصا جھٹکا آ گیا تھا۔ جواب آں غزل کے طور پر میں نے اس کے سینے پر فرنٹ پش کک رسید کر دی۔

وہ پشت کے بل زمین بوس ہو گیا لیکن اگلے ہی لمحے وہ کسی اسپرنگ کی مانند اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی مستعدی نے مجھے متاثر کیا اور میں نے فوراً اسے تمغائے حسن کارکردگی بھی عطا کر دیا۔

وہ جیسے ہی کھڑا ہوا' میں نے ایک لمبا اسٹیپ لے کر اس کی پسلیوں میں سائیڈ کک جڑ دی۔ وہ کسی فٹ بال کی مانند لڑھکتے ہوئے دور تک چلا گیا۔ اسی لمحے خوش ولی کی تیز چیختی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

اسد...... اپنے پیچھے دیکھو......''

میں نے بجلی کی سی سرعت سے پلٹ کر عقب میں دیکھا۔ مجھ سے پٹنے والا فربہ اندام شخص میرے سر پر پہنچ چکا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار والا خنجر بھی چمک رہا تھا۔ اس نے آنِ واحد میں مجھ پر خنجر کا خطرناک وار کر دیا۔

اگر مجھے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو اس خنجر کا وار میرا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیتا۔ میں نے میکانکی انداز میں اپنی گردن کو پیچھے جھکایا۔ خنجر میرے چہرے سے سوت بھر کے فاصلے سے ''زن'' کر کے گزرا۔ میں خمیدہ کمر کے ساتھ ہی ایک طرف کو رول کر گیا۔ اس طرح مجھے حملہ آور سے ذرا دور جانے کا موقع مل گیا۔

بس' میرے لیے اتنی سی مہلت کافی تھی۔ میں بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور اپنی آنکھیں حملہ آور کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ وہ اپنی ناکامیابی پر جھلایا ہوا تھا لہٰذا بڑے بے ڈھنگے انداز میں وہ ایک بار پھر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس مرتبہ اس نے خنجر کو میرے پیٹ میں اتارنے کی کوشش کی تھی۔ اس موقع پر اگر مجھ سے ایک لمحے کی غفلت بھی ہو جاتی تو میری آنتیں پیٹ سے باہر تھیں۔

میں نے سیلف ڈیفنس کی ٹیکنیکس کو ذہن میں رکھتے ہوئے پیٹ کو کھینچ کر کمر سے لگا لیا۔ اس کے ساتھ ہی اچھل کر بیک اسٹیپ لیتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے حملہ آور کی اس کلائی کو گرفت میں لے لیا جس ہاتھ میں اس نے خنجر تھام رکھا تھا۔ کلائی پر قابو پاتے ہی میں نے ایک زوردار جھٹکا دیا۔

وہ پہلے ہی حملے کی جھونک میں آگے کو جھکا ہوا تھا۔ میرے جھٹکے نے اس کا رہا سہا توازن بھی بگاڑ دیا۔ وہ منہ کے بل ریلوے لائن کی پتھریلی زمین کی طرف آیا۔ اسی لمحے میں نے اس کی ناک پر دائیں گھٹنے سے ایک کاری ضرب لگائی۔ وہ جنگلی بھینسے کی مانند ڈکرایا اور پشت کے بل زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ اس کے حلق سے ایسی آوازیں خارج ہو رہی تھیں جیسے کسی جانور کی گردن پر چھری پھیر کر اسے ٹھنڈا ہونے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہو۔ ان اذیت ناک حالات سے دوچار ہونے کے دوران میں خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔

خوش ولی نے لپک کر وہ خنجر اٹھا لیا اور نشانہ تاک کر اس شخص کی جانب پھینکا جو جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔ میری مارا ماری کے دوران میں دبلا پتلا حملہ

آور سنبھل چکا تھا اور اپنے ساتھی کی مدد کرنے کے لیے تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی یہ کوشش سرخ رونہ ہو سکی۔ خوش ولی کا پھینکا ہوا خنجر اس کے سینے میں ترازو ہو گیا تھا۔

اس کے حلق سے ایک بھیانک چیخ برآمد ہوئی اور وہ اپنا سینہ تھامتے ہوئے زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے چلا کر کہا۔

''خوش ولی...... بھاگو۔ آپ ایک لمحہ بھی یہاں رکنا ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔''

خوش ولی نے میری آواز پر لبیک کہا۔ ہم آگے پیچھے بھاگتے ہوئے سٹی اسٹیشن کی جانب بڑھنے لگے۔

خوش ولی کی بائیک پاور ہاؤس کی پارکنگ میں کھڑی تھی اور ہم نے اس کی مخالف سمت میں دوڑ لگا رکھی تھی اور یہ میں ایک خاص وجہ سے کر رہا تھا۔ واپسی کا سفر ہمارے لیے خطرات سے بھرا ہوا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس طرف ان غنڈوں کا پشت پناہ کہیں گھات لگائے کھڑا ہو۔ اپنے آدمیوں کی ناکامیابی پر اگر وہ جھنجلا کر ہم پر بے دریغ فائرنگ شروع کر دیتا تو ہمارے لیے اپنا بچاؤ کرنا ممکن نہ رہتا۔

''کیا ہم سٹی اسٹیشن کی طرف جا رہے ہیں؟''

خوش ولی نے میرے پہلو میں دوڑتے ہوئے پوچھا۔

میں نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔

''نہیں......!''

''پھر؟'' اس کے استفسار میں استعجاب بھی شامل ہو گیا۔

''بس' ہماری منزل آ گئی ہے۔'' میں نے رفتار کم کر کے دائیں دیوار کی سمت بڑھتے ہوئے کہا۔

یہ آدم قد دیوار آئی آئی چندریگر روڈ کے کنارے واقع بلند و بالا عمارتوں کے عقبی حصے میں تھی۔ خوش ولی کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''ہماری منزل آ گئی ہے...... کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''ہم یہاں سے دیوار پھلانگ کر دوسری طرف کود جائیں گے۔'' میں نے مذکورہ دیوار کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس سے زیادہ محفوظ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔''

میں دیوار کو جس مقام سے پھلانگنے کا ارادہ رکھتا تھا وہاں تھوڑے فاصلے سے بلاک نکلے ہوئے تھے۔ میں نے کئی بار یہاں سے لوگوں کو پھلانگتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ بلاکس اسی مقصد سے نکالے گئے تھے تاکہ ان خالی جگہوں میں پاؤں پھنسا کر دیوار کے اوپر چڑھنے میں آسانی رہے۔ ہم یکے بعد دیگرے دیوار پر چڑھے اور دوسری سمت کود گئے۔

کسی نے ہماری اس حرکت کا نوٹس نہیں لیا۔ وہ لوگ اس نوعیت کی سرگرمیوں کے عادی تھے۔ دوسری طرف ایک لائن سے بائنڈنگ خانے بنے ہوئے تھے۔ مختلف ڈائجسٹ و رسائل کی یہاں کٹنگ اور بائنڈنگ ہوتی تھی۔ یہ ساری گلیاں میری دیکھی بھالی تھیں۔ یہاں زیادہ تر پرنٹنگ پریس لگے ہوئے تھے۔

ہم اطمینان سے چلتے ہوئے پریس چیمبرز کی طرف آئے اور گھوم کر مین میکلو روڈ (آئی آئی چندریگر روڈ) کی جانب بڑھنے لگے۔ خوش ولی نے کہا۔

''ہمیں سب سے پہلے اپنی بائیک لینا ہو گی۔''

''نہیں!'' میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''ذرا گرد بیٹھ جائے' پھر بائیک کو بھی دیکھ لیں گے۔ وہ پاور ہاؤس کی پارکنگ میں بالکل محفوظ ہے۔ اس کے حوالے سے تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''تو پھر ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' خوش ولی نے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"زینب مارکیٹ والے ریسٹورنٹ کی طرف۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "ان کمینوں کے ساتھ جو کسرت کی ہے اس نے میری بھوک چمکادی ہے۔"

"میری بھی۔" وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولا۔

ہم مارا ماری میں ایک آدھ بار زمین پر بھی گرے تھے تاہم ہمارے لباس کا حلیہ بگڑنے سے بچ گیا تھا۔ اس مقام پر دھول مٹی زیادہ نہیں تھی۔ بس کپڑے جھاڑے اور سب ٹھیک ہوگیا' ہم نے ایک رکشا پکڑا اور اپنے مطلوبہ ریسٹورنٹ پہنچ گئے۔

میں واش بیسن پر ہاتھ منہ دھونے لگا تو پیشانی میری نگاہ میں آ گئی جہاں ایک ننھا سا گومڑ نمودار ہو چکا تھا اور اس میں سے ٹیسیں بھی اٹھ رہی تھیں۔ یہ تحفہ مجھے دبلے پتلے حملہ آور نے دیا تھا۔ اس کے بے دھیانی میں مارے گئے پنچ نے مجھے دن میں تارے دکھادیئے تھے۔ میں نے دانت پیسے اور کھانے کی ٹیبل پر آ گیا۔

مجھے اس ریسٹورنٹ میں پہلے بھی کئی مرتبہ کھانے کا اتفاق ہوا تھا تاہم خوش ولی کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ ریسٹورنٹ کے خواب ناک اور پرسکون ماحول میں وہ چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔ ویٹر ہمارا آرڈر سرو کر کے چلا گیا تو میں نے پوچھا۔

"یار کہاں کھوئے ہوئے ہو؟"

"ہوں....." وہ چونکا۔ "یار! میں اس آدمی کے بارے میں سوچ رہا ہوں جس کی طرف میں نے خنجر پھینکا تھا اور..... اور وہ خنجر اس کے سینے میں پیوست ہوگیا تھا۔ اگر وہ مرمرا گیا تو.....!"

"پہلی بات تو یہ کہ تم نے ارادتاً اس کی جان لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔" میں نے خوش ولی کی دماغی کیفیت کے پیش نظر کہا۔ "تم نے جو کچھ بھی کیا وہ حفاظت خود اختیاری میں آتا ہے لہٰذا اگر وہ اس مہلک وار سے زندگی کی بازی ہار جاتا ہے تو تمہیں اپنے ضمیر پر کوئی بوجھ لینے کی ضرورت نہیں....." میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"اس کی موت پر تم یہی سمجھ لینا کہ..... خس کم' جہاں پاک!" وہ چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "اسد! میں سمجھتا ہوں' تم ان دونوں غنڈوں کو اچھی طرح جانتے ہو۔ بتاؤ' کون تھے یہ لوگ اور تم سے ان کی کیا دشمنی ہے؟"

"میں انہیں نہیں بلکہ ان کے پشت پناہ کو جانتا ہوں۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور وہ بھی سرسری سا۔"

"کون پشت پناہ؟" وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"کھانا شروع کرو۔ میں بتاتا ہوں۔" میں نے خود بھی کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تمہیں یاد ہے' جب ہم کچھ عرصہ پہلے "برہانی ٹریڈرز" میں انٹرویو دینے آئے تھے تو میں نے تم سے کسی سوٹڈ بوٹڈ بدد ماغ آدمی کا ذکر کیا تھا.....؟"

"ہاں' ہاں..... یاد ہے۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اور تمہارا اس بدد ماغ شخص سے جھگڑا ہوگیا تھا۔ تم نے ایک طوفانی پنچ مار کر اس کی ناک سے خون جاری کر دیا تھا۔"

"بالکل' میں اسی نامراد کی بات کر رہا ہوں۔" میں نے لذیذ کھانے کے ساتھ انصاف جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ دونوں شیطان اسی کے گرگے تھے۔ جب ہم لوگ "برہانی ٹریڈرز" سے نکل کر بائیک پر سوار ہو رہے تھے تو میں نے سڑک کی دوسری جانب ان دونوں کو اس شخص کے ساتھ پراسرار انداز میں باتیں کرتے دیکھا تھا۔ وہ تینوں بار بار ہماری جانب

بھی دیکھ رہے تھے جبھی میں نے تمہیں شاہین کمپلیکس سے رائٹ ٹرن کی ہدایت کی تھی۔"

"وہ تو بہت ہی کمینہ اور کینہ پرور شخص ثابت ہوا ہے۔" خوش ولی نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ "ذرا سی بات کو اس نے اتنا بڑا ایشو بنادیا ہے۔ آج والے واقعے کے بعد میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ آگے چل کر بھی تمہارے لیے مشکلات کھڑی کرتا رہے گا۔"

"جو سر پر پڑی تھی' وہ نمٹادی ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "آگے بھی جو ہوگا' دیکھا جائے گا۔ ویسے میں تمہاری اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ اس بدبخت نے ذرا سی بات کو بہت بڑا مسئلہ بنالیا ہے۔ بعض لوگ ایسے ہی بدد ماغ اور آنی (انا پرست) ہوتے ہیں کہ اپنے مزاج کے خلاف معمولی سی بات کو بھی برداشت نہیں کر پاتے..... خیر....." میں نے ذرا توقف کر کے ایک ٹھنڈی سانس خارج کی اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"آج ہم نے اس کے بھیجے ہوئے غنڈوں کی جو درگت بنائی ہے اس کی روشنی میں اس کم بخت کو ہر قسم کی مخاصمت سے باز آ جانا چاہیے۔ اگر باز نہیں آئے گا تو بری طرح پچھتائے گا۔ اب کی بار میں اسے ایسا منہ توڑ جواب دوں گا کہ صدیوں یاد رکھے گا۔"

تین بجے کے قریب ہم ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئے پھر آرٹس کونسل کی سمت سے پیدل ہی چلتے ہوئے ہم پاور ہاؤس پہنچ گئے۔ وہاں سب امن وامان تھا۔ خوش ولی نے پارکنگ سے اپنی بائیک نکالی اور ہم اس پر سوار ہو کر رواں دواں ہوگئے۔ خوش ولی نے پہلے مجھے میری گلی میں ڈراپ کیا پھر الوداعی کلمات کے بعد وہ اپنے گھر کی طرف نکل گیا۔

میں نے آج صبح ہی فیکٹری فون کر کے چھٹی لے لی تھی۔ خلاف معمول میں وقت سے پہلے گھر پہنچا تو امی کو تشویش ہوئی۔ وہ میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے مستفسر ہوئیں۔

"خیریت تو ہے بیٹا۔ آج اتنی جلدی گھر آ گئے۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"میں ٹھیک ہوں امی۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "سر میں معمولی سا درد ہو رہا تھا اس لیے جلدی چھٹی لے کر گھر آ گیا ہوں۔"

"معمولی سا درد....." وہ تنقیدی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولیں پھر اچانک چونک پڑیں۔ "یہ..... یہ تمہاری پیشانی پر کیا ہوا ہے۔ یہ گومڑ کیسا ہے؟"

امی کی متلاشی نگاہ درست مقام تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ میں ماتھے پر ابھر آنے والے گومڑ کو چھپا نہیں سکتا تھا تاہم اس کے سبب کو چھپانا میرے اختیار میں تھا۔ میں نے امی کے متعدد سوالات کے جواب میں کہا۔

"سر درد اسی گومڑ کی وجہ سے ہے امی میں....."

"کیا کسی سے دنگا فساد کر کے آ رہے ہو؟" میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی انہوں نے پوچھ لیا۔

"نہیں امی۔" میں نے جلدی سے نفی میں گردن ہلائی۔ "یہ چوٹ ادھر فیکٹری میں لگی ہے۔ آپ فکر نہ کریں' صبح تک سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"کیسے فکر نہ کروں۔" وہ تشویش بھرے لہجے میں بولیں۔ "ماتھا سجا کر گھر آیا ہے۔ پتا نہیں کیسے الٹے سیدھے کاموں میں پڑا رہتا ہے۔"

"امی! الٹے سیدھے کاموں کی کیا بات ہے۔" میں نے قدرے بیزاری سے کہا۔ "جب انسان کام کرے گا تو اسے چوٹ بھی لگے گی۔ میں اس فارما سیوٹیکل کمپنی میں کوئی ایگزیکٹو کی پوسٹ پر کام نہیں کر رہا جو سارا دن آرام سے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھا رہوں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

امی کی آنکھوں میں جذبات کی ندی امڈ آئی۔ وہ ممتا سے لب ریز لہجے میں بولیں۔ ”میرا پروردگار ایک دن تمہیں ایگزیکٹیو کی پوسٹ پر بھی ضرور بٹھائے گا۔ تم دیکھ لینا۔ ان شاءاللہ!“

”اللہ آپ کی زبان مبارک کرے امی۔“ میں نے مختصر کہا۔

”اب تم جلدی سے جا کر اس گومڑ پر برف کی ٹکور کرو تاکہ سوجن اترے۔“ امی نے مشفقانہ انداز میں کہا۔ ”اور کوئی پین کلر بھی لے لینا..... اور ہاں اب تم گھر میں آرام کرو۔ میں شازیہ سے کہہ کر تمہارے لیے سوپ بنوائی ہوں۔“

”وہ شیطان ہے کہاں۔“ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”گھر میں تو نہیں ہے ورنہ دکھائی دے جاتی۔“

”وہ تھوڑی دیر پہلے بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر فارغ ہوئی تھی۔“ امی نے بتایا۔ ”اپنی دوست کے پاس پڑوس میں گئی ہوئی ہے۔“

پڑوس میں شازیہ کی ایک ہی دوست تھی یعنی فرحانہ۔ امی نے اس کا ذکر کیا تو مجھے اپنے پورے وجود میں ایک کرنٹ سا دوڑتا محسوس ہوا۔ اس کے تصور سے میرا تن بدن مہک اٹھا تھا۔ مجھے اپنے اندر کیف آور لہریں سی اٹھتی محسوس ہوئیں اور میں فرحانہ کے خیال میں غرق ہو کر رہ گیا۔

”فرحانہ کی امی آئی تھیں دن میں۔“ امی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”پھر.....؟“ میں نے ہونقوں کی مانند سوال کیا۔

”پوچھ رہی تھیں رات کو ہمارے گھر میں کیا اودھم مچا ہوا تھا۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولیں۔ ”انہوں نے شازیہ کی چیخ بھی سن لی تھی۔“

”پھر آپ نے امینہ آنٹی کو کیا جواب دیا؟“ میں نے الجھن زدہ نظروں سے امی کی طرف دیکھا۔

”جواب کیا دینا تھا جو واقعہ پیش آیا تھا وہ سب بتا دیا۔“ امی نے کہا۔ ”فیصل والے واقعے پر وہ افسوس کا اظہار کر رہی تھیں۔“

امینہ بیگم فرحانہ کی والدہ تھیں۔ اگر انسان کے دل میں چور ہو تو ذہن میں طرح طرح کے خدشات اور اندیشے سر اٹھاتے رہتے ہیں۔ رات فرحانہ جس افراتفری میں واپس گئی تھی اس سے میں ڈر رہا تھا کہ اس کے گھر والوں پر اس کی عدم موجودگی کا راز نہ کھل گیا ہو۔ اسی خیال کے پیش نظر میں نے امی سے پوچھا۔

”امینہ آنٹی اور تو کچھ نہیں کہہ رہی تھیں؟“

”نہیں۔“ امی نے نفی میں گردن ہلائی اور بولیں۔ ”جو بھی باتیں ہوئیں وہ تمہیں بتا دی ہیں۔“

میں نے اطمینان بھری سانس خارج کی اور امی کے کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

○.....○.....○

آئندہ دس پندرہ روز بڑے ہنگامہ خیز رہے۔ عاطف رشید نے خوش ولی کو اپنے دو آدمیوں کے ساتھ لگا دیا تھا۔ ان میں ایک بہت اچھا فوٹو گرافر تھا۔ عاطف صاحب نے اسے ایک ہائی ڈیفی نیشن کیمرا بھی دے دیا تھا جو بہت چھوٹا سا تھا مگر رزلٹ کے معاملے میں وہ بلا کی کارکردگی کا حامل تھا۔ میں برابر خوش ولی کو تازہ ترین انفارمیشنز فراہم کر رہا تھا۔ میرے ذاتی اندازے کے مطابق یہ مشن تین چار روز میں مکمل ہو جانا چاہیے تھا لیکن عاطف رشید نہایت ہی تحمل اور ٹھنڈے دماغ سے کام کرنے کے عادی تھے لہٰذا اس سنسنی خیز مشن کی تکمیل میں دو ہفتے سے زیادہ کا وقت لگ گیا۔

ایک روز میں حسب معمول فیکٹری پہنچا تو بہت سی تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں۔ فورمین عظیم احمد، مارکیٹنگ

منیجر، مرزا یاسین بیگ اور اکاؤنٹنٹ انور کی جگہ میں نے نئے چہروں کو کام کرتے دیکھا۔ فیکٹری کے اسٹاف میں ایک عجیب سی سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اتنے بڑے پیمانے پر آفیسرز اسٹاف میں تبدیلی کا سبب کیا ہے۔ مجھے بہ خوبی اندازہ تھا کہ یہ جو بھی تبدیلی دیکھنے کو مل رہی ہے اس کے ڈانڈے کہاں ملتے ہیں لیکن میں اس انداز کی توقع بہ ہر حال نہیں کر رہا تھا۔

موقع ملتے ہی میں نے خوش ولی کو فون کیا اور اسے فیکٹری کی تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا یہ ہوا ہے.....!“

اس کا جواب موجودہ حالات سے لاعلمی کا غماز تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”تو کیا تمہیں ان معاملات کی کچھ خبر نہیں ہے؟“

”بالکل نہیں۔“ وہ قطعیت سے بولا۔ ”اگر مجھے پتا ہوتا تو تم سے کیوں چھپاتا یار.....!“

”تم لوگوں کا مشن کہاں تک پہنچا ہے؟“ میں نے استفسار کیا۔

”وہ تو دو روز پہلے ختم ہو گیا تھا۔“

”ختم ہو گیا تھا۔“ میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”یار! ہم نے اس مشن کی فائنل رپورٹ عاطف صاحب کو دو دن پہلے دے دی تھی۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”ہم نے پچھلے دو ہفتے بڑی جاں فشانی سے فیکٹری سے پی آئی بی کالونی تک اور فیکٹری سے ڈسٹری بیوٹر کے گودام تک ڈیلیوری وینز کا تعاقب کیا تھا۔ فوٹو گرافر سلیم نے تمام اہم مواقع کی مکمل عکس بندی بھی کی تھی۔ یہ ایسے منہ بولتے ثبوت ہیں کہ اس گھناؤنے کام میں ملوث تمام گندے کرداروں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ اس نوعیت کے ٹھوس شواہد کی موجودگی میں کوئی بھی شخص اپنے کالے کرتوتوں سے انکار نہیں کر سکتا۔ ہم نے یہ تمام ثبوت عاطف صاحب کے حوالے کر دیئے تھے۔ انہوں نے ہم سے کہا تھا.....“ وہ لمحے بھر کو سانس ہموار کرنے کے لیے رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”عاطف صاحب نے ہمیں تسلی دیتے ہوئے کہا تھا کہ ہمارا کام ختم ہو گیا۔ اب ہم خاموش ہو کر اپنے معمول کے کاموں سے لگ جائیں۔ اس کے آگے جو بھی کرنا ہو گا وہ خود کریں گے۔“

”اوہ.....“ خوش ولی کے خاموش ہونے پر میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر پوچھا۔ ”تم آفس میں کتنی دیر تک ہو؟“

”سات سے پہلے تو نہیں نکلوں گا۔“ اس نے بتایا۔

”ٹھیک ہے تم میرا انتظار کرنا۔“ میں نے ایک فوری فیصلے کے تحت کہا۔ ”میں فیکٹری سے ذرا جلدی نکلنے کی کوشش کروں گا اور سیدھا تمہارے پاس آؤں گا۔“

”خیریت تو ہے نا یار؟“ اس نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

”ہاں خیریت ہے۔“ میں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔ ”میں عاطف صاحب کے ساتھ ایک ضروری میٹنگ کرنا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے آ جاؤ۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”باس تو دیر تک آفس میں موجود رہتے ہیں۔“

”اوکے، میں آ رہا ہوں۔“ میں نے کہا پھر پوچھ لیا۔ ”تمہیں کس شعبے میں فٹ کیا گیا ہے؟“

”اکاؤنٹ ڈیپارٹمنٹ میں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میری ایجوکیشن کے لحاظ سے یہی شعبہ سوٹ کرتا تھا۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے الوداعی کلمات کے بعد سیلولر رابطہ موقوف کردیا۔

لنچ تک میں گومگو کی کیفیت میں رہا۔ اس امر میں تو کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی کہ فیکٹری کے اعلیٰ اسٹاف میں جو بھی تبدیلیاں کی گئی تھیں وہ عاطف رشید ہی کا کارنامہ تھا اور یہ تو ممکن نہیں تھا کہ عاطف صاحب نے اتنا بڑا اقدم اٹھانے سے پہلے اپنے بھائی صاحب یعنی میرے باس خالد رشید کو اعتماد میں نہ لیا ہو لیکن یہ سب کچھ ہوا کیسے تھا' یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

میں لنچ سے فارغ ہوا تو میرا بلاوا آ گیا۔ ایک آدمی نے آ کر بتایا کہ خالد صاحب مجھے یاد کررہے ہیں۔ میں "جل تو جلال تو' آئی بلا کو ٹال تو" کا ورد کرتے ہوئے اپنے باس کے کمرے میں پہنچ گیا۔ انہوں نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"بیٹھ جائیں.....!"

میں نے دھیرے سے کرسی کھینچی اور بڑے ادب آداب کے ساتھ بیٹھ گیا پھر میری سوالیہ نگاہ خالد رشید پر جم گئی۔

وہ چند لمحات تک میز پر موجود اشیا کے ساتھ' شطرنج کے مہروں کی طرح کھیلتے رہے پھر میری جانب دیکھتے ہوئے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔

"مسٹر اسد! میں نے پچھلے پونے دو ماہ میں آپ کی کارکردگی کا بڑی توجہ سے جائزہ لیا ہے' خصوصاً اس ماہ کے آخری پندرہ دن اور..... میں نے آپ کو انتہائی ایمان دار اور محنتی پایا ہے۔"

"شکریہ سر.....!" میں نے مودبانہ انداز میں کہا۔

وہ اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔ "آپ کے تعاون سے میری کمپنی دیمک کا خاتمہ کرنے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ وہ دیمک جو میرے بزنس کو دھیرے دھیرے کھوکھلا کررہا تھا لہٰذا میں تہ دل سے تمہارا شکر گزار ہوں۔"

"سر.....!" میں نے شائستگی سے کہا۔ "میں نے جو کچھ کیا وہ تو میرا فرض تھا۔"

"جو لوگ اپنے فرائض کو یاد رکھتے ہیں' دنیا میں وہی عزت اور ترقی پاتے ہیں۔" وہ بڑی متانت سے بولے۔ "چنانچہ میں نے آپ کو بھی ترقی دینے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"یہ تو آپ کی نوازش ہے سر....." میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔

"اس ماہ کے اختتام میں چند روز باقی ہیں۔" وہ بہ دستور گہری سنجیدگی سے بولتے چلے گئے۔ "نئے ماہ سے آپ کی تنخواہ میں دو ہزار کا اضافہ کیا جارہا ہے اور اس کے ساتھ ہی آپ کو کمپنی کی طرف سے ایک موٹر بائیک بھی دی جائے گی جو آپ کی ملکیت ہوگی۔ بس آپ کی تنخواہ میں سے ہر ماہ ایک ہزار روپیا کاٹ لیا جائے گا۔ آپ پچاس ہزار کے اندر اندر مالیت کی جو بھی بائیک پسند کریں وہ مجھے بتا دیجیے گا۔"

خالد رشید نہایت ہی سنجیدہ انداز میں مجھے خوش خبریاں سنا رہے تھے اور میں بے یقینی سے ان کا چہرہ تک رہا تھا۔ سچی بات تو یہ کہ مجھے اتنی جلدی پروموشن کی توقع نہیں تھی۔ ان کا دل خوش کن بیان جاری تھا۔

"فی الحال' تین ماہ تک آپ وحید صاحب کے ساتھ کام کریں گے۔ وحید صاحب کو میں نے فورمین عظیم احمد کی جگہ رکھا ہے۔ وحید صاحب تین ماہ کے بعد آسٹریلیا چلے جائیں گے۔ ان تین ماہ میں آپ نے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر یہ سارا کام اور اس کے اسرار و رموز سیکھنا ہیں کیونکہ وحید صاحب کے جانے کے بعد فورمین (سپروائزر) کی سیٹ آپ کو سنبھالنا ہے اور اس کے ساتھ ہی آپ کی تنخواہ پندرہ

ہزار ہو جائے گی۔"

آج کل کے حساب سے کسی سپروائزر کی پندرہ ہزار تنخواہ آپ کو کم محسوس ہوسکتی ہے میں آپ کے محسوسات کو چیلنج نہیں کروں گا کیونکہ میں اپنی زندگی کے جو واقعات آپ کی خدمت میں پیش کررہا ہوں وہ چند سال پہلے کے ہیں۔

میں نے اپنے باس خالد رشید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "سر! آپ یہ جو مجھ پر اتنا بڑا احسان کررہے ہیں میں اسے زندگی بھر یاد رکھوں گا اور اپنی بہترین ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں آپ کی فیکٹری کے لیے وقف کردوں گا۔ میری..... میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کن الفاظ میں آپ کا شکریہ ادا کروں۔"

"الفاظ سے نہیں' اپنے عمل سے شکریہ ادا کریں اسد صاحب۔" وہ اپنے مخصوص خشک لہجے میں بولے۔ "اگر آپ نے تین ماہ میں وحید صاحب کے عملی تجربے کو اپنے ذہن میں اتار لیا تو میں سمجھوں گا' میں نے آپ پر اعتماد کرکے کوئی غلطی نہیں کی۔"

"اوکے سر۔ میں آپ کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا پھر ڈرتے ڈرتے پوچھ لیا۔ "سر..... انور صاحب' بیگ صاحب اور عظیم صاحب کو ایک ساتھ فارغ کردیا گیا ہے؟"

"دیمک کا علاج یکمشت ہی کیا جاتا ہے۔" وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولے۔ "اگر یہ کام مرحلہ وار کیا جائے تو کبھی اس موذی سے نجات نہیں مل سکتی اور..... اب آپ جاسکتے ہیں۔"

میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور کمرے سے نکلنے سے پہلے کہا۔ "سر آج میں ایک گھنٹا پہلے چھٹی کرنا چاہتا ہوں۔ گھر میں کچھ ضروری کام ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ سرسری انداز میں بولا۔ "آپ وحید صاحب کو اپنے مسئلے سے آگاہ کردیجیے گا۔"

میں نے باس کا شکریہ ادا کیا اور کمرے سے باہر آ گیا۔

وحید صاحب بہت ہی نستعلیق اور تجربہ کار انسان تھے۔ خالد رشید صاحب نے انہیں میرے بارے میں خصوصی ہدایات دے رکھی تھیں۔ میں نے ان سے ایک بھرپور ملاقات کی پھر اپنی مجبوری ظاہر کرکے چھٹی سے ایک گھنٹا پہلے فیکٹری سے نکل آیا۔

"برہانی ٹریڈرز" کا رخ کرنے سے پہلے میں ایم اے جناح روڈ ال معروف بندر روڈ کی ایک معروف سویٹ شاپ پر پہنچا اور وہاں سے دو کلوگرام قلاقند بڑی خوب صورتی سے پیک کرالیا۔ یہ مٹھائی میں نے عاطف رشید صاحب کے لیے خریدی تھی کیونکہ میری ترقی اور خوش دلی کے روزگار کے سلسلے میں انہوں نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔

ٹھیک چھ بجے میں مٹھائی کے ڈبے کے ساتھ عاطف رشید صاحب کے سامنے بیٹھا تھا۔ ہم دونوں کے سوا اور کوئی کمرے میں موجود نہیں تھا۔ عاطف صاحب نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے اپنے مخصوص تحمل بھرے انداز میں کہا۔

"خوش دلی نے بتایا تھا کہ آپ مجھ سے کوئی خاص بات کرنا چاہتے ہیں؟"

"جی سر..... میں آج صبح ہی سے بہت الجھا ہوا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کیا الجھن ہے؟" وہ سوالیہ انداز میں مجھے تکنے لگے۔

میں نے انہیں فیکٹری میں پیش آنے والے حالات و واقعات سے آگاہ کیا اور آخر میں کہا۔ "سر! میں تو کچھ اور توقع کررہا تھا۔"

"مثلاً کیا.....؟" ان کی سنجیدگی میں رتی بھر کمی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

واقع نہ ہوئی۔

"جب جرائم پیشہ افراد کے خلاف ٹھوس ثبوت حاصل کر لیے گئے تھے تو انہیں محض نوکری سے فارغ کر کے اتنی آسانی سے نہیں جانے دیا جانا چاہیے تھا۔" میں نے اپنے ذہن میں موجود سوالات کو زبان پر لاتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھ رہا تھا' نقلی ادویات کے گھناؤنے دھندے میں ملوث تمام افراد کو ان کے کالے کرتوتوں کے ثبوت کے ساتھ پولیس کے حوالے کر دینا چاہیے تھا اور دوسرے روز شہر کے تمام اخبارات اس ایشو کو ٹاپ اسٹوری بنا کر شائع کرتے تاکہ اس قماش کے دوسرے لوگوں کو عبرت حاصل ہوتی۔"

"یہ نہایت ہی آسان تھا۔" عاطف صاحب نے کہا۔ "لیکن ایک خاص مصلحت کے تحت ایسا نہیں کیا گیا۔"

"مصلحت!" میں چونکا۔ "کیسی مصلحت سر؟"

"اگر یہ ٹاپ اسٹوری اخبارات کی زینت بنتی تو یقیناً اس کے بہت سے مثبت پہلو اجاگر ہو سکتے تھے۔" عاطف صاحب نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "لیکن اس کا ایک بہت بڑا نقصان بھی تھا۔"

"نقصان...... میں کچھ سمجھا نہیں سر؟"

"اس نقلی ادویات کی ترسیل والی سنسنی خیز اسٹوری کے منظر عام پر آتے ہی بھائی صاحب کی فارماسیوٹیکل کمپنی کی ساکھ کو بہت بڑا دھچکا لگتا......"

وہ معتدل انداز میں اپنے موقف کی تفصیل بتانے لگے۔ "بھائی صاحب کا بزنس تباہ ہو کر رہ جاتا۔ یہ دنیا بھیڑ چال کی فلاسفی پر چلتی ہے۔ کوئی یہ سوچنے کی زحمت نہ کرتا کہ اس گھناؤنے کاروبار میں کمپنی بے قصور ہے' وہ کسی بھی زاویے سے اس دو نمبر بزنس میں ملوث نہیں۔ لوگ سیدھا سیدھا ہماری پراڈکٹس کا بائیکاٹ کر دیتے۔ ایک بار کسی شے سے اعتماد اٹھ جائے تو پھر دوبارہ قائم نہیں ہو تا پایا...... بڑی مشکل سے ہوتا ہے۔ میں بھائی صاحب کے حوالے سے اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتا تھا۔"

"اعتماد اور بھروسے کے حوالے سے میں آپ کے خیالات سے اتفاق کرتا ہوں سر۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اگر کوئی جوان لڑکی کسی اطلاع کے بغیر ایک رات اپنے گھر سے باہر گزار آئے' چاہے وہ رات اس نے مکہ مکرمہ میں عبادت کرتے ہوئے گزاری ہو' دنیا والوں کی نظروں میں اس کا کردار مشکوک ہو جاتا ہے۔"

"بے شک ایسا ہی ہے۔" عاطف صاحب نے اثبات میں گردن ہلائی اور مزید بتانے لگے۔ "مسٹر اسد! آپ ایسا نہ سمجھیں کہ میں نے ان جونکوں کو آسانی سے جانے دیا ہے......" لمحاتی توقف کر کے انہوں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس مشن کی ابتدائی رپورٹس سے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا نہیں بلکہ ساری کی ساری دال ہی کالی ہے۔ میں نے نہایت ہی رازداری کے ساتھ ان پوسٹوں کے لیے نہایت ہی تجربہ کار اور لائق فائق لوگوں کی تلاش کا کام شروع کر دیا تھا کہ جب انور' عظیم اور بیگ کو کک آؤٹ کیا جائے تو ان کی جگہ کام کرنے کے لیے بھائی صاحب کے پاس اسٹاف موجود ہو......"

"سر!" ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں بول اٹھا۔ "آپ مجھے کچھ اور بتانے جا رہے تھے؟"

"ہاں...... میں اسی طرف آ رہا ہوں۔" وہ مضبوط لہجے میں بولے۔ "جب ان تینوں کمینوں کے خلاف ٹھوس اور ناقابل تردید ثبوت میرے ہاتھ لگ گئے تو میں نے بھائی صاحب کی موجودگی میں فیکٹری جا کر

ان سے ایک جوائنٹ میٹنگ کی تھی۔ یہ ایک خفیہ میٹنگ تھی جو فیکٹری کی چھٹی کے بعد کی گئی تھی۔ لہٰذا دیگر اسٹاف کو اس کی کوئی خبر نہیں۔"

یہاں تک پہنچنے کے بعد انہوں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر سلسلہ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگے۔

"میں نے ان کے سامنے ان کے کالے کرتوتوں کے سارے ثبوت رکھ دیئے اور کہا کہ میں یہ کیس ایف آئی اے کے حوالے کرنے والا ہوں۔ میرے آدمیوں کی کارکردگی اتنی جامع اور کنکریٹ تھی کہ وہ اپنے جرائم کے حوالے سے کوئی فرار کی راہ اختیار نہ کر سکے اور باقاعدہ بھائی صاحب کے قدموں میں گر کر معافیاں مانگنے لگے۔

"معافی تلافی کی کوئی گنجائش باقی نہیں۔" بھائی صاحب نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ "تم لوگوں نے میرے اعتماد کو دھوکا دے کر میرے بزنس کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں تمہیں ایک لمحہ بھی اپنی آنکھوں کے سامنے نہیں دیکھنا چاہتا۔"

"سر! ہم آج کے بعد آپ کو اپنی شکل نہیں دکھائیں گے۔" یاسین بیگ نے لجاجت بھرے لہجے میں کہا۔ "آپ اپنے بھائی سے کہیں کہ ہمیں ایف آئی اے والوں کے حوالے نہ کریں۔ ہم اسی لمحے نوکری چھوڑ کر جا رہے ہیں۔"

"نوکری تمہاری تو تم لوگوں کے چھوڑنے سے پہلے ہی ختم ہو چکی ہے۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "اگر تم لوگ چاہتے ہو کہ تمہاری کرپشن کا کیس ایف آئی اے والوں کے پاس نہ جائے تو تمہارے پاس بچت کا ایک ہی راستہ ہے!"

"آپ بتائیں سر......" انور صاحب نے جلدی کہا۔ "ہم آپ کی ہر شرط ہر بات ماننے کو تیار ہیں۔"

میں نے ان تینوں شیطانوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بے دست و پا بنانے کے لیے مخصوص عبارت کے اسٹیمپ پیپرز تیار کروا رکھے تھے جس کا اردو میں مفہوم کچھ اس طرح بنتا تھا۔ یہ ایک طرح کے حلفیہ اقرار نامے تھے جن کے ذریعے فرداً فرداً اس امر کا اقبال کیا گیا تھا کہ میں جعلی ادویات کی تقسیم اور ترسیل جیسے قابل مذمت فعل کا مرتکب ہوا ہوں۔ فیکٹری مالکان کی لاعلمی میں' میں اصلی ادویہ کے ساتھ نقلی ادویہ کو شامل کر کے فیکٹری سے ڈسٹری بیوٹر تک پہنچاتا رہا ہوں۔ اس کام میں میرے ساتھ اسٹاف کے "یہ یہ" افراد بھی شامل تھے۔ میرے جرائم چھپے نہ رہ سکے اور اسی کرپشن کی بنا پر فیکٹری نے مجھے نوکری سے نکال دیا ہے۔ اس اسٹیمپ پیپر کے ساتھ میرے تمام تر جرائم کے ثبوت بھی منسلک ہیں۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد عاطف صاحب نے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

"ان تینوں میں سے ہر ایک نے اقبال جرم کرتے ہوئے اپنے دیگر دونوں ساتھیوں کو بھی نامزد کر دیا تھا۔ یہ تحریر درحقیقت ان کے ہاتھ پاؤں کاٹنے کے مترادف تھی۔ میں نے اسٹیمپ پیپرز پر ان کے دستخط لے کر گویا تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی ہے۔ ہر اسٹیمپ پیپر ایک شخص کا اقرار جرم ہے اور گواہوں کے ذیل میں اس کے دونوں ساتھیوں کے نام اور دستخط شامل ہیں۔"

"آپ نے تو بہ قول شخصے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر رکھ دیے ہیں۔" میں نے توصیفی نظر سے عاطف صاحب کی طرف دیکھا پھر پوچھا "لیکن آپ نے ڈسٹری بیوٹر ارشد وارثی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟"

"ارشد وارثی کے ہاتھ صاف ہیں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ "میں نے وارثی صاحب پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی خصوصی ریسرچ کی ہے۔ اس شیطانی کھیل سے وہ مطلق واقف نہیں ہیں اور میں نے انہیں اس حوالے سے کچھ بتانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ بھائی صاحب کی فیکٹری میں تیار ہونے والی تمام تر پراڈکٹس کی ڈسٹری بیوشن وارثی صاحب ہی کے پاس رہے گی۔"

"سر! آپ نے میرے ذہن کا سارا بوجھ اتار دیا ہے۔" میں نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ پھر مٹھائی کا ڈبا ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میری اب تک کی ترقی اور تین ماہ بعد ملنے والی ترقی سے آپ بہ خوبی واقف ہیں۔ یہ اسی کی خوشی میں ہے۔"

"لیکن میں تو میٹھا اوائیڈ کرتا ہوں.....!"

"یہ شوگر فری ہے سر!" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

اس نے زیرلب مسکراتے ہوئے شکریے کی ساتھ مٹھائی رکھ لی اور میں انہیں سلام کرکے آفس سے باہر نکل آیا۔

باہر خوش ولی میرا منتظر تھا۔ اس کی چھٹی کا وقت ہوگیا تھا۔ اس نے آف کیا اور ہم دونوں بلڈنگ سے باہر نکل آئے۔ اس دوران میں' میں اسے تازہ ترین حالات سے مختصراً آگاہ کرچکا تھا۔

"یار! یہ تو تم نے بہت بڑی خوش خبری سنائی ہے۔" وہ مسرت بھرے لہجے میں بولا۔ "چند روز بعد تمہارے پاس بھی بائیک آجائے گی اور پھر تین ماہ کے بعد تم "صاحب" ہوجاؤ گے۔"

"صاحب" کے لفظ پر اس نے اچھا خاصا زور ڈالا تھا۔ میں نے کہا۔ "یہ جو کچھ بھی ہے' بس تمہاری دعاؤں کا نتیجہ ہے۔"

"اسد! آج کل خدا میری کچھ زیادہ ہی نہیں سن رہا۔"

"آج کل نہیں' وہ ہمیشہ ہی سنتا ہے اور سب کی سنتا ہے۔" میں نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ "پھر وہ وہی کرتا ہے جو ہمارے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ ہمیں اس کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ وہ اپنی مخلوق کے ایک ایک فرد کو ستر ماؤں سے زیادہ چاہتا ہے۔"

"بے شک!" خوش ولی بڑے یقین کے ساتھ بولا۔

"اچھا یار! اب میں گھر چلوں گا۔" میں نے کہا۔ "کافی دیر ہوگئی ہے۔ امی پریشان ہورہی ہوں گی۔"

"ٹھیک ہے' تم جاؤ۔" وہ فراخ دلی سے بولا۔ "اور جاتے جاتے۔" باس سے ہونے والی میٹنگ کا کچھ احوال مجھے بھی سنا جاؤ۔"

"باس" سے اس کی مراد عاطف رشید صاحب تھی۔ وہ اب "برہانی ٹریڈرز" کا باقاعدہ ملازم تھا اور عاطف رشید اس کے باس تھے۔ میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں اسے عاطف رشید سے ہونے والی اپنی ملاقات سے آگاہ کیا پھر بس میں بیٹھ کر اپنے گھر کی جانب روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

گھر کے اندر ایک کچہری کا سا سماں تھا۔ میں لگ بھگ آٹھ بجے رات جب گھر پہنچا تو وہاں افراد خانہ کے علاوہ فرحانہ اور اس کی امی کو بھی موجود پایا۔ میرے کان کھڑے ہوگئے کہ کہیں میرے خلاف کوئی سازش تو نہیں ہورہی۔ یہ احساس "چور کی داڑھی میں تنکا" کا رہین منت تھا لیکن خیریت گزری۔ امینہ آنٹی امی سے گپ شپ کرنے آئی تھیں اور فرحانہ' شازیہ کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔

میں نے سب کو سلام کیا اور فریش ہونے کے لیے واش روم کی جانب بڑھ گیا۔ جب میں دوبارہ امی کے پاس آیا تو پتا چلا کہ امینہ آنٹی تو رخصت ہوچکی

ہیں مگر فرحانہ ابھی تک وہیں جمی بیٹھی ہے۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی شازیہ نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔

"بھائی جان! آپ کی شاگرد چھلے دو گھنٹے سے آپ کے انتظار میں بیٹھی ہے۔"

"کیوں..... خیریت؟" میں نے سوالیہ نظروں سے فرحانہ کی طرف دیکھا۔

"سر! دو روز بعد میرا فزکس کا پیپر ہے۔" وہ مکار سب کے سامنے مجھے "سر" کہہ کر ہی مخاطب کرتی تھی۔ "آپ کافی دنوں سے ٹائم نہیں نکال پارہے۔ آپ کا صرف ایک گھنٹا لوں گی۔ مجھے میکنا ٹرم کے چیپٹر میں سے دو تین چیزیں سمجھنا ہیں۔"

پچھلے دنوں میں ایک دو روز کے بعد ہماری ملاقات تو ہوجاتی تھی لیکن ایک ساتھ تنہائی میں بیٹھ کر وقت گزارنے کا موقع نہیں مل رہا تھا تاہم میں نے اپنی اداؤں اور طرز عمل سے اس کی محبت کا جواب محبت سے دے دیا تھا جس پر وہ بڑی مطمئن اور خوش تھی اور یہ ایک حقیقت تھی کہ مجھے فرحانہ سے محبت تھی۔

"بیٹا! اس بچی کے لیے تھوڑا وقت نکال لو۔" امی نے فرحانہ کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔ "دنیا کے کام تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "ابھی تو مجھے شدید بھوک لگ رہی ہے۔ پہلے میں سیر ہوکر کھانا کھاؤں گا پھر مجھے امی سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔ یہ جلدی سو جاتی ہیں لہٰذا یہ کام پہلے نمٹ جائے تو اچھا ہے۔ آپ ایسا کریں..... ایسا کریں..... کہ دس بجے میرے پاس آجائیں۔ میں دس سے گیارہ بجے کا وقت آپ کو دے دوں گا۔"

"اوکے.....!" وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ "میں ٹھیک دس بجے آجاؤں گی۔"

فرحانہ کے جانے کے بعد امی نے شازیہ سے کھانا لگانے کو کہا پھر میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولیں۔ "ہاں بیٹا! بتاؤ' تم مجھ سے کون سی ضروری باتیں کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے انہیں اپنی موجودہ اور مستقبل قریب کی کامیابیوں کے بارے میں آگاہی دی۔ انہوں نے پوری توجہ اور انہماک سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر وہ آب دیدہ ہوگئیں' بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔

"بیٹا' تمہیں یاد ہے نا..... میں نے چند روز پہلے تم سے کیا کہا تھا؟"

"جی امی' مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "آپ نے کہا تھا..... کہ آپ کا پروردگار ایک دن مجھے ایگزیکٹو کی پوسٹ پر بھی ضرور بٹھائے گا۔ ان شاءاللہ!"

"ہاں' میں نے یہی کہا تھا۔" ان کی آنکھوں سے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ "فورمین تو شروعات ہے۔ میں آنے والے وقتوں میں تمہیں جنرل منیجر کی سیٹ پر بیٹھا دیکھ رہی ہوں۔"

"اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔" میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔

اسی لمحے شازیہ کھانے کے برتن لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ امی کو روتے دیکھ کر وہ چونک اٹھی' تشویش ناک لہجے میں مستفسر ہوئی۔

"کیا ہوا امی.....؟"

"کچھ نہیں بیٹی....." امی اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔ "یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ تمہارے بھائی جان کی ترقی ہوگئی ہے۔"

"کیا کہا.....!" شازیہ نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ "بھائی جان! امی کیا کہہ رہی ہیں؟"

"امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" میں نے اثبات میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گردن ہلادی۔

"بہت خوب.....!" شازیہ خفگی آمیز لہجے میں بولی۔ "ماں بیٹے میں رازونیاز ہو رہے ہیں اور میں..... میں تو جیسے اس گھر کی فرد ہی نہیں ہوں۔"

"زیادہ جذباتی ڈائیلاگ مارنے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے میٹھی سرزنش کی۔ "تم کھانا تو چنو پھر تمہیں بھی بتاتے ہیں۔"

تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم تینوں کھانا کھاتے ہوئے باتیں بھی کرتے جارہے تھے۔ موضوع میری ترقی ہی تھا۔ جب ساری بات شازیہ کے بھیجے میں اتر گئی تو وہ اٹھلا کر بولی۔

"یہ روکھی سوکھی خبریں سنا رہے ہیں۔ اتنی توفیق نہیں کہ منہ ہی میٹھا کرادیں اپنی اس کامیابی پر.....!"

ان لمحات میں مجھے افسوس بھی ہوا کہ میں گھر کا رخ کرتے ہوئے ایک مٹھائی کا ڈبا کیوں نہ اٹھالایا لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"تمہاری مٹھائی مجھ پر ڈیو ہے۔ میں کل ضرور لادوں گا۔"

"کل نہیں' آج ہی۔" وہ ضدی لہجے میں بولی۔ "اور مٹھائی نہیں' میں آئس کریم کھاؤں گی۔"

"تمہاری یہ پڑوسن دوست پڑھ کر واپس چلی جائے پھر میں تمہیں آئس کریم لادیتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "دل کو اتنا چھوٹا نہ کیا کرو۔ پہلے کبھی تمہاری کوئی فرمائش رد کی ہے۔"

وہ میری سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔ "گھر میں بیٹھ کر آئس کریم کھانے کا کیا خاک مزہ آئے گا.....!"

"پھر.....؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"میں تو آئس کریم پارلر میں بیٹھ کر کھاؤں گی۔" وہ اصراری لہجے میں بولی۔ "کتنے ہی دن ہوئے' ہم گھر سے باہر بھی نہیں نکلے۔"

"اب زیادہ نہ پھیلو۔" امی نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔ "تمہیں ذرا خیال نہیں کہ بھائی کتنا تھکا ہوا آیا ہے۔"

"کوئی بات نہیں امی!" میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔ "اب میں اتنا بھی تھکا ہوا نہیں ہوں کہ اپنی پیاری بہن کی یہ ننھی سی فرمائش بھی پوری نہ کرسکوں۔"

"یاہو.....!" شازیہ نے ایک مکا ہوا میں بلند کرتے ہوئے خوشی سے نعرہ لگایا..... "بھائی جان' زندہ باد.....!"

انسان کی زندگی میں چھوٹی چھوٹی خوشیوں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ کہیں باہر بیٹھ کر فیملی کے ساتھ آئس کریم کھالینا بھی ایسی ہی ایک خوشی ہے جب تک میں اور شازیہ چھوٹے تھے' امی نے ہماری ہر ضرورت' ہر خوشی کا خیال رکھا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہم بڑے ہوتے گئے اور امی بیمار..... میں امی کی بیماری اور موجودہ کیفیت کا احوال بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کرچکا ہوں۔ جب ہمیں انٹرٹین کرنا ان کے بس میں نہ رہا تو یہ ذمے داری میں نے سنبھال لی تھی۔ شازیہ مجھ سے چھ سال چھوٹی تھی لیکن ضد کے معاملے میں وہ بالکل چھ سال کی ننھی بچی بن جاتی ہے اور..... میں بھی اس کے ناز اٹھانے میں کسی بخل یا کسلمندی سے کام نہیں لیتا تھا۔

○.....○.....○

ہم دونوں آمنے سامنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ فرحانہ نے بڑی ہوشیاری سے فزکس کے چیپٹر کا انتخاب کیا تھا۔ میکانزم یعنی مقناطیسیت'

مقناطیسیت..... صاف ظاہر تھا کہ فزکس کا یہ شعبہ باہمی کشش سے متعلق تھا۔ میں نے فرحانہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا میکانزم کے علاوہ فزکس میں کوئی اور چیپٹر نہیں ہے؟"

"اس دنیا میں درجنوں بلکہ سیکڑوں مسائل ہیں۔" وہ کسی فلسفی کے انداز میں بولی۔ "لیکن ضروری نہیں ہے کہ انسان ہر مسئلے پر پی ایچ ڈی کرتا پھرے۔ معقولیت یہی ہے کہ انسان اپنے معاملے پر نظر رکھے۔"

اس نے جو کچھ مجھے سمجھانے کی کوشش کی تھی میں بہ خوبی اور گہرائی تک سمجھ گیا تھا۔ میں نے بھی اسی کے انداز میں کہا۔

"گویا آج آپ مجھ سے فزکس پڑھنے نہیں آئیں.....!"

"آپ ایک ذہین اور سمجھدار انسان ہیں۔" وہ بڑی گہری نظر سے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ "میں آپ کے سامنے وضاحتیں کرتی اچھی نہیں لگتی۔"

"فرحانہ! میں آپ کے جذبات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اور ان کی دل سے قدر بھی کرتا ہوں لیکن ہمیں کسی بھی مرحلے پر احتیاط کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔"

"میں بھی یہی چاہتی ہوں لیکن میں آپ کی طرح اندر سے مضبوط نہیں ہوں۔" وہ میری آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے بولی۔ "میں آپ کی محبت میں اتنی آگے نکل چکی ہوں کہ ہر وقت آپ کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتی ہوں اور آپ جب....." لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک افسردہ سی سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"آپ جب دو' دو تین تین دن تک مجھے وقت نہیں دے پاتے تو میرا دم گھٹنے لگتا ہے' میں خود کو مٹتا ہوا محسوس کرنے لگتی ہوں۔ شاید میں..... میں پاگل ہوگئی ہوں۔ کیا فزکس یا کیمسٹری میں میرے اس مرض کا کوئی علاج ہے؟"

بات ختم کرتے ہی اس نے بڑی تشنہ نگاہ سے مجھے دیکھا۔ ان لمحات میں وہ مجھے بڑی پیاری' بڑی دلکش نظر آئی۔ دل بے طرح اس کی طرف کھنچنے لگا۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"فرحانہ! جو حال آپ کا ہے' میں بھی اسی کیفیت سے گزر رہا ہوں۔ اور..... جہاں تک اس "مرض" کا تعلق ہے تو اس کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا' یہ بے چارے فزکس' کیمسٹری اور بیالوجی جیسے مضامین اس مرض کا کیا علاج کریں گے البتہ.....!"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا' وہ تڑپ کر بولی۔

"البتہ کیا اسد؟"

"البتہ یہ کہ....." میں نے ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کہا۔ "اگر انسان کو یہ پتا چل جائے کہ اس کا مرض لاعلاج ہے تو ٹریٹمنٹ روک نہیں دیا جاتا۔ آخری سانس تک علاج معالجہ جاری رہتا ہے۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا.....؟" وہ اچنبھک نظر سے مجھے تکنے لگی۔

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ہمیں ہر حال میں ٹریٹمنٹ جاری رکھنا چاہیے۔"

"ٹریٹمنٹ.....!" اس کی حیرت سہ گنا ہوگئی۔ "میں کچھ سمجھی نہیں۔"

"آپ مجھ سے میکانزم پڑھنے آئی ہیں اور اس کے بنیادی اصولوں کو نظر انداز کررہی ہیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑے توانا لہجے میں کہا۔ "آپ اتنے فاصلے پر بیٹھ کر سمجھنا چاہیں گی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو میں آپ کو کیا خاک سمجھا پاؤں گا......؟''

اس کے چہرے اور آنکھوں میں ایک رنگ سا لہرا کر رہ گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ اپنے صوفے سے اٹھی اور میرے پہلو میں آ بیٹھی۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ اس کا بدن جذبات کی شدت سے لرز رہا تھا۔ خود میری کیفیت بھی اس سے زیادہ مختلف نہیں تھی۔ وہ کوئی ننھی بچی نہیں تھی کہ میرے عزائم کی اس کو خبر نہ ہو، تاہم اپنی مخصوص نسوانی فطرت سے مجبور ہو کر اس نے کمزور سی آواز میں پوچھا۔

''آپ کسی ٹریٹمنٹ کی بات کر رہے تھے......''

یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کا سینہ کسی خوف ناک طوفان کی زد پر محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے زیر لب مسکرا کر بڑی جاذب نظر سے اسے دیکھا اور اس کے سوال کے جواب میں اپنی دونوں بانہیں وا کر دیں۔

وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی مانند حرکت میں آئی اور ایک دل آویز جھٹکے سے میرے سینے پر کسی تمغے کی طرح سج گئی۔ میں نے اسے اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے لیا۔ وقت گویا تھم کر رہ گیا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے میں مدغم اور خاموش تھے۔ اس وجودی خاموشی کے جلو میں ہمارے دل بے طرح دھڑک رہے تھے۔

پتا نہیں، کتنی دیر تک ہمارے بدن ایک دوسرے سے ہم کلام رہے۔ اس کیفیت کو الفاظ کا جامہ پہنانا ممکن نہیں۔ ان مراحل سے گزرنے والا کوئی شخص اس لذت کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

فرحانہ میری گرفت سے آزاد ہونے کے لیے کسمسائی پھر چڑھتی ہوئی سانس کے ساتھ بولی۔

''میرا دم گھٹ رہا ہے۔''

اس کا پورا بدن پسینے میں شرابور تھا۔ میں نے اسے اپنی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے کہا۔

''گرمی ہو رہی ہے نا......؟''

وہ واپس اپنے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔ پھر لرزیدہ آواز میں بولی۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''آئس کریم ہو جائے ......؟'' میں نے شوخی سے کہا۔

''آئس کریم!'' اس کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی۔

''ہاں، ہاں...... آئس کریم۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''آپ جلدی سے فریش ہو کر آ جاؤ، پھر ہم سب لوگ آئس کریم کھانے باہر جائیں گے۔''

''باہر......'' وہ استعجابیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ ''سب لوگ......؟''

''انار کلی بازار میں ایک نیا آئس کریم پارلر کھلا ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم وہاں بیٹھ کر آئس کریم کھائیں گے اور واپس گھر آ جائیں گے۔ ہم سے میری مراد ہے، میں، شازیہ اور آپ...... اس خنک موسم میں امی کو باہر لے جا کر آئس کریم کھلانے کا رسک نہیں لیا جا سکتا......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور پوچھا۔

''کیا آپ کے گھر والے اس وقت باہر نکلنے کی اجازت دے دیں گے؟''

''میرے امی ابو آپ پر اور آپ کے گھر والوں پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔'' وہ فخر آمیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں شازیہ کے ساتھ اکثر مارکیٹ جاتی رہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے، آپ پندرہ منٹ میں تیار ہو کر آ جائیں۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''آج میں اپنی جاب کے حوالے سے آپ کو ایک خوشخبری بھی سناؤں گا۔''

''کیسی خوش خبری!'' اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ ''ابھی سنائیں نا۔''

''ابھی نہیں۔'' میں نے شرارت بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''ٹھنڈی اور خوش ذائقہ آئس کریم سے منہ میٹھا کرنے کے دوران میں وہ خوشخبری سنانے کا کچھ الگ ہی لطف آئے گا۔''

''آپ سے کوئی نہیں جیت سکتا۔'' وہ بڑی ادا سے بولی اور اٹھ کھڑی ہو گئی۔ ''میں تھوڑی دیر میں فریش ہو کر آ رہی ہوں۔''

فرحانہ کے جانے کے بعد جب میں نے شازیہ کو بتایا کہ اس کی دوست بھی ہمارے ساتھ آئس کریم کھانے جا رہی ہے تو چند لمحات تک وہ مجھے ٹٹولتی ہوئی نظر سے دیکھتی رہی جیسے میرے دل کا احوال جاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ سچی بات یہ ہے کہ ان لمحات میں میں نگاہ چرانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ شاید یہ میرے دل کے اندر چھپے ہوئے چور کی کوئی کارستانی تھی۔ مجھے [illegible] ہوتے دیکھ کر وہ خاصے جارحانہ انداز میں بولی۔

''فرحانہ میری دوست سے زیادہ آپ کی شاگردن ہے۔ آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ آپ کی شاگردن بھی ہمارے ساتھ آئس کریم کھانے جائے گی؟''

''ایک ہی بات ہے۔'' میں نے خجالت آمیز انداز میں کہا۔ ''تم خواہ مخواہ ہر معاملے میں بال کی کھال نکالنے میں مصروف ہو جاتی ہو!''

''کھال کے بال نکالنے سے تو اچھا ہے کہ انسان بال کی کھال نکالنے میں مصروف رہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ ''چلیں، آپ بھی کیا یاد کریں گے [illegible] جان! آپ کی شاگردن کو بھی آئس کریم کھلانے لیے چلتے ہیں۔''

شازیہ اس وقت جس فریکوئنسی اور میٹر بینڈ سے بول رہی تھی، میں بہ خوبی سمجھ رہا تھا لیکن میں نے اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے کسی قسم کی بحث مناسب نہ جانی۔ وہ فرحانہ کی گہری رازدار دوست تھی۔ خواتین پیٹ کی بھی بہت ہلکی ہوتی ہیں یہ ممکن نہیں تھا کہ فرحانہ نے اپنے اور میرے معاملے کے بارے میں شازیہ کو کچھ نہ بتایا ہو لہٰذا اس موضوع یعنی فرحانہ کے موضوع پر شازیہ سے الجھاؤ کوئی نیا چاند بھی چڑھا سکتا تھا!

○.....○.....○

گزشتہ رات کے دونوں تجربات بہت خوشگوار رہے تھے۔ یعنی فرحانہ کو میکانائزم کا کانسیپٹ سمجھانا اور آئس کریم پارلر میں بیٹھ کر آئس کریم کھانا۔ اگلی صبح میں تیار ہو کر کمپنی کے لیے گھر سے نکلا تو طبیعت میں بڑی جولانی اور جذبات میں بہت طغیانی تھی۔ یہ پچھلی رات فرحانہ سے ڈرائنگ روم میں ہونے والی ملاقات کا نشہ تھا جو ابھی تک مجھے اور میرے دل ودماغ کو حصار میں لیے ہوئے تھا۔ اس نشاط انگیز کیفیت میں، میں فیکٹری پہنچ گیا۔

یہ وحید صاحب کے ساتھ باقاعدہ کام کا میرا پہلا دن تھا۔ خالد رشید صاحب نے ایک عقل مندی یہ کی تھی کہ فیکٹری کے اسٹاف میں سے کسی کو یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ میں نے کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام دیا ہے اور یہ میرے حق میں اچھا ہی تھا ورنہ لوگ مجھ سے طرح طرح کے سوالات کرتے۔ جہاں انسان کے دس دوست ہوتے ہیں، وہیں انہی دوستوں کے درمیان ایک آدھ دشمن بھی موجود ہوتا ہے جو موقع کی تلاش میں رہتا ہے، اور پھر جیسے ہی موقع اس کے ہاتھ لگتا ہے، وہ نقصان پہنچانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرتا۔

عظیم احمد، انور صاحب مع ان کا بھانجا نور علی اور مرزا یاسین بیگ کو ایک ساتھ فائر کیا گیا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ ان افراد کا کوئی ایک آدھ حمایتی فیکٹری میں موجود نہ ہو۔ ایسا شخص مجھ سے دشمنی کر سکتا تھا۔ میری شخصیت اور کارنامہ جب تک چھپا رہتا، میرے حق میں بہتر تھا۔ ابھی تین ماہ تک مجھے وحید صاحب کے انڈر کام کرنا تھا اور یہ ایک معمول کی بات تھی۔ وحید صاحب کے آسٹریلیا چلے جانے کے بعد اگر مجھے فورمین بنا دیا جاتا تو یہ تبھی کوئی غیر معمولی کام نہ ہوتا۔ گویا میں اللہ کے فضل وکرم سے، ہر زاویے سے محفوظ ہی محفوظ تھا۔

لنچ کے وقت خوش ولی کا فون آ گیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے بتایا۔ ”یار اسد! بہت زور کا نزلہ ہو رہا ہے۔“

اس کی آواز سے مجھے ناسازی طبع کا کچھ اندازہ تو ہو گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”اگر نزلہ اتنا ہی شدید تھا تو آفس آنے کی کیا ضرورت تھی۔ تم آج چھٹی کر لیتے۔“

”یار نئی نئی نوکری ہے۔“ وہ ایک خوفناک چھینک مارتے ہوئے بولا۔ ”اس لیے میں نے چھٹی کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“

”بے شک! اس بے روزگاری کے زمانے میں نوکری بہت اہم چیز ہے مگر صحت سے زیادہ اہم نہیں۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم جب آفس آ ہی گئے ہو تو اپنے ڈیپارٹمنٹ ہیڈ کو بتا کر چھٹی لے سکتے ہو.....“

”انہیں میرے بتانے سے پہلے ہی میری حالت کا پتا چل چکا ہے۔“ وہ ایک مرتبہ پھر چھینکتے ہوئے بولا۔ ”اور انہوں نے مجھے لنچ کے بعد گھر جانے کی اجازت دے دی ہے۔“

”چلو، یہ تو اچھا ہوا۔“ میں نے اطمینان کی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”اب تم فوراً گھر روانہ ہو جاؤ اور جا کر آرام کرو۔ اگر طبیعت ٹھیک نہ ہو تو کل بھی چھٹی کر لینا۔“

اس نے میری ہدایات پر عمل کرنے کا یقین دلایا اور ہمارے درمیان سیلولر رابطہ منقطع ہو گیا۔

میں اپنے ڈیپارٹمنٹ میں آ کر وحید صاحب کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ جیسا کہ میں نے بتایا، وحید صاحب بہت ہی سلجھے ہوئے اور قابل انسان تھے۔ میں نے بہ آسانی اندازہ لگا لیا کہ تین ماہ کے عرصے میں، میں ان سے بہت کچھ سیکھ لوں گا جو آئندہ پریکٹیکل لائف میں میرے بے حد کام آئے گا۔ ہمارے درمیان مختلف امور پر بات چیت جاری تھی کہ انہوں نے اچانک ایک عجیب سا سوال کر ڈالا۔

”مسٹر اسد! کیا آپ کی شادی ہو گئی ہے؟“

میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”نہیں وحید صاحب۔“

انہوں نے پوچھا۔ ”منگنی تو ہو چکی ہو گی؟“

میں نے ایک مرتبہ پھر نفی میں جواب دیا۔

”آپ جوان ہیں وجیہ وشکیل ہیں، صحت مند ہیں۔“ وہ مخصوص سوالات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔ ”میں یہ نہیں مان سکتا کہ ابھی تک کہیں دل نہ لگایا ہو..... کوئی حسین چہرہ ہے آپ کی نظر میں؟“

”جی..... جی ہاں۔“ میں نے اٹکتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا اندازہ درست ہے وحید صاحب۔“

”ہوں.....“ انہوں نے معنی خیز انداز میں ہنکارا بھرا پھر پوچھا۔ ”یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ مہ جبیں کون ہے لیکن میں یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ یہ محض دل لگی ہے یا اسے اپنانے کا ارادہ بھی ہے؟“

”میں اسے اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتا ہوں۔“ میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”ویری گڈ!“ انہوں نے ستائشی نظر سے مجھے دیکھا اور گمبھیر انداز میں بولے۔ ”مسٹر اسد! اپنا لائف پارٹنر تلاش کرنے میں چاہے کتنا بھی وقت صرف کر دینا مگر ایک مرتبہ جس کا انتخاب کر لیا پھر زندگی کی آخری سانس تک اس کا ساتھ دینا۔“

”میں خود بھی انہی خیالات کا حامی ہوں وحید صاحب۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”وفاداری کو میں سب سے بڑی عبادت سمجھتا ہوں۔“

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر میرے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے وحید صاحب کی طرف دیکھا، انہوں نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

”فون اٹینڈ کریں مسٹر اسد..... ہو سکتا ہے یہ آپ کے ہونے والے جیون ساتھی کی کال ہو.....!“

میں نے جیب سے سیل فون نکال کر اس کے اسکرین کا جائزہ لیا۔ وہاں میرے گھر کا نمبر فلیش ہو رہا تھا۔ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

”ہیلو.....!“

”ہیلو بیٹا.....“ دوسری جانب سے امی کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”تم جہاں بھی ہو، فوراً گھر پہنچو.....“

”کچھ بتائیں تو سہی۔“ میری تشویش ساتویں آسمان سے باتیں کرنے لگی۔ ”آخر ہوا کیا ہے.....؟“

”بیٹا.....!“ امی کی روہانسی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ”غنڈوں نے ..... فرحانہ کو..... اغوا کر لیا ہے.....“

”کیا.....!“ میں حلق کی پوری قوت سے چلایا۔

دوسری جانب سے امی پتا نہیں، کیا کیا بولے جا رہی تھیں۔ ان لمحات میں مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے میرے سر پر ایٹم بم گرا دیا ہو.....!

(باقی آئندہ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سراب

جناب ایڈیٹر نئے افق'
آداب!
امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ ایک ہندی کہانی کے ترجمہ کے ساتھ حاضر ہوں۔ میں نے یہ کہانی ایک ہندی پرچے میں پڑھی تھی بقول ایڈیٹر یہ سچی کہانی ہے۔
بعض انسان زندگی بھر سرابوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے حقیقت سے دور نفسیاتی مریض بن جاتے ہیں اور کچھ لوگ ایک ٹھوکر میں راہ راست پر آجاتے ہیں۔ قارئین کہانی پڑھ کر خود ہی فیصلہ کریں کہ سرابوں کے پیچھے کون دوڑ رہا ہے اور کون حقیقت کا متلاشی ہے۔
کہانی پڑھ کر میری تحریر کے بارے میں رائے ضرور دیجیے گا۔
آپ کی آرا کی منتظر
دعا فاطمہ
کراچی' سندھ

بہاری لعل کا پرانا' بوسیدہ اور بڑا سا کھنڈر نما مکان چار سال سے کسی طرح بکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس لیے کہ اس مکان میں بہاری لعل کی موت بڑے دردناک انداز میں واقع ہوئی تھی۔ اس کی موت کے کوئی چھ مہینے کے بعد اس کی جوان بیٹی کا شوہر لالہ امر ناتھ بھی کسی نامعلوم بیماری کا شکار ہوکر چل بسا تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ اس مکان میں نحوست نے بسیرا کرلیا ہے' کوئی بدروح رہنے لگی ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود آخرکار کسی نے اس مکان کو خرید ہی لیا۔ بہاری لعل کی جوان بیوہ بیٹی مدھومتی نے اس مکان کو اونے پونے دام میں بیچا اور اپنے دونوں بچوں کو لے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کانپور چلی گئی۔ جہاں اس کے رشتے دار رہتے تھے۔

اس مکان کے فروخت ہونے سے محلے والوں کو حیرت اور تجسس ہوا تھا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ مالک مکان کون ہے۔ مالک مکان ایک دن کے لیے بھی نہیں آیا تھا۔ اس مکان کو خریدتے ہی اس کے ملازموں نے کام شروع کردیا تھا۔ ایک ٹھیکے دار کو ٹھیکہ دے دیا تھا۔ ٹھیکے دار نے پرانا مکان ڈھادیا۔ اس کی جگہ ایک نئے اور عالی شان مکان کی تعمیر شروع کردی گئی۔ کام بڑی تیزی سے شروع ہوا دیکھتے ہی دیکھتے صرف چھ مہینے میں دو منزلہ مکان بن کر کھڑا ہوگیا۔ اتنا خوب صورت اور پُرشکوہ مکان سارے محلے میں کسی کا نہ تھا۔ محلے والوں نے ٹھیکے دار سے بھی مالک مکان کے بارے میں پوچھا تو اس نے لاعلمی ظاہر کی۔ اس طرح مالک مکان کی شخصیت پُراسرار ہوگئی تھی اور اس کے بارے میں جاننے کا اشتیاق روز بہ روز بڑھتا جارہا تھا۔

جب مکان پوری طرح تیار ہوگیا تب آرائش و زیبائش کے لوازمات ٹرکوں میں آکر اترنے لگے تو دیکھنے والوں کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ ائرکنڈیشنر' فریج' رنگین ٹیلی ویژن' وی سی آر' قالین' شان دار صوفہ سیٹ اور ڈیکوریشن کے لوازمات۔ کوئی کمرہ ایسا نہیں تھا جسے پوری طرح آراستہ و پیراستہ نہ کیا گیا ہو۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس مکان میں کسی ریاست کے راجا رانی رہنے کے لیے آرہے ہوں۔

محلے والوں نے سنا تھا کہ اس مکان کی مالک

شوبھا دیوی ہے۔ وہ اتوار کے روز آرہی ہے۔ کون شوبھا دیوی..... یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ ہندوستان میں ایک نہیں' ہزاروں نہیں' لاکھوں شوبھا دیویاں ہوں گی۔ بہرحال وہ جو بھی تھی اسے دیکھنے کا ہر کسی کو بے حد اشتیاق تھا۔ اتوار کا بے چینی سے انتظار کیا جانے لگا تھا جیسے ان کا کوئی عزیز آرہا ہو۔

اتوار کے دن صبح دس بجے گلی میں ایک بے حد شان دار اور نئے ماڈل کی کار داخل ہوکر اس مکان کے سامنے رکی تو اس گلی کے تمام مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں سے جھانکنے والوں میں سنسنی پھیل گئی۔ ایسی کاریں تو صرف فلمی ستاروں کے پاس یا پھر بمبئی کے مارواڑیوں کے پاس ہوا کرتی تھیں۔ اس کار کا ڈرائیور سفید وردی میں ملبوس تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا مگر چاق و چوبند اور صحت مند تھا۔ اگلی نشست پر جو پچاس برس کے لگ بھگ عورت سفید ساڑھی اور بلاؤز میں تھی وہ ملازمہ لگ رہی تھی۔ کار کی پچھلی نشست پر مالکن بیٹھی تھی۔

جیسے ہی گاڑی مکان کے سامنے رکی تو ڈرائیور گاڑی سے باہر نکلا اور بڑی سرعت سے اس نے کار کا پچھلا دروازہ کھولا۔ ایک سینتیس اڑتیس برس کی عورت اپنا قیمتی لباس اور سراپا سمیٹتی ہوئی باہر آئی۔ وہ اتنی خوب صورت نہیں تھی جتنا اس کا لباس تھا۔ اس کے گلے میں بیش قیمت جڑاؤ ہار پڑا تھا۔ اس کے ہیرے اپنی چمک اور آب و تاب دکھا رہے تھے۔ کانوں کے بُندوں میں بھی ہیرے جڑے تھے۔ اس کی کلائیوں میں بھی جڑاؤ کڑے تھے۔ انگلیوں میں انگوٹھیاں تھیں۔

شوبھا دیوی نے کار سے اتر کر سیکڑوں نگاہوں کو اپنے بدن پر محسوس کیا تھا مگر اس نے ان کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنا چرمی پرس دوسرے ہاتھ سے میسور سلک کی شوخ رنگ ساڑی کا پلو شانے اور سینے پر سے درست کرتے ہوئے مکان کو نیچے سے اوپر تک ناقدانہ نظروں سے دیکھا پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی مکان کے اندر داخل ہوئی تو اس کے پیچھے پیچھے اس کی ملازمہ بھی تھی۔ اس کے مکان کے اندر داخل ہوتے ہی ڈرائیور نے کار کی ڈکی کھولی تو وہ ملازم جو مکان میں موجود تھے انہوں نے آگے بڑھ کر ڈکی میں سے سوٹ کیس نکالے۔ کل چار بڑے بڑے سوٹ کیس اور دو عدد چرمی دستی بیگ تھے۔ ملازم یہ سارا سامان ایک ایک کرکے اندر لے گئے۔

''ارے یہ تو اپنی شوبھا دیوی ہے۔'' ایک عورت کے منہ سے حیرت اور خوشی کے مارے چیخ سی نکل گئی۔

''کون شوبھا دیوی!'' قریب کھڑی عورت نے پوچھا۔ جو شوبھا دیوی کا چہرہ ٹھیک سے نہیں دیکھ سکی تھی۔

''نتھو رام کی بیٹی شوبھا دیوی!'' پہلی عورت نے بتایا۔ ''وہی جو اسکول میں پڑھا رہی تھی۔''

''مگر یہ شوبھا دیوی کیسے ہوسکتی ہے؟'' تیسری عورت نے حیرت کا اظہار کیا۔ ''وہ تو غریب باپ کی غریب بیٹی تھی۔ اس کے پاس تھا ہی کیا۔ شوبھا کی شادی کس لیے نہیں ہو پائی یہ بات ساری دنیا جانتی تھی۔ باپ کے پاس جہیز نہیں تھا اور بیٹی کے پاس شکل وصورت نہیں تھی۔ اس کے پاس پچاس برس میں بھی اتنی دولت نہیں آسکتی ہے۔''

''میں دس روپے کی شرط لگانے کو تیار ہوں کہ یہ وہی شوبھا دیوی ہے۔'' پہلی عورت نے بڑے وثوق سے کہا۔

''آٹھ سال کے عرصے میں وہ اتنی بڑی امیر کبیر عورت بن گئی ہے کہ یقین نہیں آرہا ہے۔'' چوتھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عورت نے اپنے بچے کو کمر سے لگاتے ہوئے کہا۔
"سوچنے کی بات ہے کہ اس کے پاس اتنی ساری دولت کہاں سے آ گئی؟ دیکھا نہیں اس کے بدن پر سونے اور ہیرے جواہرات کے زیورات کیسے چمک رہے تھے۔ وہ کوئی حسین عورت تو ہے نہیں کہ اس کی قسمت میں چار چاند لگ جائیں۔ ایک بدصورت عورت کا دولت مند بن جانا ناقابل یقین بات ہے۔"
"کیا پتا بمبئی جا کر اسمگلروں کے گروہ میں شامل ہوگئی ہو۔" ایک بوڑھی عورت نے سرگوشی کی۔
"کچھ دیر کے بعد چل کر اس سے پوچھتے ہیں۔ اس کا دولت مند بننے کا بھید لیتے ہیں۔" پہلی عورت نے تجویز پیش کی۔
"شوبھا دیوی کو اچھی طرح سے جانتی تھی کہ وہ ایک معمولی سی صورت والی عورت ہے۔ وہ اس حقیقت سے واقف تھی کہ عورت کا چہرہ اچھا ہو تو اس کا بدن بھی اچھا لگتا ہے۔ محلے کی جو لڑکیاں اور عورتیں اس سے ملنے کے لیے آئی تھیں وہ اس کی خوب تعریف کر کے گئی تھیں۔ اس سے زیادہ اس کے لباس، گھر، ساز و سامان اور زیورات کی تعریف کر کے اور اس کی شخصیت سے متاثر ہو کر گئی تھیں۔
"آٹھ سال پہلے یہاں سے اچانک چلی گئی تھیں نا؟" ایک عورت بولی۔
اس کا کہنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ آٹھ سال پہلے کسی کے ساتھ بھاگ کر گئی ہو۔ ایک ایسی عورت جو آٹھ سال پہلے تیس سال کی تھی اور کوئی خوب صورت بھی نہیں تھی اسے کون مرد بھگا کر لے جا سکتا ہے۔ وہ مسکرائی۔
"یہ میں اچانک نہیں گئی تھی اپنے ایک رشتے دار کے ساتھ چلی گئی تھی۔"
"کیا آپ کی شادی ہوگئی؟" ایک دوسری عورت نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔
شوبھا دیوی دل میں ہنس رہی تھی۔ اس کے محلے کی عورتیں جو پہلے اسے گھاس تک نہیں ڈالتی تھیں آج کیسے ادب سے آپ آپ کہہ کر باتیں کر رہی تھیں۔
"میں شادی شدہ ہوں۔"
"اچھا!" جیسے اس عورت کو یقین نہیں آیا۔
"آپ کے شوہر کیا کرتے ہیں؟"
"وہ بمبئی شہر کے کروڑ پتی لوگوں میں سے ایک ہیں، ان کے بہت سارے کاروبار ہیں۔ کپڑے کے کارخانے بھی ہیں، مدراس، بنگلور، بمبئی اور کلکتہ میں ان کے بڑے بڑے ہوٹل اور ریسٹورنٹ ہیں۔"
عورتیں اور لڑکیاں نہ صرف اس کی قسمت پر رشک کر رہی تھیں بلکہ اس کی خوش نصیبی پر اندر ہی اندر بُری طرح جل بھی رہی تھیں۔ اگر وہ حسین و جمیل عورت ہوتی تو اس میں اتنی حیرت کی بات نہ تھی۔ اس لیے کہ ایک دولت مند مرد کا حسین عورت پر فدا ہو کر شادی کر لینا فطری امر تھا لیکن یہ یقین کرنے والی بات نہیں تھی کہ ایک بے حد پرکشش عورت میں ایک کروڑ پتی شخص کو کوئی خوبی نظر آئی ہو اور اس نے شادی کر لی ہو، کیا اس مرد کے لیے ہندوستان کی حسین عورتیں مر گئی تھیں؟ یا اس شوبھا دیوی نے اس شخص کو کچھ گھول کر پلا دیا تھا جو وہ اس سے شادی کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ان عورتوں نے کسی نہ کسی طرح یہ راز جاننے کی کوشش کی تھی۔ اسے بڑا کریدا تھا۔ شوبھا دیوی خوب صورت تو نہ تھی، لیکن اسے ہر بات کو خوب صورتی سے ٹالنے کا فن آتا تھا۔ عورتیں اپنا سا منہ لے کر رہ گئی تھیں۔
وہ تین چار روز تک نہ صرف ملنے آنے والوں کی خوب خاطر مدارات کرتی رہی تھی بلکہ اپنی سہیلیوں اور دوستوں سے ملتی رہی تھی۔ اس نے ماضی کی بہت ساری یادوں کو تازہ کیا تھا۔ وہ بہت ساری یادیں لے

کر آئی تھی۔ اس نے یہ مکان اس لیے خریدا تھا کہ وہ یہیں پیدا ہوئی، پلی اور بڑھی تھی۔ اس کی بہت ساری یادیں اس محلے سے اور شہر سے وابستہ تھیں۔
ایک روز شام کے وقت وہ اپنی شان دار کار ڈرائیو کرتے ہوئے گرین پارک کی طرف نکل گئی تھی۔ وہ گرین پارک میں رمیش کے ساتھ کئی بار جا چکی تھی۔ اسے امید تھی کہ آج بھی آٹھ سال کے بعد اسے رمیش گرین پارک میں مل جائے گا۔ وہ رمیش سے ملنا چاہتی تو اس کے گھر پر بھی جا کر مل سکتی تھی، مگر وہ اس کے گھر جانا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے کہ رمیش کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ بال بچے دار ہو چکا تھا۔
اس نے اپنی گاڑی پارکنگ لاٹ میں پارک کی۔ وہ گاڑی سے اتر کر پارک میں داخل ہوئی تو بہت ساری نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ اس لیے کہ وہ بہترین لباس میں تھی۔ اپنی وضع قطع سے امیر کبیر عورت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ پارک کی رونقیں دیکھتی ہوئی اس گوشے کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں بیٹھ کر وہ رمیش سے باتیں کرتی تھی۔ ابھی وہ اس جگہ پہنچی ہی تھی کہ اس کے کانوں میں ایک آواز رس گھول گئی۔
"شوبھا!"
اس آواز کو سنتے ہی وہ رک گئی۔ اس نے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا۔ اس آواز کے اس پکار کے لیے تو وہ آئی تھی۔ رمیش اس کی طرف تیزی سے چلا آ رہا تھا۔ ان آٹھ برسوں میں رمیش موٹا اور بھدا سا ہو گیا تھا لیکن وہ آج بھی پہلے کی طرح خوب صورت تھا۔ رمیش کو دیکھ کر اس کا دل دھڑکنے لگا۔ رمیش اس کے قریب پہنچ کر رکا۔
"ہیلو شوبھا!" شوبھا نے محسوس کیا کہ وہ اس کی شخصیت سے نہیں اس کی امارت سے متاثر نظر آ رہا ہے۔ "میں نے تمہیں گاڑی سے اترتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ تمہاری کار بڑی شان دار اور بالکل نئی ہے۔ کسی نئی نویلی دلہن کی طرح لگ رہی ہو۔"
شوبھا کے دل کے کونے میں دکھ کی لہر اٹھی۔ آٹھ برسوں کے بعد ملاقات ہو رہی ہے تو رمیش نے اس کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ اس نے درد کو سہتے ہوئے پوچھا۔
"تم کیسے ہو رمیش؟"
"دیکھ لو....." وہ بولا۔ "میں تم سے اس روز سے ملنے کے لیے تڑپ رہا ہوں جس روز تم آئی ہو۔ محلے میں آج کل تم اور تمہاری کار، دولت اور مکان موضوع بنے ہوئے ہیں۔"
"تم میرے گھر آ جاتے مجھ سے ملنے....."
"میں نے سوچا تھا، مگر اس لیے نہیں آیا کہ تمہیں محلے کی عورتوں سے فرصت نہیں تھی۔" رمیش مسکرایا۔ "میں روز پارک آنے لگا اس خیال سے کہ تم شاید پارک آؤ۔"
وہ رمیش سے محبت کرتی تھی لیکن رمیش اس سے محبت نہیں کرتا تھا۔ بس ایک دوست کی حیثیت سے ملتا تھا۔ ان دنوں رمیش غیر شادی شدہ تھا۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ رمیش کو اس سے زیادہ اس کی جوانی اور شباب سے دلچسپی ہے۔ ایسی لڑکیاں جو خوب صورت نہیں ہوتیں۔ وہ نہ صرف احساس کمتری کا شکار ہوتی ہیں بلکہ تنہا ہوتی ہیں۔ مرد اسے محسوس کر لیتے ہیں۔ مرد یہ سوچتے ہیں کہ ایسی لڑکیوں اور عورتوں سے دل بہلانے اور وقت گزارنے میں حرج ہی کیا ہے اور پھر ایسی لڑکیاں مردوں کی ذرا سی ہمدردی اور محبت پا کر پکے ہوئے پھل کی طرح ان کی جھولی میں جا گرتی ہیں۔ مفت میں اچھا وقت گزر جائے تو حرج کیا ہے۔ اس نے رمیش کو ایک حد سے زیادہ تجاوز کرنے نہیں دیا تھا۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ رمیش نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شادی نہیں کی۔ وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہتی تھی۔ ایک غریب اور بدصورت لڑکی کا مستقبل کیا ہے رمیش کے علاوہ دو ایک اور مردوں نے نے اس میں دلچسپی لینا شروع کی تھی۔ اس میں ایک اسکول ٹیچر تھا جو اسی اسکول میں پڑھاتا تھا جس میں وہ پڑھاتی تھی۔ دوسرا اس کا پڑوسی تھا۔ وہ اس سے کیا چاہتے تھے۔ وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ وہ ایک عورت تھی محبت کی بھوکی تھی۔ وہ کوئی داشتہ نہیں تھی جو اپنے آپ کو ان کے پاس رہن رکھ دیتی۔ آج رمیش کو پارک میں انتظار کرتا پا کر اسے خوشی ہوئی تھی۔ آج رمیش نے اس کا انتظار کیا۔ بلکہ اسی روز سے انتظار کرتا رہا تھا جس روز سے وہ آئی تھی جب کہ ماضی میں اس نے ہمیشہ رمیش کا انتظار کیا تھا۔

"کیوں نہ ہم اس گوشے میں چلیں جہاں پہلے بیٹھتے تھے۔" اس نے تجویز پیش کی۔

"جو تمہاری مرضی لیکن میرا خیال یہ تھا کہ کار میں کچھ دیر گھومتے اور کسی ہوٹل میں چل کر کچھ پیتے۔"

"چلو..... یہی سہی۔"

وہ اپنی کار میں رمیش کو بنگلور کی سڑکوں پر لے کر گھومتی رہی۔ وہ راجا جی نگر کی طرف نکل آئے۔ وہ اسے گیز بیو میں لے آئی۔ رمیش اندر داخل ہو کر اس کے طلسماتی ماحول سے احساس کمتری کا شکار ہو گیا تھا۔ یہاں فلمی ستارے، ساہوکار اور سرکاری افسران پینے اور وقت گزارنے کے لیے آتے تھے۔ اس نے پوچھا۔

"کیا پیو گے؟"

"بیئر!" رمیش بولا۔

تھوڑی دیر کے بعد رقص کا دور شروع ہوا تو وہ دونوں رقص کرنے کے لیے اٹھے۔ اس نے شراب پینا ہی نہیں رقص کرنا بھی سیکھ لیا تھا۔ رمیش رقص اس لیے بھی جانتا تھا کہ وہ ایک میوزیکل سینٹر میں چھ برس ملازمت کرتا رہا تھا۔ وہ رقص کے دوران شوبھا کی آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر رمیش نے کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے اپنی طرف کھینچا تو وہ اس کے اتنے قریب ہو گئی کہ اسے اپنے چہرے پر اس کی سانسوں کی تپش محسوس ہونے لگی۔

"تم پہلے سے زیادہ حسین، پُرکشش اور گداز ہو گئی ہو۔" رمیش اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا خواب ناک لہجے میں بولا۔

وہ کوئی بچی نہیں تھی۔ سینتیس سال کی ایک حقیقت پسند عورت تھی۔ وہ مردوں سے واقف تھی۔ مرد کو جب عورت کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ اسی عورت کی تعریف کرتا ہے۔ وہ نہ تو حسین تھی اور نہ ہی پُرکشش۔ نہ اس کے بدن میں گداز پن تھا۔ وہ اس جھوٹ پر بے اختیار مسکرا دی تو رمیش سمجھا کہ اس کا جادو چل گیا ہے اس نے کہا۔

"یہ تمہاری مسکراہٹ کتنی پُرکشش ہے۔"

یہ دوسرا بڑا جھوٹ تھا۔ اس کے لبوں پر ایک تلخ سی ہنسی پھیل کر حساس گوشوں میں اتر گئی۔ رمیش جذباتی ہونے لگا۔ کچھ زیادہ ہی گرم جوشی کا اظہار کرنے لگا۔ جیسے وہ کوئی اٹھارہ برس کی لڑکی ہو۔ ایک مرد کے ہاتھوں کے لمس سے اس کے سارے بدن میں سنسنی دوڑ جائے گی۔ اس پر رمیش کی شوخی کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ کسی بے جان شے کی طرح اس کے ہاتھوں میں ڈولتی رہی پھر وہ دونوں اپنی میز پر آ بیٹھے۔ رقص ختم ہو چکا تھا۔

"کیا تمہارے زیورات میں ہیرے جڑے ہیں؟" رمیش نے پوچھا۔

"ہاں!" اس نے بیئر کا گھونٹ لیا تو اس کا ذائقہ بے حد تلخ محسوس ہوا۔

"تمہاری ساڑی کتنی قیمتی اور خوب صورت ہے۔" رمیش کے لہجے میں حسرت سی تھی۔

رمیش اس کے لباس، اس کے زیورات اور گاڑی کی تعریفیں کرتا رہا۔ وہ اپنے لباس اور زیورات کی تعریف سننے کے لیے تو نہیں آئی تھی۔ وہ تو محبت کے دو بول سننے کے لیے آئی تھی۔ رمیش آٹھ سال پہلے بھی اس کی تعریفیں کرتا تھا اور آج بھی کر رہا تھا۔ اس نے نہ تو پہلے کبھی اس سے محبت کا اقرار کیا تھا اور نہ ہی آج اس کی زبان پر محبت کا لفظ آیا تھا۔ وہ رمیش کی زبان سے محبت کے بول سننے کے لیے تڑپ رہی تھی۔ "دو بول" آج تک کسی مرد نے اس سے محبت کے دو بول نہیں بولے تھے، اس کے بوڑھے شوہر نے بھی نہیں۔ اس کے بوڑھے شوہر نے اس سے اس لیے شادی کی تھی کہ اس نے اس شخص کو موت سے بچایا تھا۔ ایک نئی زندگی دی تھی اور پھر اس بوڑھے نے اسے اپنی بیوی بنا لیا تھا۔ پانچ برسوں میں اس نے ایک بار بھی یہ نہیں کہا تھا کہ مجھے تم سے محبت ہے وہ اکثر اس سے کہتا تھا تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ یہ کہتے کہتے وہ مر گیا تھا مگر شوبھا نے یہاں کسی کو نہیں بتایا تھا کہ اس کا شوہر مر گیا ہے وہ ایک بیوہ عورت ہے۔

"آج جمعہ ہے۔" رمیش بولا۔ "کل صبح میری بیوی، بچوں کو لے کر دو تین دن کے لیے رام گڑھ جا رہی ہے۔"

"تو.....؟" وہ درمیان میں بولی۔

"کل شام ہم سیر و تفریح کے لیے میسور نکل جاتے ہیں۔ رات کسی ہوٹل میں گزاریں گے اور ماضی کی باتیں کریں گے۔"

"کیا میں صرف تمہارے ساتھ راتیں گزارنے کے لیے آئی ہوں؟" نہ چاہتے ہوئے بھی یکا یک اس کا لہجہ تند ہو گیا۔ "کیا میں اتنی خوب صورت ہوں کہ میرے ساتھ ایک مرد وقت گزار سکے؟"

"تم بہت خوب صورت ہو شوبھا!" رمیش نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "اس عمر میں بہت کم عورتیں خوب صورت دکھائی دیتی ہیں۔ سچ پوچھو تو حسین اور جوان لڑکیاں بھی تمہارے سامنے کچھ نہیں ہیں۔"

اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اپنے پرس میں سو کا نوٹ نکال کر اسے بیئر کی بوتل کے نیچے دبا دیا۔ پھر وہ اس سے تند لہجے میں بولی۔

"یہ مردوں کا پرانا حربہ ہے کہ وہ عورت کو تنہائی کا ساتھی بنانے کے لیے اس کی جھوٹی تعریفیں کرتے ہیں۔ تم پہلے بھی مجھے مالِ مفت سمجھ کر میرے حسن کی تعریفیں کرتے تھے اور آج اس لیے کر رہے ہو کہ میں دولت مند ہوں پھر میں تمہارے مالِ مفت بن جاؤں گی۔ مجھے ایسے مردوں سے روز ہی واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ تم بھی انہی مردوں میں سے ہو۔ آئندہ میرے قریب بھٹکنے کی کوشش بھی نہیں کرنا۔"

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ وہ ششدر سا ہو کر اسے جاتا دیکھتا رہا۔ وہ دل میں حیران تھا کہ اس نے شوبھا کی جھوٹی تعریف تو نہیں کی تھی۔ فراغت، آسودگی اور دولت نے اسے واقعی حسین بنا دیا تھا۔ وہ پُرکشش اور گداز بھی ہو گئی تھی پھر وہ آج بھی کس لیے احساس کمتری میں مبتلا ہے۔

وہ شوبھا سے یہ بھی کہنا چاہتا تھا کہ مجھے تم سے آٹھ سال پہلے محبت نہیں تھی مگر آج میرے دل میں تمہاری محبت کا چراغ روشن ہو گیا ہے، لیکن شوبھا نے اسے اس کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔

❁

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حقیقی مسرت

محترم عمران بھائی!
السّلام علیکم'
سورہ الشوریٰ کی آیت نمبر چالیس کو بنیاد بنا کر ایک کہانی تحریر کرنے کی کوشش کی ہے۔ معاف کرنا اللہ کو پسند ہے اور وہ خود بہت معاف کرنے والا ہے' کاش اس کہانی کے ذریعے میں اپنی بہنوں میں اس بہترین خوبی کو اُجاگر کرسکوں۔ کیونکہ عورتوں میں بغض اور انتقام کی برائی زیادہ پائی جاتی ہے۔
اللہ ہم سب کو اس نیکی کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین
آپ کے لیے دعا گو
شبنی ارشاد
کراچی

''فہد بیٹا! اٹھ جاؤ' دیکھو نماز کا وقت تنگ ہورہا ہے۔'' امی کتنی ہی دیر سے فہد کو فجر کی نماز کے لیے اٹھا رہی تھیں۔ مگر فہد بہت گہری نیند میں تھا' ان کے بہت ہلانے جُلانے پر وہ کسمسا کر ذرا سی آنکھ کھولتا پھر دوبارہ سو جاتا۔ امی اسے اس وقت تک جگانے کی کوشش کرتی رہتیں جب تک سورج نہ نکل آتا' پھر ہمیشہ کی طرح ناکام ہوکر وہ کچن میں چلی آتیں۔

یہ ان کا روز کا معمول تھا مگر فہد کبھی بھی ان کے جگانے پر نہ جاگتا بعض مرتبہ تو وہ اٹھ کر ان پر بُری طرح چیخ پڑتا اور کہتا۔

''ابھی دو گھنٹے پہلے ہی تو سویا ہوں' مت میری نیند خراب کریں۔ آپ کو کیا ہے؟ نماز پڑھنا یا نہ پڑھنا میرا ذاتی فعل ہے۔ پڑھوں یا نہ پڑھوں۔'' تب امی ناراض ہوئے بنا بڑے پیار سے کہتیں۔

''بے شک میرے بچے یہ ہر انسان کا ذاتی فعل ہے کہ وہ اپنی صبح کا آغاز اپنے ربّ کی حمد وثناء کے ساتھ کرے' وہ ربّ جس نے تمہیں اتنی ساری نعمتیں دیں' کیا اس کا شکر ادا کرنا تمہارا فرض نہیں ہے اور میرے بچے بے نمازی مسلمان کو آخرت میں اس کی سزا جہنم کے عذاب کی صورت میں بھگتنا پڑے گی اور میں نہیں چاہتی کہ تمہیں یہ دردناک عذاب ملے۔''

''امی خدا کے لیے..... پلیز..... دن میں کسی وقت لیکچر دے دیجیے گا' اس وقت مجھے سونے دیں۔'' وہ جھنجلا کر اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہتا اور دوبارہ بستر پر لیٹ کر آنکھیں موند لیتا اور وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے واپس پلٹ جاتیں۔

''جاتے ہوئے لائٹ بند کردیجیے گا۔'' وہ لیٹے لیٹے کہتا اور وہ لائٹ آف کر کے کمرے سے باہر آجاتیں اور صدقِ دل سے دعا کرتیں کہ اللہ تعالیٰ فہد کو نماز کی پابندی کی توفیق عطا فرمائے۔

وہ ہمیشہ سے ایسا بدلحاظ نہیں تھا۔ چھوٹا سا تھا جب سے انہوں نے اسے نماز کی عادت ڈال دی تھی مگر فہد جیسے جیسے جوان ہوتا گیا اس کی نمازیں چھوٹتی چلی گئیں اور آج جب وہ ایک بھرپور جوان اور کامیاب انسان بن گیا تھا تو اس نے نماز بالکل ہی چھوڑ دی تھی۔

☆

بیگم فہیم ایک نیک دین دار اور باپردہ خاتون تھیں۔ وہ اس وقت بیوہ ہوگئی تھیں جب فہد صرف تین سال کا تھا' ان دنوں ان کے بطن میں ایک اور ننھا سا وجود پرورش پارہا تھا' وہ فہیم کے ساتھ ایک بہت خوش گوار

ازدواجی زندگی گزار رہی تھیں۔ ان کے والد کا گھرانا بھی دین دار تھا اور والدین نے اپنی بیٹی کے لیے بھی ایک دین دار گھرانا ہی پسند کیا۔ فہیم ڈاکٹر تھے' مگر لوگوں کو دوائے دل دینے والے خود اپنے ہی دل کے ہاتھوں بے بس ہوگئے' وہ اتنا بے وفا نکلا کہ اچانک ہی چلتے چلتے رک گیا۔

عالیہ بیگم کے لیے یہ وہ صدمہ تھا جو اُن سے برداشت ہی نہیں ہورہا تھا مگر وہ ایک صابرہ خاتون تھیں۔ بار بار قرآنی آیت دہراتیں' انّ للہ و انا الیہ راجعون پڑھتیں۔ کبھی خود اپنے آپ کو تسلی دیتیں اور پڑھتیں ان اللہ مع الصابرین۔ صبر کے نام پر انہوں نے پتھر کی سل اپنے دل کی جگہ رکھ لی۔ انہیں جینا تھا اپنے بچوں کے لیے' فہد تو ان کی گود میں تھا مگر ایک اور بچہ اس دنیا میں آنے والا تھا۔ وہ وقت ان کے لیے بہت تکلیف دہ تھا' وہ کس طرح گزرا' بیان کرنے سے باہر ہے پھر انہیں ایک اور درد سے گزرنا پڑا جب ان کی کوکھ سے ایک مردہ بچے نے جنم لیا۔ اللہ نے ان کے صبر کا ایک اور امتحان لیا تھا مگر اس صدمے کو بھی وہ ''اللہ کی رضا'' جان کر جھیل گئیں۔

وہ جوان تھیں' حسین تھیں۔ سب نے کہا کہ عالیہ کی دوسری شادی کردی جائے مگر انہیں فہیم سے اتنی محبت تھی کہ وہ کسی اور کو ان کی جگہ نہیں دے سکتی تھیں۔ جب امی نے بہت زور دیا زمانے کی اونچ نیچ کے بارے میں بھایا تو انہوں نے کہا۔

''آپ بالکل درست فرمارہی ہیں مگر میں ایک اکیلی اور باپردہ عورت ہوں اور الحمدللہ اپنی حفاظت خود کرسکتی ہوں۔ فہیم کو اللہ نے اپنے پاس واپس بلالیا' وہ اس کی امانت تھے میرا اس پر ایمان اور بھروسہ ہے وہی میری اور فہد کی حفاظت کرے گا' ہمارا رازق بھی وہی ہے اور ربّ بھی وہی ہے۔''

عالیہ نے کچھ اتنے اعتماد اور یقین سے یہ سب کہا کہ امی ان کی شکل دیکھتی رہ گئیں۔ عالیہ نے بہت سوچا اور بار بار اللہ سے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ انہیں کوئی ایسا بہترین اور محفوظ طریقہ سمجھا دے کہ جو وسیلۂ روزگار بن جائے۔

فہیم ورثے میں ایک چھ سو گز کا بنگلہ اور اچھا خاصا بینک بیلنس چھوڑ کر گئے تھے' عالیہ نے اپنے سسر کے مشورے سے ایک اسکول کھول لیا۔

سسر کا ساتھ تھا اور ان کے مشورے سے ایک دو سال میں اسکول بہترین طریقے سے چل نکلا۔

ان کے دل کی ہر خواہش مرچکی تھی۔ سامنے تھا تو صرف فہد۔ وہ اسے ایک بہترین مسلمان اور بہترین انسان بنانا چاہتی تھیں۔ اس کی بہترین تربیت کی' اسکول کے بعد ان کا سارا وقت یا تو فہد کے ساتھ گزرتا یا ذکر اللہ میں۔ کبھی کبھی ان کی بہترین اور مخلص دوست ناہید ان کے پاس آجاتی' جنہوں نے عالیہ کو بہت اخلاقی سپورٹ دی۔

وقت گزرتا گیا۔ فہد جوان ہوگیا۔ ان کے والدین اور ساس سسر ایک کے بعد ایک ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔ اب وہ تنہا ہی اسکول کا سارا انتظام دیکھتی تھیں۔ حالاں کہ ان کا بہت بڑا اسٹاف تھا مگر پھر بھی وہی سارا انتظام دیکھتی تھیں۔

☆

ان دنوں وہ فہد کی جانب سے بہت زیادہ پریشان رہنے لگی تھیں' ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ فہد کی پرورش میں ان سے کہاں کوتاہی ہوگئی' وہ کیوں اتنا بدل گیا' کیوں ان کی ساری تعلیم وتربیت کو بھول گیا؟

وہ رات دیر تک کمپیوٹر پر نیٹ لگا کر بیٹھا رہتا تھا' کبھی فون پر رات رات بھر باتیں کرتا رہتا تھا۔

ان کی راتوں کی نیندیں تو ویسے ہی کم ہوگئی تھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فہیم کے جانے کے بعد انہیں یاد نہیں کہ وہ کبھی پوری رات سوئی ہوں۔ صبح تین بجے وہ تہجد کے لیے بیدار ہوجاتیں تو انہیں فہد کے کمرے کی لائٹ جلتی ہوئی ملتی۔

انہوں نے فہد سے پوچھا بھی کہ وہ راتوں کو جاگ کر آخر کرتا کیا ہے تو وہ ہنس کر کہتا "بتادوں گا۔"

فہد نے ایم بی اے کیا تھا اور ایک ملٹی نیشنل فرم میں اچھے عہدے پر فائز تھا' وہ خوش بھی تھیں اور مطمئن بھی مگر فہد کی نماز سے دوری انہیں بے قراری میں مبتلا رکھتی۔

انہوں نے سوچا کہ فہد ماشاء اللہ اب برسر روزگار ہے' اس کی شادی کردینی چاہیے۔ ناہید سے مشورہ کرنے کی خاطر وہ اس کے گھر جا پہنچیں۔

اور اس دن پہلی بار انہوں نے ناہید کی بڑی بیٹی حرا کو غور سے دیکھا اور اس کی پاکیزہ اور من موہنی صورت جیسے ان کے دل میں اترتی چلی گئی' سفید دوپٹے کے ہالے میں اس کا چاند جیسا چہرہ جگمگا رہا تھا۔ وہ باپردہ اور باحیا تھا' یونیورسٹی سے ماسٹرز کررہی تھی' یہ اس کا فائنل ائر تھا۔ انہوں نے اسی وقت فیصلہ کرلیا کہ وہ حرا کو ہی اپنی بہو بنائیں گی۔ لگے ہاتھوں انہوں نے ناہید سے بھی اس کا ذکر کرڈالا تو وہ بولیں۔

"تم فہد سے اور میں حرا سے بات کرلیتی ہوں' ویسے مجھے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے' ان شاء اللہ میں کل تمہیں اس کا جواب دے دوں گی۔ ویسے مجھے امید ہے کہ اسے بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا کیوں کہ اس نے یہ فیصلہ مجھ پر چھوڑا ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو' نیک بچیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔" عالیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مگر اس وقت انہیں بہت سخت مایوسی ہوئی جب انہوں نے فہد سے بات کی اور فہد نے صاف انکار کردیا۔

"مگر بیٹا! تم اس انکار کی کوئی ٹھوس وجہ بھی تو بتاؤ۔ میں تو ناہید سے تمہارے اور حرا کے رشتے کی بات بھی کرچکی ہوں۔" عالیہ نے گھبرا کر کہا۔

"اس کی سب سے اہم وجہ تو یہ ہے امی کہ میں آپ سے پہلے کسی اور سے وعدہ کرچکا ہوں۔ میری زندگی کا اتنا اہم فیصلہ کرنے سے پہلے آپ کو مجھ سے بات کرنی چاہیے تھی۔" فہد نے تیز لہجے میں کہا۔

"وعدہ کرچکے ہو.....؟" عالیہ نے حیرت سے کہا۔

"مگر کس سے.....کون ہے وہ؟"

"میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔ وہیں ہم نے ایک دوسرے کو سمجھا اور پسند بھی کیا۔ اب وہ میرے ساتھ ہی آفس میں جاب کرتی ہے حالاں کہ اسے جاب کی ضرورت نہیں ہے' کیوں کہ وہ لینڈ لارڈ فیملی سے تعلق رکھتی ہے' مگر اس نے یہ جاب اسی لیے کی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت میرے ساتھ گزار سکے۔" فہد نے نرم لہجے میں کہا اور عالیہ کی شکل دیکھنے لگا۔ جس کے چہرے پر ہزاروں ویرانیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ فہد کی یہ بات سن کر اسے شدید شاک لگا تھا' وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کے بیٹے کے کسی لڑکی سے تعلقات بھی ہوسکتے ہیں اور اس کی خاطر وہ ماں کے خلاف بھی جاسکتا ہے۔

"مگر فہد! میری بات کا کیا ہوگا' ذرا سوچو کہ میری کتنی بے عزتی ہوگی' ناہید کیا سوچے گی۔" عالیہ کے لہجے میں احتجاج چھپا تھا۔

"یہی بات میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ شہلا کے سامنے میری کتنی بے عزتی ہوگی' وہ کیا سوچے گی میرے بارے میں کہ میں اتنے عرصے سے اسے دھوکا دیتا رہا۔" فہد نے کہا تو عالیہ نے بیٹے کی محبت کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے فہد! ناہید سے میں بات کرلوں گی اب وہ جو بھی سوچے میرے بارے میں یا تمہارے بارے میں' مگر میری ایک شرط ہے؟"

"شرط.....! وہ کیا؟" فہد کے لبوں پر اپنی جیت کی مسکراہٹ آ گئی۔

"تم مجھے شہلا اور اس کی فیملی سے ملواؤ' اگر شہلا میرے اور اس گھر کے معیار پر پوری اتری تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری شادی اسی سے کروں گی' ورنہ پھر تمہیں میری بات ماننی پڑے گی۔"

"آپ کا معیار کیا ہے امی.....؟" فہد نے سب کچھ جانتے ہوئے زچ ہونے کے انداز میں سوال کیا۔

"یہ تم اچھی طرح جانتے ہو فہد! مجھے ایک نیک شریف اور دین دار لڑکی چاہیے۔" عالیہ نے کہا۔

"شہلا بہت اچھی لڑکی ہے امی! وہ شریف اور نیک ہے اور سب سے اچھی بات یہ کہ اس نے میرے علاوہ کسی اور لڑکے کے بارے میں نہیں سوچا۔" فہد نے کہا۔

"ٹھیک ہے' تم آج شام ہی مجھے اس کے گھر لے چلو۔" عالیہ نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا تو فہد نے خوش ہوکر عالیہ کے گلے میں اپنی بانہیں ڈال دیں۔

شام کو عالیہ فہد کے ساتھ شہلا کے گھر پہنچی' ہزار گز کی اس کوٹھی کے بڑے سے گیٹ کے سامنے گاڑی روک کر فہد نے ہارن دیا تو ایک باوردی اسلحہ بردار گارڈ نے گیٹ کھول دیا' فہد اپنی کار پورچ میں لے گیا جہاں چار گاڑیاں پہلے سے موجود تھیں۔

فوراً ہی ایک خوش شکل اور ماڈرن لڑکی گاڑی کے رکتے ہی تیزی سے ان کی جانب آئی' اس نے بلیک کلر کی تنگ جینز اور بلیک کلر کی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی اور اس کے سیاہ ریشمی بال اس کے کندھوں پر جھول رہے تھے۔

"ہائے فہد! ہائے آنٹی.....! موسٹ ویلکم!" اس نے نہایت خوش دلی کے ساتھ کہا۔

"امی یہ شہلا ہے۔" فہد نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور شہلا! یہ میری امی ہیں۔" اس نے شہلا سے کہا۔ جو بڑی حیرت سے عبائے اور حجاب میں ملبوس عالیہ کو دیکھ رہی تھی' ایک ہلکی سی ناگواری کا احساس اس کے چہرے پر آیا' مگر اس نے جلد ہی اپنے آپ کو نارمل کرلیا اور انہیں اپنے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں لے جاکر بٹھادیا اور خود "میں ابھی آتی ہوں" کہہ کر باہر نکل گئی۔

شہلا کو دیکھ کر عالیہ کو بہت مایوسی ہوئی تھی۔ اسے اپنے بیٹے کے انتخاب پر افسوس ہورہا تھا۔

"افوہ امی! اب اس شامیانے کو تو اتار دیں اور ریلیکس ہوکر بیٹھیں۔ شہلا کے والدین آپ کو اس حلیے میں دیکھیں گے تو کیا سوچیں گے۔" فہد نے تیز سرگوشی میں کہا۔

"کیا سوچیں گے.....؟" عالیہ نے ناگوار لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں؟" اس نے قدموں کی آہٹ محسوس کرکے بات ختم کردی۔

شہلا اپنی امی کے ساتھ اندر آرہی تھی' آنے والی کافی بھاری بھرکم وجود پر خاصے کشادہ گلے کی قمیص اور شلوار میں ملبوس تھیں۔ دوپٹہ رسّی کی مانند گلے میں پڑا تھا' گہری شوخ لپ اسٹک لبوں پر تھی اور ان کے بال بیٹی سے بھی چھوٹے تھے۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی جیسے ہی ان کی نگاہ عالیہ بیگم پر پڑی تو ان کے تیزی سے بڑھتے ہوئے قدموں کو بریک لگا۔ انہوں نے عبایا میں ملبوس عالیہ بیگم کو ناگواری سے دیکھا' چہرے پر پھیلی ہوئی یہ ناگواری اتنی نمایاں اور واضح تھی جو کسی سے بھی چھپی نہ رہ سکی اور اس چیز کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھپانے کے لیے شہلا نے جھٹ کہا۔

"مام! یہ فہد ہیں اور یہ فہد کی مام ہیں۔" تو وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی نزدیکی صوفے پر ٹک گئیں اور تکبرانہ لہجے میں عالیہ بیگم کو مخاطب کیا۔

"اوہ.....! تو آپ ہیں جن کے بیٹے کے ساتھ میری بیٹی شہلا محبت کرنے کی احمقانہ حرکت کر بیٹھی ہے۔"

"السلام علیکم!" عالیہ نے بات شروع کرنے سے قبل سلام کرنا مناسب سمجھا۔

"جی.....!" جواباً انہوں نے نخوت بھرے لہجے میں کہا۔

"مام.....!" شہلا نے اپنی مام کا یہ رویہ دیکھ کر احتجاج بھرے لہجے میں کہا۔

"آپ کہیے کوئی کام تھا آپ کو..... ویسے میں آپ کو صرف دس منٹ دے سکتی ہوں۔ مجھے ابھی پارلر جانا ہے' دراصل مجھے آج ایک ڈنر پارٹی اٹینڈ کرنی ہے' جس میں شہر کے تمام معززین شرکت کرنے والے ہیں۔ ایک دو وزراء اور فلم اسٹارز بھی ہوں گے۔ تم جانتی ہو شہلا میں اسے ڈراپ نہیں کرسکتی۔"

"آئی ایم سوری! مجھے آپ کے پروگرام کا قطعی علم نہیں تھا' مجھے کوئی خاص بات نہیں کرنی' آپ ہمیں اجازت دیں۔" عالیہ بیگم نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی!" انہوں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"امی پلیز.....! آپ آنٹی سے کوئی بات تو کریں۔" انہوں نے کہا تو ہے کہ ان کے پاس دس منٹ ہیں۔" فہد نے عالیہ بیگم کو کھڑے ہوتے ہوئے دیکھ کر دبے دبے لہجے میں کہا۔

"مگر میرے پاس انہیں دینے کے لیے مزید ایک منٹ بھی نہیں ہے۔ تم آرہے ہو میرے ساتھ یا میں اکیلی ہی چلی جاؤں۔" عالیہ بیگم نے اپنے غصے کو کنٹرول کرتے ہوئے فہد سے کہا اور تیزی سے قدم بڑھاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

"آ..... آئی ایم رئیلی سوری آنٹی! وہ امی..... میں اجازت چاہوں گا۔" فہد نے شہلا کی مام سے معذرت کرتے ہوئے کہا اور تیزی سے اپنی امی کے پیچھے لپکا جو کار کا دروازہ کھول کر کار میں بیٹھ چکی تھیں۔ وہ بھی ڈرائیونگ سیٹ پر آکے بیٹھ گیا اور بولا۔

"امی آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا' انہیں تو پارٹی میں جانا تھا مگر آپ کو کس بات کی جلدی تھی۔" اس نے عالیہ بیگم سے کہا۔

"فہد بیٹا! میری طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے' شاید میرا بی پی شوٹ کر گیا ہے' تم گھر چلو' ہم گھر پہ بیٹھ کر بات کریں گے۔" انہوں نے اپنی انگلیوں سے پیشانی کو سہلاتے ہوئے کہا۔

فہد کی نگاہیں ڈرائنگ روم کے دروازے پر تھیں۔ اسے یقین تھا کہ ابھی شہلا آئے گی اور فہد سے بات کرے گی مگر پانچ منٹ انتظار کے بعد بھی شہلا نہیں آئی تو فہد نے کار بیک کرلی۔

گھر پہنچ کر عالیہ بیگم سیدھی اپنے بیڈروم میں چلی گئیں۔ جب کہ فہد نے وہیں کھڑے کھڑے اپنا موبائل فون نکال کر شہلا کے فون کا نمبر ملایا' رابطہ ہونے پر اس نے کہا۔

"شہلا! یہ سب کیا ہوگیا' ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

"فہد! تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ تمہاری مام اتنی بیک ورڈ ہیں۔ اس ماڈرن دور میں کون اتنا بڑا اخیمہ اوڑھ کر گھومتا ہے۔ میں تو تمہاری مام کو دیکھ کر ڈر رہی گئی تھی اور مام کو تو تمہاری مام بالکل بھی پسند نہیں آئیں۔" شہلا کا یہ جواب فہد کی توقع کے خلاف تھا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم.....! تمہیں میری امی کی عبائے پر اعتراض کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہیں۔ یہ ان کا اسٹائل ہے' ہمارا اپنا لائف اسٹائل ہوگا۔" فہد نے کہا۔

"مگر میری مام کا یہ کہنا ہے تم اپنی امی کی اکلوتی اولاد ہو اور تمہاری امی جیسی خواتین کبھی بھی ہمارے لائف اسٹائل کو قبول نہیں کریں گی' وہ مجھے مجبور کریں گی کہ میں بھی ان کی طرح زندگی گزاروں جو میرے لیے ناممکن ہے۔" شہلا نے کہا۔

"مگر جب میں تمہارے ساتھ ہوں تو تمہیں کس بات کی فکر ہے' اس بات کی ذمہ داری میں لیتا ہوں کہ امی ہماری لائف میں انٹرفیئر نہیں کریں گی۔" فہد نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ہماری شادی صرف ایک ہی صورت میں ہوسکتی ہے کہ ہم ان سے بالکل علیحدہ ہوجائیں' ہمارا اپنا گھر ہوگا' جہاں تمہاری امی نہیں آئیں گی' ورنہ اگر وہ آئیں تو میرے ملنے والوں اور فرینڈز میں میری بڑی بے عزتی ہوگی کہ میری ساس اتنی بیک ورڈ ہیں۔"

"تمہاری یہ شرط بہت کڑی ہے اور اس پر عمل کرنا میرے لیے ناممکن ہے' میری امی نے صرف میری خاطر اپنی ساری جوانی تنہا رہ کر گزار دی اور آج اس عمر میں جب انہیں سب سے زیادہ میری ضرورت ہے تو میں ان سے قطع تعلق کرلوں۔ تم خود ہی سوچو میں ایسا کیسے کرسکتا ہوں۔ میں تم سے بھی شدید محبت کرتا ہوں اور امی سے بھی۔ میں تم دونوں میں سے کسی ایک کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔" فہد نے شہلا کی خوشامد کرتے ہوئے کہا۔

"محبت تو میں بھی تم سے کرتی ہوں مگر تم جھوٹ بول رہے ہو' تم میرے لیے کچھ بھی نہیں کرسکتے۔ اگر تمہیں مجھ سے سچی محبت ہوتی تو تم ایک ماں تو کیا ساری دنیا کو ٹھکرا دیتے۔" شہلا نے تیز لہجے میں کہا۔

"اور تمہاری محبت کیسی ہے' تم میری خاطر میری ماں کو برداشت نہیں کرسکتیں۔" فہد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"میں تم سے محبت کرتی ہوں' جب ہی تو مجھے تمہاری اور اپنی خوشیوں کی فکر ہے۔ اگر تمہاری امی ہماری زندگی میں شامل رہیں تو ان کی روک ٹوک برداشت نہیں کرسکوں گی پھر نہ تم خوش رہ سکو گے اور نہ میں۔ تم اچھی طرح سوچ لو اپنا فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے' میں اپنی بات مکمل کرچکی ہوں۔"

"تم نے ابھی میری امی کو جانا ہی نہیں ہے اور پہلے سے ہی ساری باتیں سوچ لیں۔" فہد نے ایک بار پھر بگڑی بات بنانے کی کوشش کی۔

"میں ان کے حلیے کو دیکھ کر سب کچھ سمجھ چکی ہوں۔ مزید جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ گڈ بائے فہد!" شہلا نے تیز لہجے میں کہا اور فون بند کردیا۔

فہد بہت دیر تک اپنا سر پکڑے کھڑا رہا پھر آہستہ قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔ اسے شہلا سے اس قسم کی گفتگو کی امید ہرگز نہیں تھی۔ شہلا تو اس پر جان دیتی تھی' وہ بارہا اس کے کندھے پر سر رکھ کر کہہ چکی تھی کہ وہ فہد کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی پھر اتنی سی بات پر وہ کیسے اس سے ہر تعلق توڑ سکتی ہے اور پھر اس کی وہ شرط.....!

فہد ایسا نہیں کرسکتا تھا' اسے اپنی امی سے بے پناہ محبت تھی کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ امی نے کس طرح صرف اس کی خاطر اتنی مصیبتیں جھیلی ہیں۔ وہ کیسے امی کو چھوڑ سکتا ہے مگر شہلا.....! وہ بھی تو اس کا پہلا پیار ہے' اس کی زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری لڑکی! وہ کیا کرے' کیا وہ شہلا کے بغیر جینے کا تصور کرسکتا ہے۔ مارے بے بسی اور رنج کے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے' وہ لاکھ کوشش

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر رہا تھا کہ آنسو نہ نکلیں مگر وہ بہے چلے آ رہے تھے' نہ جانے وہ کتنی دیر بستر پر آڑا ترچھا لیٹا رہا پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔

عالیہ بیگم نے اپنے روم میں آ کر اپنا عبایا اتار کر الماری میں لٹکایا اور بیڈ پر لیٹ گئیں۔ انہیں شدید چکر آ رہے تھے' بی پی ہائی ہو رہا تھا' شہلا اور اس کی امی کو دیکھ کر انہیں شدید شاک پہنچا تھا اور سب سے زیادہ انہیں فہد پر افسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس قسم کی بے ہودہ لڑکی کو کیسے پسند کر سکتا ہے' وہ بھی اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کے لیے' اس قسم کی بے باک لڑکیاں صرف شمع محفل بن سکتی ہیں۔ کسی گھر میں بیٹھ کر اپنے شوہر کا گھر نہیں سنبھال سکتیں' بچے نہیں پال سکتیں اور نہ ان کی اسلامی اصولوں کے مطابق تربیت کر سکتی ہیں۔ یہ وہ کمپلیکس زدہ لوگ ہیں جو یہود و نصاریٰ کی تقلید کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ اپنے شعائر اسلامی کو اپناتے ہوئے انہیں شرم محسوس ہوتی ہے۔

نہیں نہیں میں شہلا سے شادی کی اجازت دے کر اپنے بچے کی زندگی نہیں تباہ کر سکتی اور نہ ہی اپنی آنے والی نسل کو جو اس جیسی ماں کی گود میں پرورش پائے' تباہ کر سکتی ہوں۔

عالیہ بیگم یہ فیصلہ کر کے فہد سے بات کرنے کے لیے اس کے کمرے کی جانب چل پڑیں۔ کمرے کا دروازہ بند تھا انہوں نے آہستہ سے ہینڈل گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔ فہد بیڈ پر آڑا ترچھا لیٹا تھا' وہ ست روی سے چلتی ہوئی اس کے نزدیک آئیں تو دیکھا وہ سو رہا ہے' وہ اس کے قریب بیٹھ گئیں اور محبت سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ ماں کے محبت بھرے لمس کو محسوس کر کے فہد کی آنکھ کھل گئی اور وہ ان کی جانب دیکھنے لگا۔

"سو رہے تھے؟" انہوں نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا تو فہد ان کی گود میں سر رکھ کر رو پڑا۔ "کیا ہوا میرے بچے؟" انہوں نے پوچھا۔

"امی وہ آپ کی وجہ سے نہیں مان رہی۔" وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

"کیا مطلب؟" انہوں نے جانتے ہوئے بھی پوچھا۔

"کچھ نہیں!" وہ بولا۔

"کچھ تو!" انہوں نے اصرار کیا۔

"وہ چاہتی ہے کہ اگر میں آپ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں تب وہ مجھ سے شادی کرے گی۔" فہد نے کراہتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تو تم نے کیا فیصلہ.....؟" انہوں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"امی میں اسے بہت چاہتا ہوں' اس کے علاوہ کسی اور لڑکی کا تصور بھی نہیں کر سکتا لیکن میں آپ کو بھی نہیں چھوڑ سکتا۔" فہد نے بلکتے ہوئے کہا۔

فہد کی بات سن کر عالیہ بیگم بالکل چپ ہو گئیں۔ کمرے میں بہت گمبھیر خاموشی چھائی ہوئی تھی' ایک ایک لمحہ بہت بوجھل گزر رہا تھا۔ وہ چند لمحوں تک سوچتی رہیں پھر بولیں۔

"میں مانتی ہوں فہد بیٹا کہ تم اس لڑکی کو بہت چاہتے ہو لیکن اگر وہ ایک باپردہ اور باحیا لڑکی ہوتی اور میں یہ سمجھتی کہ وہ تمہیں خوش رکھے گی' تمہاری نسل کی بہترین تربیت کرے گی تو میں بہت خوشی کے ساتھ اپنے ہاتھوں تمہیں اس کو سونپ دیتی مگر تمہاری اس محبت کی تکمیل تمہارے لیے سراسر گھاٹے کا سودا ثابت ہوگی۔ نہ تمہاری دنیا سنورے گی اور نہ آخرت..... تمہیں پتا ہے اچھی اور نیک بیوی دنیا ہی میں جنت بن جاتی ہے' میں اس کے علاوہ تمہیں اور کیا سمجھاؤں میری جان! بس اتنا جان لو کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ

علیہ وسلم کے احکامات کی کھلی نافرمانی کرنے والے لوگ نہ دنیا میں سکھی رہتے ہیں اور آخرت کا خسارہ تو ان کا مقدر بنتا ہی ہے۔ میں نے تمہارے لیے ناہید کی بیٹی حرا کو پسند کیا ہے۔ وہ ایک نیک باحیا اور باپردہ بچی ہے اور ناہید نے اس کی پرورش بھی اسلامی اصولوں کے مطابق کی ہے۔"

"امی مجھے کسی سے بھی شادی نہیں کرنی ہے' شہلا نہیں تو کوئی بھی نہیں۔" فہد نے تیزی کے ساتھ سر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"فی الحال میں تمہیں ٹائم دے رہی ہوں' تم ریلیکس ہو جاؤ پھر بات کریں گے۔" عالیہ نے کہا۔

"آئی ایم سوری امی! آپ میری شادی کا خیال اپنے دل سے نکال دیں۔" فہد نے جواباً کہا تو عالیہ بیگم خاموشی سے اٹھ کر اپنے روم میں آ گئیں۔

وہ تمام رات انہوں نے جائے نماز پر بیٹھ کر گزار دی' وہ فہد کے لیے اپنے رب کے آگے گڑگڑا رہی تھیں کہ رب کائنات اسے عقل سلیم عطا فرمائے۔

❁.....☆.....❁

فہد مسلسل شہلا سے فون پر رابطے میں تھا وہ اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اپنی شرط کو بھول جائے۔ اس نے اپنی گزشتہ پانچ سال کی محبت کے واسطے دیئے مگر شہلا نے صاف طور پر کہہ دیا کہ وہ ایک پڑھی لکھی شعور والی لڑکی ہے اور اس نے جذبات سے ہٹ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔

"مگر شہلا میں تمہارے علاوہ کسی اور لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا۔" فہد نے کہا۔

"لیکن اگر تم نے میری بات نہ مانی اور مجھ سے شادی نہ کی تو میں ضرور کسی ایسے شخص سے شادی کر لوں گی جو تمہاری طرح کی فضول بندشوں میں نہ جکڑا ہوا ہو۔" شہلا نے کہا اور فون بند کر دیا۔

❁.....☆.....❁

عالیہ بیگم بیٹے کی حالت دیکھ ہی رہی تھیں۔ وہ دن رات کڑھتی رہتیں۔ مگر لب خاموش تھے۔ انہیں جو کچھ بھی کہنا ہوتا' فریاد کرنی ہوتی اپنے رب سے کہتیں۔ فہد بہت کمزور ہو گیا تھا' راتوں کو جاگ جاگ کر اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ رات رات بھر اس کے روم کی لائٹ جلتی رہتی' وہ دبے پاؤں جا کر اس کے کمرے میں جھانکتیں تو وہ بیڈ پر چت لیٹا چھت کو گھورتا رہتا اس نے سگریٹ پینا بھی شروع کر دی تھی۔

تب ایک روز ناہید ان کی طرف آئی اور کہا۔

"عالیہ! تم نے ایک بار مجھ سے فہد اور حرا کے رشتے کی بات کی تھی مگر پھر تم نے بات آگے نہیں بڑھائی۔ تمہارا جو بھی فیصلہ ہے مجھے اس سے آگاہ کر دو' اگر تمہاری جانب سے انکار ہے تو یقین کرو کہ مجھے قطعی بُرا نہیں لگے گا' کیوں کہ جوڑے تو اللہ تعالیٰ بناتا ہے' ہمارے بچوں کے نصیب میں جو لکھا ہوگا' وہی ہوگا' یہ بات میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ حرا کے ایک دو اچھے گھروں کے رشتے آئے ہوئے ہیں مگر چوں کہ تم اپنی خواہش کا پہلے مجھ سے اظہار کر چکی تھیں اس لیے میں نے تم سے بات کرنا مناسب سمجھا۔"

"تم نے بہت اچھا کیا ناہید! تم فکر نہ کرو' میں آج ہی فہد سے فائنل بات کر کے تمہیں جواب دے دوں گی' میرا جواب کیا ہوگا یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ بس اللہ سے اچھی امید رکھو' وہ جو بھی کرے ہمارے بچوں کے حق میں بہتر ہو۔" عالیہ بیگم نے متانت سے کہا۔

اور رات کو فہد جب اپنے کمرے میں تنہا لیٹا اپنی محبت کا ماتم منا رہا تھا تب وہ اس کے پاس گئیں اور پیار سے اسے مخاطب کیا۔

"امی! وہ شادی کر رہی ہے۔" فہد نے ایک زخمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اچھی بات ہے بیٹا! اس کے نصیب میں وہی لکھا ہوگا' اللہ سے خوش رکھنے' اب تمہیں بھی کوئی فیصلہ کرلینا چاہیے اگر تم راضی ہو تو میں ناہید سے بات کروں۔" انہوں نے بہت سنبھل کر کہا۔

"مگر امی مجھے شادی نہیں کرنی ہے۔" اس نے احتجاج کیا۔

"بہت بُری بات ہے بیٹا! ایسا کہہ کر تم سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔ شہلا نے اپنی زندگی کا ساتھی چُن لیا ہے' اب تم کس کا انتظار کرو گے۔ میری بات ہی مان لو' حرا بہت اچھی لڑکی ہے' وہ تمہیں بہت خوش رکھے گی۔" عالیہ بیگم نے رسان بھرے لہجے میں کہا۔

"مگر امی شاید میں اسے خوش نہ رکھ سکوں۔ اس لیے کہ میرے دل و دماغ میں صرف شہلا کا تصور ہے باقی کچھ نہیں۔" فہد نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔

"حرا ایسی لڑکی ہے جو اپنے پیار اپنی خدمت سے یقیناً تمہارا دل جیت لے گی۔ بس میں کل ہی ناہید کے گھر جا کر حرا کا منہ میٹھا کراؤں گی۔" عالیہ بیگم نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

"مگر امی.....!"

"بس فہد! میں نے آج تک تمہاری ہی بات مانی ہے' تمہاری خوشی کی خاطر میں شہلا کے گھر تک گئی' مگر وہاں جو کچھ ہوا وہ سب تم نے خود دیکھا' مگر آج تمہیں میری بات ماننی پڑے گی۔" عالیہ بیگم کے لہجے میں پہلی بار سختی اتر آئی۔

دوسرے دن وہ ناہید کے گھر گئیں اور حرا کا منہ میٹھا کروایا اور پھر چند خاص خاص لوگوں کو مدعو کر کے سادگی کے ساتھ فہد اور حرا کا نکاح کر دیا گیا۔ حالاں کہ عزیز رشتہ داروں نے اس بات پر اعتراض بھی کیا کہ تم کوئی غریب نہیں ہو اور نہ ہی پیسے کی کوئی کمی ہے' اولاد بھی صرف ایک ہی بیٹا ہے پھر اتنی سادگی کس لیے۔ تب عالیہ بیگم نے بہت متانت سے جواب دیا کہ جتنی فضول خرچی آج کل ہم شادیوں کے موقعے پر کرتے ہیں' اتنی رقم میں دوسری کئی غریب اور یتیم بچیوں کی شادیاں کی جاسکتی ہیں۔

☆

حرا ہر لڑکی کی طرح اپنے دل میں بہت سے سہانے سپنے سجائے فہد کی زندگی میں داخل ہوئی تھی' اس کی زندگی میں اس کے خیالوں میں خوابوں میں کبھی کسی غیر لڑکے کا گزر بھی نہیں ہوا تھا کیوں کہ وہ جانتی تھی اور سمجھتی تھی کہ ایک مسلمان لڑکی کا حُسن اس کی سوچ اور خیالات صرف اور صرف اس کے ہونے والے شوہر کی امانت ہوتے ہیں اور اس نے اس امانت کی قدم قدم پر حفاظت کی تھی' وہ اس بات سے لاعلم تھی کہ اس کے شوہر کا دل تو پہلے ہی کسی اور کی زلفوں کا اسیر ہے اور حرا سے نکاح کے وقت بھی وہ اسے اپنے دل سے نکال نہیں سکا تھا' دل تو ایک ایسا گھر جس میں اگر پہلے ہی سے کوئی اور موجود ہو تو کسی دوسرے وجود کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔

اس کا کمرہ گلاب اور موتیے کے پھولوں کی خوش بُو سے مہک رہا تھا۔ وہ گھونگھٹ نکالے شرم و حیا کا پیکر بنی دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اپنی زندگی میں ہونے والے اپنے مجازی خدا کا انتظار کر رہی تھی' آج وہ سب کچھ اسے سونپ دینا چاہتی تھی جسے اس نے بہت سنبھال کر رکھا تھا۔ وہ عالیہ بیگم سے بہت اچھی طرح واقف تھی اور انہیں پسند بھی کرتی تھی مگر وہ فہد کی شخصیت سے واقف نہیں تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ جیسی عالیہ آنٹی ہیں ویسا ہی فہد ہوگا۔ مگر ایسا نہیں تھا۔

ایک طویل انتظار کے بعد عالیہ بیگم کے بہت کہنے اور زور دینے پر فہد اپنی خواب گاہ میں داخل ہوا تو اس کی نگاہ اپنے بیڈ پر سکڑی سمٹی گھونگھٹ میں لپٹا رُخِ زیبا

چھپائے حرا پر پڑی۔ تو اس کے دل میں چبھنا کے سے کوئی چیز ٹوٹ گئی' اس نے یہاں پر ہمیشہ اپنے تصور میں شہلا کو بیٹھے دیکھا تھا' دونوں نے آپس میں اس حسین رات کے حوالے سے کتنی ہی باتیں کی تھیں مگر یہ کون اس کی جگہ آ بیٹھی ہے' جس سے وہ واقف بھی نہیں ہے۔ اس نے تو آج تک اس کی شکل بھی نہیں دیکھی کیوں کہ بقول امی کے وہ ایک باپردہ لڑکی ہے' جسے زبردستی اس کے سر منڈھ دیا گیا ہے' وہ کس طرح اس سے اپنے دل کی باتیں کرسکتا ہے۔

وہ دیر تک کھڑا سوچتا رہا' اس نے محسوس کیا کہ بیڈ پر رکھی اس سرخ رنگ کی گٹھری میں ہلکی سی کسمساہٹ ہو رہی ہے۔ وہ سست روی سے قدم اٹھاتا ہوا بیڈ کے نزدیک آیا اور بولا۔

"حرا! کیا تمہیں معلوم ہے کہ میری اور تمہاری شادی زبردستی کی گئی ہے' میں ایک لڑکی شہلا کو پسند کرتا تھا جو حسین تھی' ماڈرن تھی مگر امی نے اسے اور اس نے امی کو پسند نہیں کیا اور یوں ہمارا ملاپ نہیں ہوسکا۔ میں نے سنا ہے کہ تم بھی امی کی طرح سخت پردے کی پابند' بیک ورڈ لڑکی ہو۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میری زندگی کی ساتھی کوئی ایسی لڑکی ہوگی۔ مجھے شوخ' چنچل اور ماڈرن لڑکیاں پسند ہیں۔ امی جیسی بھی زندگی گزارتی ہیں یہ ان کی مرضی' مگر میرا تمہارے ساتھ گزارا نہیں ہوسکتا' تم ان کی پسند ہو' ان جیسی ہی ہو اور ان کی مرضی سے اس گھر میں آئی ہو بس.....!" وہ ذرا دیر کو سانس لینے کو رکا پھر بولا۔ "تم اپنا سارا وقت ان کے ہی ساتھ گزارنا' مجھے تمہاری ذات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ ہوگی اور ہاں ایک بات یاد رکھنا کہ تم امی سے اس بات کا ذکر نہیں کرو گی۔ مجھے اپنی زندگی گزارنے کے لیے بے وفا شہلا کی یادیں ہی کافی ہیں۔ مجھے دنیا کی کسی بھی عورت میں دلچسپی نہیں ہے۔ عورت بے وفا ہوتی ہے' صرف اپنے نفس کی غلام..... کبھی وہ سچی محبت کر ہی نہیں سکتی۔" اتنا کہہ کر فہد نے اپنے کپڑے تبدیل کیے اور صوفے پر لیٹ گیا۔ اس نے ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیا کیوں کہ لائٹ اس کی آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔

حرا دم سادھے فہد کی باتیں سُن رہی تھی۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا اس نے اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس کی حسین آنکھوں سے آنسو بھل بھل بہہ رہے تھے' اپنی سسکیاں اس نے اپنے اندر دبائی تھیں۔ فہد نے تو اس کا گھونگھٹ اٹھا کر اسے دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی' اسے اس بات کا شدید دکھ تھا کہ فہد امانت دار نہیں ہے۔

اس نے بیڈ کے سرہانے سے سرکا لیا' زرتار دوپٹے کا آنچل بدستور اس کے چہرے پر پڑا تھا۔ بس آنچل کی اوٹ سے اس نے فہد کو دیکھا کہ وہ صوفے پر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹا ہے۔

وہ رات جو کتنی امنگوں اور ارمانوں بھری ہوتی ہے' کسی کا ہو جانے اور کسی کو اپنا بنا لینے کی' ہمیشہ ایک دوسرے کو چاہنے اور وفا نبھانے کا وعدہ کرنے کی' ایک دوسرے کے دکھ اور سکھ بانٹنے کا وعدہ کرنے کی۔

مگر.....! اس کی یہ رات کیسی تھی؟ باہر پھیلی سیاہ تاریک رات کی مانند' ایسی تاریک رات جب آسمان پر نہ چاند تھا نہ تارے بس ہر جانب گھور اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

کیا وہ اس تاریکی میں تمام عمر اپنے لیے ایک بھی خوشی حاصل کرنے کے لیے بھٹکتی رہے گی' اس نے تو نکاح کے وقت ہاں کرتے ہوئے اپنے دل کی تمام تر شدتوں اور سچائیوں کے ساتھ اس کو اپنا مان لیا تھا اور اس کی ہو گئی تھی مگر فہد نے اسے نہیں اپنایا اور نہ ہی اپنا آپ اسے سونپا۔

وہ آنکھیں موندے ایسی ہی ڈھیروں باتیں سوچے جا رہی تھی۔ دوسری جانب فہد دل ہی دل میں شہلا سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مخاطب تھا' وہ کہہ رہا تھا۔

"تم نے دیکھا شہلا! تم اپنے تن من سے کسی اور کی ہوگئیں مگر میں ابھی تک صرف تمہارا ہوں۔ آج میرے بیڈروم میں میرے بیڈ پر جولڑکی تمہاری جگہ بیٹھی ہے۔ میں نے اس کا گھونگھٹ اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ کاش! میں بھی تمہیں اسی طرح بھلانے میں کامیاب ہوجاؤں' جس طرح تم نے مجھے بھلادیا۔"

شہلا سے خیالوں ہی خیالوں میں باتیں کرتے ہوئے وہ گہری نیند سوگیا بالآخر وہ بوجھل اور اذیت دیتی رات گزر رہی گئی۔ سپیدہ سحر نمودار ہوا اور مؤذن کی آواز حرا کے کانوں میں آئی' وہ ہر ایک کو پکار رہا تھا' آؤ فلاح کی جانب' آؤ صلوٰۃ کی جانب کہ اللہ ہی سب سے بڑا ہے۔

اذان کی آواز کانوں میں آئی تو حرا خیالات کی دنیا سے واپس آ گئی۔ اس نے ایک بار پھر آنچل کی اوٹ سے فہد کی جانب دیکھا اور اسے محوِ خواب جان کر آہستہ سے بیڈ سے نیچے اتر آئی۔ اس نے اپنے تمام زیورات ایک ایک کرکے اتارے اور بیڈ کی سائیڈ دراز کو آہستگی سے کھول کر اس میں رکھ کر آہستگی سے ہی دراز بند کردی۔ مبادا آہٹ سے فہد کی آنکھ نہ کھل جائے پھر وہ واش روم گئی' چہرے سے میک اپ صاف کیا' بال کھول کر دوبارہ کنگا کرکے ہمیشہ کی طرح ایک چوٹی ڈال لی' کپڑے پہلے ہی باتھ روم میں لٹکے ہوئے تھے' اس نے وضو کرکے فجر کی نماز ادا کی اور چپ چاپ کمرے سے نکل آئی' وہ جانتی تھی کہ آنٹی بھی جاگ رہی ہوں گی۔ عالیہ بیگم جائے نماز پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ وہ سیدھی ان کے قریب چلی آئی اور انہیں سلام کرکے ان کے نزدیک بیٹھ گئی۔

عالیہ بیگم نے تسبیح ایک جانب رکھ دی اور مسکرا کے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اس کی پیشانی کو چوما اور اسے ڈھیروں دعائیں دیں۔ پھر غور سے اس کے چہرے کی جانب دیکھنے لگیں جہاں پہلی رات گزارنے والی دلہن کے چہرے پر شرم وحیا کی جگہ ایک عجیب سا حزن وملال چھایا ہوا تھا۔

عالیہ بیگم کو یوں اپنی جانب دیکھتے ہوئے پاکے حرا دھیرے سے مسکرادی اور سر جھکالیا۔

"تم خوش تو ہو نا میری جان.....؟" انہوں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا تو اس نے سر کو جھکائے اثبات میں ہلادیا۔ "فہد کا رویہ تمہارے ساتھ ٹھیک تو تھا نا؟" انہوں نے غیر مطمئن لہجے میں پوچھا۔

"ویسا ہی تھا جیسا ہونا چاہیے تھا۔" اس نے گول مول جواب دیا تو عالیہ بیگم کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ مزید اس سے کیا سوال کریں کہ ان کا دل مطمئن ہوجائے مگر خاموش رہیں' پھر بولیں۔

"چائے پیوگی؟"

"جی آنٹی! میں ابھی بنا کے لاتی ہوں۔" وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی' وہ عالیہ بیگم کے سوالات سے بچ کر نکل جانا چاہتی تھی۔ اس کا اور فہد کا کیا معاملہ رہا۔ وہ اس بات کی بھنک بھی کسی کو پڑنے نہیں دینا چاہتی تھی۔

"ارے رکو تو سہی!" انہوں نے بیٹھے بیٹھے حرا کا ہاتھ تھام کر دوبارہ بٹھاتے ہوئے کہا۔ "سب سے پہلی بات تو یہ کہ آج سے تم مجھے آنٹی نہیں امی کہا کروگی' کیوں کہ اب ہمارا رشتہ جو بدل گیا ہے اور میں تمہیں اپنی بیٹی بنا کر لائی ہوں۔ دوسری بات یہ کہ تم ابھی ایک رات کی دلہن ہو' تمہیں کچن میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ چائے میں بناؤں گی تم یہیں بیٹھو اور ہاں فہد کیا سو رہا ہے؟"

"جی امی! وہ سو رہے ہیں۔ اچھا چلیں چائے آپ بنالیجیے گا مگر میں آپ کے ساتھ کچن میں ضرور چلوں

گی۔" اس نے چہرے پر مصنوعی بشاشت سجاتے ہوئے کہا۔

"اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو آؤ۔" انہوں نے ہنس کر کہا اور دونوں ساتھ ساتھ چلتی ہوئی کچن میں آ گئیں۔

عالیہ بیگم نے چائے تیار کی تو حرا نے ٹرے سنبھال لی اور دونوں کمرے میں آ گئیں۔ چائے پینے کے دوران عالیہ بیگم اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں بھی کرتی رہیں۔ پھر انہوں نے کہا۔

"جا کر تیار ہوجاؤ' ابھی سب لوگ اٹھنے والے ہوں گے پھر ناہید کی ضد تھی کہ آج کا ناشتہ وہ بھیجے گی' تو تمہارے گھر سے بھی لوگ آنے والے ہوں گے اور باقی تم فہد کو بھی جگا دینا' نہ جگایا تو پتا نہیں کتنی دیر تک سوتا رہے گا۔"

"جی اچھا!" اس نے آہستہ سے کہا پھر بولی۔ "کون سا سوٹ پہنوں؟"

"بیٹا! جو تمہارا دل چاہے' میں نے الماری میں تمہارے سوٹ رکھ دیئے ہیں کچھ ہینگر کردیئے تھے' میرا خیال ہے ان ہی میں سے کوئی پہن لو۔" انہوں نے پیار اور محبت بھری نگاہوں سے اس کے ملیح چہرے کو چومتے ہوئے کہا۔

وہ کمرے میں آئی تو فہد نے کروٹ لی' اس سے پہلے کہ اس کی نگاہ حرا کے چہرے پر پڑتی اس نے چہرے پر اپنا آنچل سرکا لیا اور اس کے قریب آکے آہستہ سے بولی۔

"آپ کو امی نے بلایا ہے۔" اور کہہ کر تیزی سے الماری کی جانب بڑھ گئی۔

فہد نے حیرت سے اسے دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ واش روم کی جانب آیا تو حرا نے اپنا رخ دوسری جانب پھیر لیا۔ اس کی یہ حرکت دیکھ کر فہد لمحہ بھر کو ٹھٹکا پھر کندھے اچکا کر واش روم میں جا کر دروازہ بند کرلیا۔

حرا نے ہلکا فیروزی سوٹ جس پر ریشم زری کا کام بنا ہوا تھا' نکالا اور رخ موڑ کر بیٹھ گئی' وہ اس وقت تک اس طرح بیٹھی رہی جب تک فہد کمرے سے باہر نہیں چلا گیا۔

☆

شام کو ولیمہ تھا۔ آج کی تقریب میں کافی سارے مہمان مدعو تھے' وہ میرون اور پنک کلر کے کمبینیشن کے شرارے میں بے حد حسین لگ رہی تھی۔ بیوٹیشن نے اسے نک سک سے سجایا تھا۔ وہ اسٹیج پر بھی سر جھکائے بیٹھی رہی' فہد زیادہ تر مردانے حصے میں ہی رہا۔

دوسری رات بھی پہلی رات سے مختلف نہیں تھی۔ بس فہد نے ایک سوال اس سے کیا۔

"تم مجھ سے پردہ کیوں کررہی ہو' میں تمہارا شوہر ہوں' کیا اب بھی مجھ سے پردہ کروگی؟"

"آپ نے جب اس رشتے کو قبول ہی نہیں کیا تو میں اور کیا کروں۔" اس نے دھیرے سے کہا تو فہد نے کوئی جواب نہیں دیا اور کپڑے چینج کرکے صوفے پر جا کر سوگیا۔

ولیمے سے اگلے دن ناہید اسے لینے کے لیے آ گئیں۔ وہ امی کے گھر آ گئی' ناہید ایک ماں کی حیثیت سے اس کے چہرے پر نئی نویلی دلہن کی خوشی تلاش کررہی تھیں۔ جو اسے دکھائی نہیں دے رہی تھی' اس لیے اس نے بھی اس سے وہی سوال کیے جو عالیہ بیگم اس سے کرچکی تھیں۔

"سب ٹھیک ہے امی! بس ذرا سر میں درد ہے' میں سونا چاہتی ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں سوجاؤں۔" اس نے کہا۔

"اچھا اچھا.....!" وہ کچھ اور سمجھتے ہوئے دھیرے سے مسکرائیں اور اسے سونے کی تلقین کرکے کمرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے باہر نکل گئیں اور دوسری بہنوں کو بھی منع کر دیا کہ بہن کو ڈسٹرب مت کرنا۔

امی کے کمرے سے جانے کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی' ڈھیر سارے آنسو بہانے کے بعد اس کے دل کا بوجھل پن کچھ کم ہوا تو وہ سو گئی۔

☆

دن گزرتے رہے' ان کی شادی کو پورا ایک ہفتہ گزر گیا' ان دونوں کے درمیان کے تعلقات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ فہد کا سامنا ہوتا تو حرا آنچل چہرے پر ڈھلکا کر چہرہ جھکا لیتی اور اس کی اس حرکت کو عالیہ بیگم نے شرم و حیا اور ادب و لحاظ سمجھا۔

عالیہ بیگم نے فہد سے کہا کہ وہ حرا کو لے کر کہیں گھومنے پھرنے چلا جائے' یہی دن تو ہوتے ہیں جہاں ایک ساتھ بہت سارا وقت گزار کر میاں بیوی ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھتے ہیں اور ان میں محبت اور قربت بڑھتی ہے مگر فہد نے اپنے آفس کی ڈھیر ساری مصروفیات کا بہانہ بنا کے معذرت کر لی۔

وہ رات کو دیر سے گھر آتا تھا اور کھانا کھا کے سونے کے لیے چلا جاتا' وہ بہت خاموش رہنے لگا تھا۔ ان دونوں کی آپس کی اس سرد مہری کو عالیہ بیگم نے بھانپ لیا اور اس مرتبہ بجائے حرا کے فہد سے بات کی۔

"کیا بات ہے فہد! میں دیکھ رہی ہوں کہ تم حرا کو بالکل بھی وقت نہیں دیتے ہو۔ وہ تو ایک نیک اور صابر بچی ہے' اپنے حق کے لیے زبان نہیں کھولے گی مگر تم تو اپنے فرائض پہچانو' اللہ سے ڈرو..... اور اسے ایک بیوی کی حیثیت سے اس کے سارے حقوق دو۔"

"امی اسے آپ اپنے لیے اپنی مرضی سے اس گھر میں لائی ہیں۔ آپ کو ایک ایسی ہی بیٹی چاہیے تھی' آپ تو خوش ہیں نا! بس بات ختم۔" اس نے سرد لہجے میں کہا تو وہ فہد کو دیکھتی رہ گئیں۔

حرا فہد کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی' اس کا ہر کام اپنے ہاتھ سے انجام دیتی۔ فہد اس بات سے بے خبر اپنی دنیا میں مگن تھا۔ اب وہ مزید دیر سے گھر آنے لگا تھا' حرا نے عالیہ بیگم سے درخواست کی کہ وہ اسے اپنے ساتھ اسکول لے جایا کریں۔ گھر میں تو وقت گزرتا ہی نہیں ہے' گھریلو کام کاج کے دو تین ملازم تھے' اسے کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا تھا' عالیہ بیگم نے سوچا کہ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے۔

وہ اسکول جانے لگی' کبھی کبھی وہ گھر بھی چلی جایا کرتی تھی۔ البتہ فہد اس کے ساتھ نہیں ہوتا تھا' ناہید کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ آفس میں بہت زیادہ مصروف ہیں۔ "جتنی اونچی پوسٹ اتنی ہی ذمہ داریاں ہوتی ہیں امی!" اس نے ماں کو مطمئن کر دیا۔

ایک رات حرا نے محسوس کیا کہ فہد بہت پریشان ہے' وہ اپنے ڈیپریشن کو چھپا نہیں پا رہا تھا' صوفے پر لیٹا وہ بے چینی کے ساتھ کروٹ بدل رہا تھا' کبھی غصے میں اپنی مٹھیاں بھینچ کر زور سے صوفے پر مارتا۔

حرا کا دل چاہا کہ وہ فہد سے اس ڈیپریشن کا سبب پوچھے مگر چاہنے کے باوجود ایسا نہ کر سکی' ایک ہچکچاہٹ تھی جس نے اسے فہد کے قریب جانے سے روک دیا۔

اس رات نہ فہد سو سکا اور نہ ہی وہ..... تب ہی اسے فہد کی بڑبڑاہٹ سنائی دی' وہ دھیمی آواز میں اپنے دانتوں کو پیستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تم اتنا گر جاؤ گی شہلا! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا تمہارے شوہر نے تمہیں اپنی ترقی کا زینہ بنا لیا اور تم بن گئیں۔ تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آئی جب تم نے اپنے شوہر کی فائل پر سائن کروانے کے لیے ایک رات سرفراز مرزا کے ساتھ گزار لی اور تمہیں اپنے اس فعل پر ذرا بھی ندامت نہیں محسوس ہوئی' تم کہتی ہو کہ پیسہ

کمانے کے لیے اور اچھی لائف گزارنے کے لیے سب چلتا ہے۔ عزت وہ نہیں ہوتی جو کسی کو دکھائی نہ دے' عزت وہ ہوتی ہے جو دکھائی دے' بنگلے' گاڑیاں' بینک بیلنس..... لعنت ہے تم پر.....!"

حرا نے یہ سب سنا اور وہ سناٹے میں آ گئی' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایک عورت کیا ایسا بھی کر سکتی ہے۔ اپنے شوہر کے کہنے پر کسی اور کے بستر پر بھی جا سکتی ہے۔ استغفر اللہ! اس نے دل میں کئی بار پڑھا اور صدق دل سے دعا کی۔

"یا اللہ! میرے شوہر کو صبر و قرار عطا فرما' ان کی یہ بے چینی اور بے قراری صبر میں تبدیل کر دے۔"

دوسرے دن فہد آفس نہ جا سکا' اسے بہت تیز بخار تھا۔ وہ بخار میں بے سدھ پڑا تھا' بخار کی شدت سے چہرہ سرخ ہو رہا تھا' اس نے آہستہ سے سوتے ہوئے فہد کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور تیزی سے ہٹا لیا' پھر جا کر عالیہ بیگم کو بلا لائی۔

عالیہ بیگم فہد کو صوفے پر لیٹا دیکھ کر ٹھٹک گئیں اور حیرانی سے حرا سے پوچھا۔

"فہد صوفے پر کیوں لیٹا ہے؟" تو حرا خاموش رہی۔ "جواب دو حرا..... فہد صوفے پر کیوں لیٹا ہے؟" انہوں نے وحشت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"امی! یہ یہیں سوتے ہیں۔" حرا نے بمشکل کہا۔

"کیا مطلب ہے اس بات کا..... کیا تم دونوں ایک بیڈ پر ایک ساتھ..... مم..... میرا مطلب ہے کہ.....!" وہ آگے مزید نہ بول سکیں تو حرا نے نگاہیں جھکا لیں اور حرا کی جھکی ہوئی نگاہوں کو دیکھتے ہوئے وہ سب کچھ سمجھ گئیں۔ "اُف میرے اللہ..... یہ سب کیا ہے..... میری بچی..... میری جان..... تم اتنا سب کچھ چپ چاپ سہتی رہیں اور اُف تک نہیں کی۔" انہوں نے آنسو بھری آنکھوں سے کہا پھر بولیں۔ "فی الحال تو بیٹا! تم فہد کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھو' میں شازیہ کو فون کرتی ہوں۔" شازیہ ان کی بھتیجی تھی اور ڈاکٹر بھی۔

حرا کرسی کھینچ کر فہد کے سرہانے بیٹھ گئی اور ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنے لگی۔ تھوڑی دیر میں فہد کا بخار کم ہوا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے سر اوپر کر کے اس مسیحا کو دیکھنے کی کوشش کی تو اس نے اپنے چہرے پر تیزی سے آنچل ڈال لیا۔ عالیہ بیگم نے یہ سب دیکھا مگر خاموش رہیں اور فہد سے بولیں۔

"میں نے شازیہ کو فون کر دیا ہے وہ آتی ہی ہوگی۔ تم بیڈ پر آ کے لیٹو۔" پھر انہوں نے سہارا دے کر اسے بیڈ پر لٹایا اور اس کے قریب بیٹھ گئیں تو حرا تیزی سے کمرے سے باہر چلی گئی۔

"امی.....!" فہد نے دھیرے سے پکارا۔

"ہاں کہو میرے بچے!" اس سے ناراضگی کے باوجود وہ تڑپ کر بولیں۔

"امی مجھے معاف کر دیجیے..... آپ بالکل ٹھیک کہتی تھیں۔ شہلا نہ میرے اور نہ اس گھر کے لائق تھی' میں نے ہی غلط فیصلہ کیا تھا۔"

"کیوں تمہیں اس بات کا خیال کیسے آ گیا۔" انہوں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"بس چھوڑیں بھی اس بات کو..... آج میں جان گیا ہوں کہ ماں کبھی بھی غلط نہیں ہوتی۔ اس کی نگاہ وہاں تک دیکھتی ہے جہاں بچوں کی نگاہ نہیں پہنچ پاتی۔ جو شمع محفل بننا چاہتی ہے' وہ چراغ خانہ نہیں بن سکتی.....!" اس نے ندامت بھرے لہجے میں کہا۔

اتنی دیر میں ڈاکٹر شازیہ آ گئیں' انہوں نے اس کا چیک اپ کیا اور تسلی دی کہ موسمی بخار ہے' ایک دو روز میں ٹھیک ہو جائے گا' چند دوائیں دیں اور چلی گئیں۔

ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق حرا نے سوپ تیار کر دیا تھا'

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جو عالیہ بیگم نے فہد کو اپنے ہاتھ سے پلایا۔ فہد کے سونے کے بعد عالیہ بیگم حرا کے پاس آئیں اور بولیں۔

"حرا! ایک بات پوچھوں سچ سچ بتانا۔"

"جی امی!" وہ چونک گئی۔

"تم فہد سے اپنا چہرہ کیوں چھپاتی ہو.....؟"

"اے..... ایسی..... تو..... کو..... کوئی بات نہیں.....!" اس نے بمشکل رک رک کر کہا۔

"تم تو جھوٹ نہیں بولتیں بیٹا! پھر مجھ سے سچ کیوں چھپا رہی ہو' شروع شروع میں تو میں تمہاری اس حرکت کو حیا اور بڑوں کے سامنے لحاظ سمجھتی رہی مگر تمہاری شادی کو پورے تین ماہ ہو گئے ہیں۔ میں نے خود دیکھا ہے جب فہد نے تمہیں دیکھنا چاہا جب تم اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھیں تو تم نے آنچل اپنے چہرے پر ڈال لیا تھا' وہ تمہارا شوہر ہے بیٹا! اس سے یہ پردہ کیسا.....؟" انہوں نے پیار سے کہا۔

"یہ پردہ آج تک انہوں نے خود نہیں ہٹایا تو پھر میں کیسے ہٹا دوں۔ جب کسی کو کوئی تحفہ پیک کر کے دیا جاتا ہے تو تحفہ لینے والا خود اسے کھول کر دیکھتا ہے اور اپنی پسند ناپسند کا اظہار کرتا ہے' تحفہ پسند آجائے تو دینے والے کا شکریہ ادا کرتا ہے' آپ نے اپنی پسند کا جو تحفہ فہد کو دیا تو کیا فہد نے آپ سے اس بارے میں کچھ بھی کہا کہ انہوں نے آپ کا دیا ہوا وہ زبردستی کا تحفہ دیکھا بھی ہے یا نہیں۔ پسند ناپسند کا سوال تو بعد میں آتا ہے۔ میں وہ بدنصیب تحفہ ہوں جسے لے کر بے دلی سے گھر کے ایک کونے میں پھینک دیا گیا۔ بے وقعت اور حقیر جان کر' آپ مجھے صرف ایک بات بتائیے امی!" وہ سانس لینے کو رکی اور بہت ساری ہمت جمع کر کے بولی۔ "جب وہ شہلا کو پسند کرتے تھے تو آپ نے زبردستی ان کی شادی کیوں کی؟ شادی زبردستی نہیں ہوتی' جس کو دل ہی قبول نہ کرے اسے آنکھ کیسے قبول کرے گی' بس اسی لیے میں نے ابھی تک فہد کو اپنا چہرہ نہیں دکھایا ہے۔" وہ خاموش ہوئی تو عالیہ بیگم اسے سینے سے لگا کر سسک پڑیں۔ وہ ان کے سینے سے الگ ہو کر بولی۔ "امی! شاید میں نے بہت گستاخانہ باتیں کر لی ہیں' آج آپ نے سچ بولنے کے لیے کہا تو میں نے یہ سب کہہ دیا ورنہ شاید آج بھی خاموش رہتی۔ آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں نا.....!"

"نہیں میری جان! میں تم سے قطعی ناراض نہیں ہوں بلکہ بہت زیادہ شرمندہ ہوں۔ یہ بتاؤ کہ ناہید کو تو تم نے کچھ نہیں بتایا نا.....!" انہوں نے کہا۔

"نہیں امی! مجھے رخصت کرتے وقت امی جان نے مجھے یہی نصیحت کی تھی کہ "بیٹا! اپنے گھر کی ہر اچھی اور خوشی کی بات ہمیں بتانا' دکھ اور پریشانی کی نہیں۔ تم پڑھی لکھی اور سمجھ دار ہو' اپنے گھر کے مسائل کبھی اپنی ماں کے گھر مت لے کر آنا' اپنے مسئلوں کو خود سلجھانا' اچھی بیٹیوں کے یہی طور طریقے ہوتے ہیں۔" حرا نے کہا تو عالیہ نے حرا کے دونوں بازو مضبوطی سے تھام کر کہا۔

"مجھے فخر ہے ناہید کی تربیت پر اور اپنے انتخاب پر۔ اب فہد کو میں سزا دوں گی' اور تم میرا ساتھ دو گی۔"

"کیسی سزا امی.....!" حرا نے چونک کر کہا۔

"پریشان مت ہو' سزا ایسی ہو گی جس میں سب کا فائدہ ہو گا' بچہ بیمار ہو تو ماں کو کڑوی دوا کھلانی ہی پڑتی ہے۔ ویسے میں جانتی ہوں کہ تم فہد سے بے حد محبت کرتی ہو۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تو اس نے شرما کے سر جھکا لیا۔

رات تک فہد کا بخار پوری طرح اتر چکا تھا۔ مگر اسے بہت کمزوری محسوس ہو رہی تھی' وہ بیڈ پر آنکھیں بند کیے لیٹا تھا کہ کسی کے قدموں کی آہٹ پر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ امی ہاتھ میں دلیے کا پیالہ لیے چلی آ رہی تھیں' انہوں نے نیپکن بچھایا اور اس کے آگے پیالہ

رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ چکن ڈال کر حرا نے تمہارے لیے دلیہ بنایا ہے' اسے سارا ختم کرنا ہے تاکہ تمہاری کمزوری دور ہو۔"

فہد نے دلیے کی جانب دیکھا اور بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"آپ کو تو پتا ہے کہ میں دلیہ نہیں کھا سکتا' پلیز امی مجھے روٹی سالن لا دیں خوب مرچوں والا' میرا منہ کا ذائقہ بہت خراب ہو رہا ہے۔"

"قطعی نہیں!" امی نے صاف انکار کر دیا۔ "شازیہ نے بختی سے ہدایت کی ہے کہ مرچ مسالا اور روٹی بالکل نہیں دینی ہے۔ تمہیں پتا ہے کتنا بخار تھا' ایک سو چار..... فی الحال نرم غذا لو' طبیعت ٹھیک ہو جائے گی تو جو چاہو کھا لینا۔"

پھر وہ محبت سے اپنے ہاتھوں سے فہد کو کھلانے لگیں۔ وہ بُرے بُرے منہ بنا کے حلق سے اتارتا رہا' پھر بس کہہ کر سر تکیے پر رکھ دیا' انہوں نے اسے دوا کھلائی اور سونے کی تلقین کرتے ہوئے لائٹ آف کر کے کمرے سے چلی گئیں۔

امی کے جانے کے بعد فہد حرا کے بارے میں سوچنے لگا۔ خود بخود اس کا دل حرا اور شہلا کا موازنہ کرنے لگا۔ ایک وہ تھی جس کو اس نے اپنے دل کی تمام تر شدتوں کے ساتھ چاہا تھا' اس کی کتنی خوشامد کی تھی کہ وہ اس کا ساتھ نہ چھوڑے' وہ اسے ہر وہ آسائش دے گا جو وہ چاہتی ہے' بس امی کو چھوڑ دینے کی کڑی اور ناممکن شرط نہ رکھے' وہ روتک دیا تھا اس کے آگے..... مگر شہلا کی محبت کا رنگ کتنا کچا تھا' بارش کے ایک قطرے سے ہی اتر گیا۔ ایک یہ لڑکی ہے حرا! شادی کی پہلی ہی رات میں نے اسے کتنا بڑا دکھ دیا' اسے کتنی بُری طرح ٹھکرا دیا مگر اس نے اُف تک نہیں کی اور نہ میرے اس بُرے رویے کی کسی سے شکایت کی۔ بس خاموشی سے چپ چاپ ہر ستم سہتی رہی۔

"تم تو ٹھکرائے جانے کی اذیت سے واقف تھے فہد! پھر تم نے کسی اور کو یہ دکھ کیوں دیا.....!" اس نے اپنے آپ کو ملامت کی۔ وہ بے چینی اور بے قراری سے سر کو تکیے پر پٹخ رہا تھا' اس نے سوچا ابھی حرا کمرے میں آئے گی تو وہ اس سے اپنے بُرے رویے کی معافی مانگ لے گا' اسے منائے گا حالاں کہ فہد نے ابھی تک اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا مگر جا چکے وہ جیسی بھی ہے' میں اسے اپنا لوں گا۔

کتنی حیرت کی بات ہے کہ ہمیں ایک ساتھ رہتے ہوئے تین ماہ ہو گئے' مگر میں نے یہ تک نہیں دیکھا کہ وہ کیسی ہے' لمبی ہے یا چھوٹی' گوری ہے یا کالی' دبلی ہے یا موٹی' وہ رات گئے کمرے میں آتا اور بنا اس پر توجہ دیئے صوفے پر لیٹ جاتا اور حرا ایک پتھر کی بے جان مورتی بنی رہی۔ وہ اس کا انتظار کرتا رہا مگر وہ نہیں آئی اور انتظار کرتے کرتے نیند کی دوا نے اپنا اثر دکھایا اور وہ بے خبر سو گیا۔

عشاء کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد حرا نے اپنے کمرے میں جانا چاہا تو امی نے اسے روکتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

"اپنے روم میں.....!" اس نے پلٹ کر جواب دیا۔

"آج سے تم میرے روم میں میرے ساتھ سوؤ گی۔" انہوں نے کہا۔

"جی.....!" اس نے حیرت سے کہا۔

"ہاں! میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میں فہد کو سزا دوں گی اور اس میں تم میرا ساتھ دو گی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے امی! مگر بستر سے علیحدہ کرنے کی سزا تو شوہر دیتا ہے اور وہ بھی اس صورت میں جب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیوی حد سے زیادہ نافرمان ہو۔'' اس نے کہا۔

''ہاں بیٹا! تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر فہد یہ سزا تمہیں بلا قصور ہی دے چکا ہے' اب وہ بیڈ پر لیٹا ہے تو کیا تم صوفے پر لیٹو گی۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''امی! ان کی طبیعت خراب ہے' کیا یہ مناسب ہوگا کہ رات بھر وہ تنہا کمرے میں ہوں۔ اگر انہیں کسی چیز کی ضرورت ہوئی' انہوں نے پانی مانگا تو.....! امی میں سوؤں گی نہیں' صوفے پر بیٹھی رہوں گی۔'' حرا نے کہا۔

''بے فکر رہو وہ نیند کی دوا لے کر سو رہا ہے۔ بس کچھ دن اور صبر کرلو۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' امی نے کہا تو وہ چپ چاپ بیڈ پر لیٹ گئی۔ لائٹ آف کر کے عالیہ بیگم بھی اس کے قریب آ کے لیٹ گئیں۔ وہ سوتے وقت پڑھی جانے والی دعائیں پڑھتی رہی مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی' اسے بار بار فہد کا خیال آ رہا تھا۔ امی کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ سو چکی ہیں۔ اس کا دل نہ مانا تو وہ دبے پاؤں اٹھی اور اپنے کمرے میں گئی۔ ذرا سا دروازہ کھول کر اس نے اندر جھانکا' فہد گہری نیند میں سو رہا تھا' تو وہ واپس کمرے میں آئی اور لیٹ گئی۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی وہ خیالوں میں فہد سے مخاطب ہوئی۔

''فہد! آپ میرے شوہر ہیں۔ میں نے صرف آپ ہی سے پیار کیا ہے' مگر آپ میرے لیے کیا ہیں۔ اس ریت اور سیمنٹ سے بنی چار دیواری کی مانند۔ جس نے مجھے چھت اور تحفظ تو دیا ہے۔ عیش و آرام بھی ملا ہے۔ سوائے آپ کے پیار آپ کے اعتماد اور اپنا پن کے۔ میں کب تک خود بھی پتھر بنی ایک پتھر کی بے جان مورتی کی طرح اس چار دیواری کے در و دیوار کو تکتی رہوں۔ آخر کب تک فہد..... میرے ناکردہ گناہ کی یہ سزا کب ختم ہوگی.....!''

اسے پتا ہی نہیں چلا اور اس کے آنسو تکیہ بھگوتے رہے۔ یکا یک اسے خیال آیا کہ وہ جو میری شہ رگ سے بھی زیادہ میرے قریب ہے' وہی اندھیرے دلوں میں ضیاء پیدا کرتا ہے' میں کیوں نہ اس سے فہد کو مانگ لوں کہ وہ فہد کے اندھیرے دل میں میرے پیار کا دیا جلا دے..... پھر وہ اپنے ربّ سے باتیں کرتے کرتے سو گئی۔

دوسرے دن فہد کی طبیعت کافی بہتر تھی۔ وہ خود ہی کمرے سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ اسے اس بات کا علم ہی نہیں ہو سکا کہ رات حرا کمرے میں آئی ہی نہیں تھی۔

فہد تین دن سے گھر پر ہی تھا' وہ ڈائننگ ٹیبل پر آ کے بیٹھا اور آواز لگائی۔

''میں ہری مرچوں کا آملیٹ کھاؤں گا۔''

آواز سن کر حرا کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے حالاں کہ کوکنگ کے لیے ایک عورت تھی مگر حرا فہد کا ہر کام اپنے ہاتھ سے کرتی تھی' اس نے ناشتہ ٹرے میں لگایا' حسب سابق دوپٹے کو سر پر جھکا کر اوڑھا اور فہد کے سامنے ناشتہ لگانے لگی۔

فہد کی نگاہیں اس کے ہاتھوں پر تھیں۔ سپید نازک سے ہاتھ گوری کلائیاں جن میں گولڈ کی باریک چوڑیاں تھیں۔ اس بات کو محسوس کر کے حرا کے ہاتھ لرزنے لگے اور سلائس پر جام لگاتی ہوئی چھری اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ وہ چھری اٹھانے کے لیے جھکی تو موٹی سیاہ ناگن سی بل کھائی ہوئی اس کے بالوں کی چوٹی اس کے کمر سے پھسل کر لہرا گئی۔

حرا نے سیدھے ہوتے ہوئے ایک ہاتھ سے آگے آنے والی چوٹی کو دوبارہ کمر پر ڈالا اور تیزی سے کچن کی جانب پلٹ گئی۔ فہد کی نگاہیں جاتے ہوئے حرا کے پورے وجود کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ اسے رہ رہ کے اس بات کی الجھن ہو رہی تھی کہ حرا اس سے اتنی بے اعتنائی کیوں برت رہی ہے' اتنی غیر اتنی اجنبی سی.....!

پھر اس کے دل نے اسے سرزنش کی کہ فہد تم خود اس کے ساتھ اپنے رویے پر غور کرو' تم نے اس کا دل کتنا دکھایا ہے' سب سے اچھی اور تعریف کے قابل بات یہ ہے کہ اس نے تمہارے اس بُرے رویے کو سب سے چھپایا ہے اور نہ ہی تم سے کوئی شکایت کی ہے' تم نے کتنے آرام سے پہلی ہی رات اسے یہ جتلا دیا تھا کہ اس کی تمہارے لیے کوئی اہمیت کوئی وقعت نہیں ہے' تمہارے دل پہ تو شہلا کا قبضہ ہے اور حرا کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

فہد یہ بات جانتا تھا کہ اگر وہ ابھی حرا کو یہ حکم دے گا کہ وہ آج رات اس کے ساتھ بیڈ روم میں سوئے تو وہ انکار نہیں کرے گی مگر وہ اپنے اس گناہ کی تلافی اس کا دل جیت کر کرنا چاہتا تھا۔ اسے اپنانے سے پہلے اسے بتا دینا چاہتا تھا کہ وہ اپنے دل سے شہلا کی پرچھائیں کو بھی نکال چکا ہے۔ اس کے دل پر صرف اور صرف حرا کا قبضہ ہے اور اس نے اسے دل کی تمام تر شدتوں کے ساتھ چاہا ہے' اسے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ حرا کو کیا چیز پسند ہے اور کیا نہیں۔ وہ اس کے لیے ایسا کیا کرے کہ وہ خوش ہو جائے مگر یہ بات وہ کس سے پوچھے۔ اچانک ہی حرا کی چھوٹی بہن ندا کا خیال آیا۔ اس نے اپنے آفس سے حرا کے گھر فون کیا۔ فون ناہید نے اٹھایا' فہد نے ان کی خیریت پوچھنے کے بعد ندا سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے فون ندا کے حوالے کر دیا۔

ایک دو باتیں کرنے کے بعد فہد اپنے مطلب کی بات پر آ گیا اور جب اس نے حرا کی پسند ناپسند کے بارے میں پوچھا تو اس نے حیرانی سے کہا۔

''حیرت ہے فہد بھائی! آپ کو ابھی تک آپی کی پسند ناپسند کے بارے میں معلوم نہیں ہے۔''

''بھئی بات دراصل یہ ہے کہ تمہاری آپی اپنے منہ سے تو کبھی کچھ نہیں کہیں گی' میں نے پوچھا بھی تو اس نے کچھ نہیں بتایا' میں نے سوچا کہ تم سے ہی معلوم کرلوں۔'' فہد نے بات بنانے کے لیے کہا۔

ندا نے اسے بہت کچھ بتایا جو فہد نے ذہن نشین کرلیا اور ندا کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ اسے حرا کو یہ بات بتانے سے بھی منع کر دیا۔ ندا نے ہنستے ہوئے وعدہ کیا کہ وہ حرا کو کچھ نہیں بتائے گی۔

فہد گھر میں حرا کی آواز سننے کے لیے ترس گیا تھا' وہ زیادہ تر خاموش رہتی یا کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتی۔ وہ جہاں جہاں جاتی فہد کی نگاہیں اس کا احاطہ کیے ہوئے ہوتیں۔

عالیہ بیگم یہ سب خاموشی سے دیکھتی رہتیں اور دل ہی دل میں مسکراتی رہتیں۔ کبھی کبھی انہیں فہد پر ترس بھی آتا کہ وہ اپنے بچے کو خوامخواہ پریشان کر رہی ہیں۔ کیوں کہ وہ جان چکی تھیں کہ فہد اپنی غلطی پر نادم ہے اور شہلا اس کے دل و دماغ سے نکل چکی ہے لیکن وہ چاہتی تھیں کہ فہد خود حرا سے اپنی غلطی اور کوتاہی کی معافی مانگے۔

ندا نے بتایا تھا کہ آپی کو سرخ گلاب بہت پسند ہیں۔ فہد روزانہ ڈھیروں سرخ گلاب لاتا۔ کبھی ڈریسر پر گلاب رکھے ہوتے تو کبھی بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر' اسے بلو کلر پسند تھا' فہد نے اپنے بیڈ روم کی کلر اسکیم تبدیل کروا دی' بہت ڈھیر سارے بلو ڈریسز اس کی وارڈ روب میں لا کر رکھ دیے۔

حرا یہ سب کچھ دیکھتی رہی۔ وہ حیران تھی کہ فہد یہ سب کیا کر رہا ہے' یہ سب اس کی پسند کے مطابق ہو رہا ہے۔

❁.....☆.....❁

اس روز نو دسمبر تھی۔ آج اس کی شادی کو پورے چھ ماہ گزر گئے تھے' فہد کی اب برداشت کی حد ختم ہو چکی تھی۔ وہ خاموشی سے حرا کو منانے کی کوشش کر رہا تھا مگر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ کتنی پتھر بنی ہوئی تھی اس پر کسی بات کا اثر کیوں نہیں ہو رہا۔

اس روز وہ رات کو آٹھ بجے گھر آیا تو اس کے ہاتھ میں بہت سارے شاپنگ بیگز تھے وہ سیدھا بیڈ روم میں گیا اور وہاں جا کر زور سے حرا کو آواز دی۔

فہد کی آواز سن کر حرا اور عالیہ بیگم دونوں چونک گئیں۔ آج پہلی بار فہد نے حرا کو پکارا تھا۔ آواز سنتے ہی وہ تیر کی طرح اپنے روم میں پہنچی اور فہد کے سامنے سر جھکا کر خاموشی سے کھڑی ہو گئی۔ فہد منتظر رہا کہ حرا کچھ پوچھے گی مگر وہ خاموش تھی۔ تب فہد نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔

"ان بیگز میں تمہارے لیے ایک ڈریس اور جیولری ہے تم وہ پہن کر تیار ہو جاؤ بس فٹافٹ.....!"

"جی اچھا!" وہ دھیرے سے منمنائی۔

روم سے فہد کے جانے کے بعد حرا نے بیگز کو کھول کر دیکھا تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ سرخ رنگ کا عروسی جوڑا ساتھ میں بہت نفیس گولڈ کا سیٹ اور ایک چھوٹا سا ٹیکا تھا۔ وہ کچھ سمجھ بھی رہی تھی اور کچھ سمجھ بھی نہیں پا رہی تھی۔ بہر حال فہد کا حکم تھا سو اسے تعمیل کرنی تھی مگر عشاء کی اذان ہو چکی تھی اس لیے وہ وضو کر کے نماز پڑھنے لگی نماز سے فارغ ہو کر اس نے لباس تبدیل کیا اور جیولری بھی پہن لی۔ تیار ہو کر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ باہر جائے یا یہیں اس کا انتظار کرے اس گومگو کی کیفیت میں وہ کھڑی تھی کہ فہد کمرے میں داخل ہوا اس کے ہاتھوں میں سرخ مہکتے ہوئے گلابوں کا گلدستہ تھا۔

فہد کی آمد کو محسوس کر کے اس نے جھٹ دوپٹے کا پلو اپنے چہرے پر جھکا لیا۔ فہد نے پلٹ کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور حرا کے سامنے سینے پر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بہت گہری نگاہوں سے اس کے سراپا کا جائزہ لے رہا تھا پھر اس نے حرا کا ہاتھ تھام کر بیڈ پر بٹھایا اور سرخ گلاب اس کی جانب بڑھا دیئے جنہیں حرا نے جلدی سے تھام لیا۔

"حرا.....!" اس نے بھاری لہجے میں پکارا۔

"جی.....!" وہ دھیرے سے گنگنائی۔

"میرا بہت دل چاہتا ہے کہ میں تمہارا رُخِ زیبا دیکھوں مگر اس سے پہلے میں چند الفاظ تم سے کہنا چاہتا ہوں اگر تم اجازت دو تو.....!"

"جی!" وہ دوبارہ بولی۔

"میں تم سے اپنی تمام کوتاہیوں کی معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ میں بہت شرمندہ بھی ہوں۔ میں تمہارا قصوروار ہوں میں نے تمہارا بہت دل دکھایا ہے نہ صرف تمہارا بلکہ اپنی پیاری امی جان کا بھی۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ بچپن سے امی نے میری تربیت اسلامی اصولوں پر کی ہے مگر جب میں کالج میں گیا اور شہلا سے ملاقات ہوئی۔ اس نے خود میری جانب پیش قدمی کی اپنی پسند اور محبت کا یقین دلایا پھر دھیرے دھیرے اس کا رنگ میرے اوپر چڑھتا چلا گیا۔ سب سے پہلے میں نماز سے دور ہوا وہ مولانا کہہ کر میرا مذاق اڑاتی تھی۔ میں شاید احمق تھا اسی لیے اسے چاہنے کی حماقت کر بیٹھا۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر جب اس نے امی کے پاکیزہ وجود پر اعتراض کیا اور انہیں ہمیشہ کے لیے چھوڑنے کی شرط رکھی تو میں ایسا نہ کر سکا پھر اس نے بہت جلد مجھے چھوڑ کر کسی اپنے جیسے شخص سے شادی کر لی اور پھر اپنے شوہر کی ترقی کے لیے جب وہ میرے باس کے ساتھ رات گزار کر گئی اور اسے اپنی اس حرکت پر ندامت بھی نہیں ہوئی تو میرے دل میں اس کے لیے نفرت پیدا ہو گئی۔ میں نے اس بے وفا لڑکی کے لیے تمہیں ٹھکرا دیا لیکن آخر میں نے جان لیا اور مان لیا کہ میں ہیرے کو چھوڑ کر پتھر پانے کی آرزو کرتا رہا۔

اللہ تعالیٰ نے میرے لیے پاکیزہ رزق رکھا اور میں حرام کی جانب دیکھتا رہا۔ میں اپنے مالک اپنے پروردگار! اپنے اللہ! کو گواہ بنا کر یہ اقرار کرتا ہوں کہ میرے دل میں شہلا کی پرچھائیں بھی نہیں ہے۔ اس دل پہ صرف اور صرف تمہارا قبضہ ہے تم نے میرا دل جیت لیا ہے اپنی خدمت اور وفا سے۔ میں اس بات کے لیے بھی تمہارا احسان مند ہوں کہ تم نے میری ایک بُری حرکت کا بھی پردہ رکھا اگر تم مجھے دل سے معاف کرو گی تو میں تمہاری رونمائی کروں گا ہم آج سے اپنی پیار بھری زندگی کا آغاز کریں گے۔ میں تمہیں ہمیشہ خوش رکھنے کا وعدہ کرتا ہوں۔ بتاؤ تم نے مجھے معاف کیا یا نہیں.....!" فہد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تو حرا بولی۔

"میں نے آپ کو سچے دل سے معاف کیا۔ کیوں کہ میرا اللہ معاف کر دیتا ہے اور معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

"بہت شکریہ جانِ فہد! اگر اجازت ہو تو.....!" فہد نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا اور حرا نے شرما کر مزید سر جھکا لیا۔

فہد نے حرا کا آنچل پلٹ دیا ایک نہایت حسین اور ملیح چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے تھا وہ مخمور جذبات سے دیر تک اسے تکتا رہا پھر بے ساختہ اس کے منہ سے ماشاء اللہ نکل گیا۔

"فہد امی کے کھانے کا ٹائم ہو گیا ہے۔" حرا نے گھبرا کے گھڑی کی جانب دیکھا تو کہا۔

"ارے جناب! امی نے کھانا کھا لیا ہو گا میں ان سے کہہ کر آیا تھا کہ آپ کھانا کھا لیجیے گا ہم بعد میں کھا لیں گے۔" فہد نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

اور عالیہ بیگم اپنے کمرے میں شکرانے کے نوافل ادا کر رہی تھیں۔

❁.....☆.....❁

جن نیک اخلاق اور اچھے اوصاف سے انسان کا متصف ہونا چاہیے ان میں عفو و درگزر بھی ہے اللہ تعالیٰ ہمارے عیبوں کو چھپانے اور ہمارے گناہوں کو معاف کرنے والا ہے اور خطا پوشی و معافی کو بے حد پسند فرماتا ہے۔

سورۃ النور آیت 22 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"ترجمہ: اور تم کو چاہیے کہ معاف کر دیا کرو اور درگزر کرو۔ کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے قصور معاف کرے اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔"

ایک اور جگہ سورۃ الشوریٰ آیت ۴۰ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

ترجمہ: "پس جس شخص نے معاف کر دیا اور صلح کر لی تو اس کا اجر و ثواب اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔"

پیارے قارئین! حرا ایک دین دار اور فہم القرآن والی لڑکی تھی۔ جس نے اپنے شوہر کی برائی کا پردہ بھی رکھا اور اسے سچے دل سے معاف کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی اس نیکی کی جزا اس کے شوہر کے حقیقی پیار کی صورت میں عطا کی لیکن اگر وہ اس کے برعکس عمل کرتی تو نہ صرف خود دکھی رہتی بلکہ اپنے والدین کو بھی دکھی کرتی۔

ہم اپنی دنیا کو جنت بنا سکتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ کے احکامات پر عمل کرتے رہیں۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی پیروی کرنے میں ہی ہماری خیر اور بھلائی ہے۔ دنیا میں بھی آخرت میں بھی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اطاعت اللہ اور اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

❁

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کردار

محترم ایڈیٹر صاحب!
السّلام علیکم،
یہ تحریر بالکل حقیقی کرداروں اور واقعات پر مبنی ہے۔ کہ کرئی کوئی اور بھرے کوئی: یہ کہاوت تو یقیناً سب نے ہی سن رکھی ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ اچھے اور مخلص لوگوں کو ہمیشہ ہی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جب کہ برائی کی طرف بڑھنے والے کے قدم قدم پر آسانیاں ہیں۔ یہی کچھ اس کہانی کے کرداروں کے ساتھ بھی درپیش ہے۔ ایک لڑکی نے اپنا ہر گناہ نہایت چالاکی سے ایک سیدھی سادی لڑکی کے کھاتے میں ڈال دیا تھا۔

والسّلام
فاخرہ سلطانہ

اس نے تیسری بار ڈور بیل پر انگلی رکھی اور غصے میں مسلسل دبائی رہی۔

"بس یار! ایک منٹ آئی ابھی.....!" وہ سیڑھیوں پر سے نمودار ہوئی اور عجلت میں پھر واپس ہوگئی۔

"اُف.....!" اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر دوڑائی۔ ٹائم دیکھ کر اس کی بے چینی مزید بڑھ گئی۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ بیگ کاندھے سے لٹکائے چادر کا نقاب لگاتی سیڑھیوں پر سے آہستہ آہستہ اترتی، نیچے آئی۔ وہ گیٹ سے چند سیڑھیاں اوپر تھی جب اس نے ایک نظر نہایت غصے سے اسے دیکھا اور تیزی سے باہر نکل کر گلی کی سیڑھیاں اترنے لگی۔

"ارے رکو تو یار.....!" ثناء اس کے پیچھے بھاگی مگر وہ اَن سنی کیے تقریباً بھاگنے والے انداز میں چلتی رہی۔ ثناء نے بھی اس کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا اور اس کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ ڈھلوانی کنکریٹ کی تنگ سی گلی میں وہ دونوں تیزی سے اترتی چلی جارہی تھیں۔ ثناء اسے مسلسل آوازیں دے کر روکنے کی کوشش کررہی تھی پھر یک دم ثناء نے اپنی رفتار تیز کی اور اسے جالیا۔ اسے دھکا سا لگا اور اس کا توازن بگڑا۔ خود کو روکنے کے لیے اس نے دیوار کے ساتھ لگے گیس میٹر کے پائپ کو پکڑ کر اپنی رفتار کو کم کرنا چاہا مگر اس کی دائیں سائیڈ پوری قوت سے دیوار سے ٹکرائی اور اسے اپنی آنکھوں کے آگے تارے ناچتے محسوس ہوئے، وہ دھڑام سے زمین پر گری۔ ثناء نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا، ثناء بھی گری تھی مگر اس قدر زور سے نہیں اس لیے وہ فوراً سنبھل گئی تھی۔ اس کا دل چاہا چیخ چیخ کے روئے، ثناء پر بے پناہ غصہ آیا۔

"کیا ضرورت تھی تمہیں اتنا تیز بھاگنے کی.....!" ثناء نے نرمی سے اس کے بازو سہلائے۔ اس کی دونوں ہتھیلیاں چھل گئی تھیں اور سر پر بھی چوٹ آئی تھی۔

"گر گئی ہو دونوں.....؟" جس جگہ وہ کھڑی تھیں اس کے سامنے والے گھر کی چھت سے ایک مردانہ آواز آئی۔ کوئی لڑکا دلچسپی سے ان کی حالت کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے لہجے سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ وہ ان دونوں کا مذاق اڑا رہا ہے۔ دونوں نے اس کی بات کا جواب دیئے بنا ایک بار پھر دوڑ لگادی۔ مین روڈ پر آکے دونوں نے آرام سے چلنا شروع کر دیا۔ فلک کے ہاتھ سے خون رس رہا تھا۔

"اوہ..... لاؤ ادھر دو.....!" ثناء نے بیگ سے ٹشو نکال کر اس کے زخم پر رکھ کر دبایا۔

"کیا ضرورت تھی یہ سب کرنے کی.....؟" اس نے اسے نرم لہجے میں ڈانٹا۔

"تمہاری وجہ سے روز کالج کے لیے لیٹ ہوجاتی ہوں، آج تمہیں آخری بار کہہ رہی ہوں آئندہ اگر لیٹ کیا تو میں انتظار نہیں کروں گی۔ سمجھیں....." اس نے وارن کیا۔

"سوری یار!" ثناء نے اپنی ازلی ڈھٹائی سے باز تو نہ آنا تھا کبھی، مگر مصلحتاً وہ ہر روز سوری بول دیتی تھی اور فلک مروّت کی ماری روز اس کے سوری پر "کوئی بات نہیں" کہہ دیتی۔ آج اسے بے پناہ غصہ آیا تھا۔ پورے پندرہ منٹ اس نے ان کے گیٹ کے سامنے کھڑے ہوکر انتظار کیا تھا۔ پہلے ہمیشہ وہ بیل بجاتی تو ثناء گھر کے کپڑوں میں دروازہ کھولتی اور اسے گھر کے اندر لے جاتی کہ "بس یونیفارم پہننا ہے۔ آجاؤ اندر۔" وہ اندر چلی جاتی۔ وہ اسے بٹھا کر اطمینان سے تیار ہوتی۔ اچھا خاصا میک اپ کرتی اور پندرہ بیس منٹ کے بعد تب کہیں جاکے اس کی تیاری مکمل ہوتی پھر وہ چادر اوڑھتی۔ کتابیں جمع کر کے بیگ میں رکھتی۔ فلک نہایت تحمل سے اس کی حرکات کو دیکھتی رہتی مگر آج اس نے اس کے بلانے سے پہلے ہی اسے کہہ دیا کہ "میں اندر نہیں آؤں گی پہلے ہی لیٹ ہیں۔ تم دو منٹ میں تیار ہو کے نیچے آؤ۔" مگر اس نے آج بھی ہمیشہ کی طرح اتنا ہی ٹائم لیا اور نتیجتاً یہ سب ہوا تھا۔ اس کی چوٹوں میں سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ بالکل خاموشی سے چلتی رہی۔ سارا راستہ ثناء اس کی دل جوئی کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ کالج پہنچ کر وہ سیدھی کلاس روم میں گئی۔ کلاس شروع ہونے میں چند منٹ رہتے تھے۔ اس کی چوٹوں میں شدید درد ہورہا تھا۔ اس کے باوجود اس نے تمام کلاسز اٹینڈ کیں۔ مگر ثناء نے ہمیشہ کی طرح کئی پیریڈز مس کیے۔ وہ دونوں کلاس فیلوز تھیں مگر ان دونوں کی دوستیں الگ الگ تھیں۔ صرف گھر قریب ہونے کی وجہ سے دونوں ایک ساتھ کالج آتی تھیں اور واپسی بھی ایک ساتھ ہوتی، پر واپسی پر اسی محلے کی کچھ اور لڑکیاں بھی اکثر ان کے ساتھ ہوتیں مگر زیادہ تر دونوں مل کر اکیلی ہی آتی جاتی تھیں۔ فلک کو اپنی امی کے کہنے پر ثناء کے ساتھ مجبوراً آنا جانا پڑتا تھا کیونکہ ثناء کو جب پتا چلا تھا کہ وہ بھی اسی کی کلاس میں پڑھتی ہے۔ اس سے اگلے دن کالج سے واپسی پر وہ شام کو اس کے گھر آئی تھی اور فلک کی امی سے کہا تھا کہ "آنٹی فلک سے کہا کریں میرے ساتھ جایا کرے۔" اور امی کے کہنے کے خلاف وہ نہیں جاسکتی تھی۔ اس لیے اسے ثناء کو مجبوراً ساتھ لے جانا پڑتا مگر اس کی وجہ سے وہ ہمیشہ کالج ٹائم پر نہ پہنچ پاتی۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن کل کے واقعے کی وجہ سے ثناء چند منٹ جلدی تیار ہوگئی۔ اس نے شکر ادا کیا اور اسی سیڑھیوں والی گلی میں اس کے ساتھ چلنے لگی جو مین روڈ تک جاتی تھی۔

"فلک یار! پلیز یہ بکس پکڑنا۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی کتابیں اس کی طرف بڑھائیں۔ جنہیں اس نے تھام لیا۔ اس کا رخ سامنے کی طرف تھا جب کہ ثناء اس سے وہ دو قدم پیچھے تھی۔

"ہیلو!" اس کے کانوں میں ثناء کی سرگوشی نما آواز پڑی تو اس نے حیران ہوکر پیچھے دیکھا اور ثناء کے ہاتھ میں موبائل دیکھ کر اسے جھٹکا سا لگا۔ وہ موبائل چادر کے نیچے کان سے لگائے بات کرنے لگی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بالکل آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اسے بُری طرح سے دھڑکا لگا تھا کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے مگر شناء بالکل بے فکر تھی۔ بات کرنے کے بعد اس نے موبائل اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ وہ بالکل خاموشی سے اس کی کارروائیاں دیکھتی رہی' جب وہ فارغ ہوگئی تو اس نے فلک کے ہاتھ سے کتابیں لیں اور تیزی سے چلنے لگی۔

''یہ موبائل تم نے کہاں سے لیا؟'' فلک نے سرسری سا انداز اپنایا۔

''کامی نے لاکر دیا تھا۔'' اس نے اپنے چھوٹے بھائی کا نام لیا۔

''تو پھر تم اسے گھر میں کیوں نہیں رکھتیں؟ کیا تم اسے روز کالج لے کر آتی ہو؟'' فلک نے ایک اور سوال کیا۔

''میں نے کامی سے یہ کہہ کے منگوایا تھا کہ میری ایک دوست کو ضرورت ہے۔''

''اوہ!'' فلک اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی۔ گھر قریب قریب ہونے کی وجہ سے اسے شناء کی ریپوٹیشن کچھ حد تک تو پتا تھی۔ مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کی اس طرح کی بھی سرگرمیاں ہوں گی۔ اس کی امی کپڑے سلائی کرتی ہیں۔ ابو سعودی عرب میں ہوتے تھے۔ شناء اور اس کے دونوں بھائیوں کو ہر طرح کی آزادی حاصل تھی اور اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ شناء اس آزادی کا کس حد تک ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہے۔ فلک نے سنا تھا کہ شناء اس سے ایک کلاس آگے تھی اور چکوال کے کسی مخلوط تعلیمی ادارے میں پڑھتی تھی مگر نجانے کیوں وہاں سے چھوڑ کے آ گئی تھی اور اب اس نے اپنے شہر کے ڈگری کالج میں فلک کے ساتھ ایڈمیشن لیا تھا۔ اس کا ایڈمیشن بھی کافی لیٹ ہوا تھا مگر لگتا تھا اسے پڑھائی سے دلچسپی برائے نام اور دیگر ایکٹیوٹیز میں زیادہ تھی۔ کالج کے فنکشن میں شناء ڈانس مقابلوں میں سب سے آگے ہوتی تھی۔ فلک کا اس سے واسطہ صرف آنے جانے کی حد تک تھا۔ کالج پہنچ کر وہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو جاتیں اور واپسی پر پھر اکٹھی ہو جاتیں۔

☆.....☆.....☆

''فلک! آپ کو شناء بلا رہی ہے۔'' وہ شہلا سے باتیں کر رہی تھی جب بشریٰ (شناء کی دوست) کلاس روم میں داخل ہوئی اور اسے بتایا۔

''میں آتی ہوں۔'' فلک نے شہلا سے کہا اور بشریٰ کے ساتھ چل پڑی۔ وہ اس کو لے کر گیراج کی طرف بڑھی۔ جہاں کالج وین کھڑی تھی۔ بشریٰ وین کے اندر چڑھ گئی۔ اس کے پیچھے وہ بھی اندر چلی گئی۔ شناء کی ساری فرینڈز کالج وین میں بیٹھی تھیں۔ وہ شناء کے قریب پہنچی تو شناء نے موبائل اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''بات کرو.....!'' شناء نے موبائل اسے پکڑا دیا اور خود بشریٰ کے ساتھ باتوں میں لگ گئی۔ اس نے گہرا سانس لیا اور سیٹ پر بیٹھ کر موبائل کان سے لگا لیا۔

''ہیلو.....!'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''السلام علیکم!'' دوسری طرف سے وہی مردانہ آواز ابھری۔ اس آدمی سے کچھ دن پہلے شناء نے اس کی بات کروائی تھی۔ اس شخص کا ذکر وہ اکثر کرتی رہتی تھی۔ بقول شناء کے وہ دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے اور اب ملنا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں وہ فلک کی مدد چاہتے تھے۔ اسی لیے شناء دوسری مرتبہ اس بندے سے اس کی بات کروا رہی تھی۔ پہلی مرتبہ بھی اس نے فلک کو کنوینس کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ ان کی مدد کرے مگر اس نے سہولت سے منع کر دیا تھا اور آج پھر وہ جانتی تھی یہی بات ہوگی۔

''جی کہیے.....!'' اس نے کہا۔

''پھر آپ نے کیا سوچا.....'' اس آدمی نے نہایت شائستگی سے بات کا آغاز کیا۔ اس نے گہرا سانس لیا۔

''میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا کہ میں آپ دونوں کے معاملے میں شامل ہونا نہیں چاہتی۔ بہتر ہے آپ لوگ مجھے اس سب سے باہر ہی رکھیں۔''

''دیکھیے پلیز! آپ میری بہن جیسی ہیں' آپ کو بالکل کسی طرح کا کوئی مسئلہ نہ ہوگا پلیز بھروسہ رکھیں۔ آپ کی عزت میری عزت ہے' میں نے آپ کو بہن کہا ہے اور دل سے سمجھا بھی ہے۔ آپ پلیز مان جائیں۔ میں اسلام آباد میں ہوتا ہوں اور شناء کو بہت چاہتا ہوں' صرف ایک بار چند گھنٹوں کے لیے اس سے ملنا چاہتا ہوں اگر آپ ہماری مدد کریں تو ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔'' وہ نہایت مہذبانہ انداز میں بول رہا تھا۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی کیونکہ یہی کہانی اسے شناء نے بھی سنائی تھی اور اسی لڑکے جس کا نام ذوالفقار علی عرف ذکی تھا کے لیے اس نے موبائل بھی لیا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ ذکی نے اس سے ملنے کی ضد کی اور شناء کے نہ ماننے پر اس نے نیند کی گولیاں کھائی تھیں اور پچھلے کئی دن سے اسپتال میں تھا۔ فلک کو سُن کر نہ صرف افسوس ہوا تھا بلکہ دل ہی دل میں ہمدردی کے جذبات بھی ابھرے تھے اور بقول شناء کے ابھی بھی ذکی اسپتال میں ہی تھا۔

''مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' اس نے بے تاثر سے لہجے میں کہا تو وہ آہستہ آہستہ اسے ساری بات سمجھاتا رہا۔ اس کے بعد اس نے موبائل شناء کی طرف بڑھایا۔

''بات ہوگئی بھائی سے.....؟'' اس نے مسکرا کر پوچھا۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر وین سے اتر آئی۔

''کیا ہوا؟ کیا کہا اس نے.....؟'' کلاس روم میں داخل ہوتے ہی اس کو شہلا نے پکڑ لیا اور سائیڈ میں ہو کر پوچھا۔

''چلو میرے ساتھ.....!'' اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کلاس روم کی آخری چیئرز تک چلی آئی۔ ثانیہ بھی ان دونوں کو دیکھ کر وہیں آ گئی۔ تب فلک نے ساری بات ان دونوں کو بتا دی۔ وہ دونوں خاموشی سے سنتی رہیں۔

''تم اس کے ساتھ نہ آیا جایا کرو اور اس کو صاف انکار کر دو کہ تم ان کی کوئی مدد' ودد نہیں کر رہیں۔'' شہلا نے اسے سخت لہجے میں کہا۔

''مگر جیسا انہوں نے کہا ہے اس کو سوچا جائے تو اس میں میرا تو کوئی کردار ہے نہیں۔ میں سامنے ہی نہیں آؤں گی تو میرے خیال میں مجھے کچھ نہیں ہوگا۔'' اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

''مگر پھر بھی تمہیں کیا ضرورت ہے اس چکر میں پڑنے کی.....؟''

''یہ اچھی لڑکی نہیں ہے اور اللہ نہ کرے تمہیں کچھ نقصان پہنچے مگر جس طرح کا یہ معاملہ ہے اس میں تمہارا نام بھی آ سکتا ہے۔''

''ہاں یار! اسی بات کا مجھے بھی ڈر ہے۔ اسی لیے میں نے شناء کو منع کیا تھا کہ اپنے بوائے فرینڈ کو میرا اصلی نام مت بتانا پر اس نے بتا دیا۔ مجھے اس بات سے اس پر بھروسہ نہیں۔ اس لیے میں نے ان لوگوں کو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں کچھ بھی نہیں کروں گی۔'' اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''پھر بھی تم پوری طرح سے محتاط رہنا۔'' شہلا نے اسے ایک بار پھر تاکید کی۔ وہ جانتی تھی کہ فلک' شناء کی طرح تیز طرار اور چالاک نہیں ہے۔ وہ ایک دم سیدھی سادی' بھولی سی' نرم دل اور ہر کسی کے متعلق اچھا گمان رکھتی تھی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی ان دونوں کو انکار نہ کر پائی تھی کیونکہ فطرتاً وہ ہر کسی کے کام آنے والی اور بامروت لڑکی تھی۔

☆.....☆.....☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شام کو وہ کتابیں اٹھائے فلک کے گھر آ پہنچی۔

''آنٹی! فلک کہاں ہے؟'' کچن میں مصروف فلک کو اس کی آواز بخوبی سنائی دے رہی تھی۔

''اندر ہے بچی!'' امی نے اسے بتایا۔ اس کے ہاتھ میں کتابیں دیکھ کر وہ یہی سمجھیں کہ وہ کچھ ڈسکس کرنے آئی ہے کیونکہ چند ہفتوں میں ان کے پیپرز شروع ہونے والے تھے۔ وہ کچن میں ہی آ گئی۔ فلک اس کو لے کر کمرے میں چلی گئی۔

''یار! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ پہلی دفعہ جا رہی ہوں۔ نہ جانے کیا ہوگا۔'' ثناء نے قدرے بے چینی بھرے انداز میں کہا حالانکہ اس کے چہرے پر بڑی اطمینان بھری مسکراہٹ تھی۔

''ایک منٹ رکو.....!'' فلک نے اسے کہا اور اپنی دراز میں سے کچھ ڈھونڈنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اس کے قریب آ کر اپنی بند مٹھی کھولی۔ اس کی ہتھیلی پر ایک لاکٹ رکھا تھا۔ جس میں مقدس آیات لکھی تھیں۔ ''یہ تم اپنے پاس رکھنا' اللہ کرے سب ٹھیک ہو۔'' اس نے وہ لاکٹ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے پُرخلوص انداز میں کہا۔

''او کے شکریہ یار!'' اس نے کہا اور چپکے سے موبائل نکالا اور اسے موبائل کے سسٹم کے مطابق سمجھانے لگی۔ فلک کو موبائل استعمال کرنا نہیں آتا تھا اور طے شدہ پروگرام کے تحت اس نے کل صبح کالج جاتے وقت موبائل اسے دے کر جانا تھا۔ جس میں ذکی بھائی کے نمبر کی اس نے نشان دہی کرادی تاکہ وہ کسی بھی طرح کی ہنگامی صورتِ حال یا ضرورت کے وقت ان دونوں کو کال کر کے انفارم کر سکے۔ اس نے اسے سمجھانے کے بعد موبائل واپس رکھ لیا اور گھر چلی گئی۔

☆.....:.....☆

اگلے دن انہوں نے اپنی گلی میں سے گزر کر مین روڈ تک آنے کے بعد اس راستے کی بجائے ایک نسبتاً لمبا مگر سنسان راستہ اپنایا۔ جس سے وہ روز گزرتی تھیں۔ اس راستے سے شاذ و نادر ہی لوگ گزرتے تھے مگر اس سڑک پر دو اسکول تھے جن میں چھٹی ان کی واپسی کے وقت ہی ہوتی تھی۔ تب رش بن جاتا اور ثناء بنا کسی کی نظر میں آئے آسانی سے اس رش میں واپس جا سکتی تھی۔ کسی کو پتا نہ چلتا کہ وہ کالج سے نہیں کہیں اور سے آئی ہے کیونکہ ان کے کالج کے سامنے بوائز ہائی اسکول تھا اور اس بوائز اسکول کی پشت پر اسی راستے کے دوسری طرف ایک پرائیویٹ اسکول تھا اور کالج سے چھٹی کے وقت اکثر لڑکیاں بھی اسی راستے سے گزرتی تھیں۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق ذکی نے اس راستے کے اختتام پر مین سڑک پر بالکل اس گلی کے منہ کے آگے کار کھڑی کر رکھی تھی۔ وہ ہی ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ سڑک تقریباً سنسان تھی۔ فلک ان دونوں کی طرف دیکھے بنا ثناء کے گاڑی تک پہنچنے سے پہلے ہی تیز تیز قدم اٹھاتی کالج کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا موبائل فلک کے بیگ میں سائیلنٹ موڈ پر تھا۔ فلک پورے اطمینان سے کالج پہنچ گئی۔ کالج پہنچ کر اس نے شہلا اور ثانیہ کو مطمئن انداز میں سب بتا دیا اور ثناء کی دوستوں کی طرف مڑ گئی۔ موبائل اس نے بشریٰ آسیہ کے حوالے کیا اور خود اپنی سیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ فری پیریڈ میں اس نے آسیہ کے پاس جا کر اسے کال ملانے کے لیے کہا مگر آسیہ نے موبائل نکالا اور بقول اس کے اپنے کسی ''کزن'' سے گفتگو میں مصروف ہوگئی۔

اس نے واپس جا کر اطمینان سے اپنا کام شروع کر دیا۔ وہ ان لوگوں کے چکر میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ کالج ٹائم آف ہونے سے کچھ دیر پہلے اس

نے جا کر آسیہ سے پوچھا تو اس نے موبائل اسے واپس دیتے ہوئے کہا کہ ان لوگوں سے رابطہ نہیں ہو پا رہا۔ ان کے نمبرز مسلسل آف جا رہے ہیں۔ ایک پل کو اسے تھوڑا خوف محسوس ہوا مگر اگلے پل وہ یہ سوچ کر مطمئن ہوگئی کہ میں نے تو کچھ غلط نہیں کیا پھر کیوں ڈروں' وہ لوگ اپنی مرضی سے گئے ہیں اور اگر ثناء واپس نہیں آتی تو وہ موبائل کہیں بھی پھینک دے گی یا سب کچھ سچ سچ بتا دے گی۔ یہی سوچتی ہوئی وہ دوستوں کو اللہ حافظ کہہ کر اسی راستے سے گزر کر طے شدہ جگہ پر پہنچ گئی۔ جہاں ثناء نے کہا تھا کہ وہ وہاں کھڑی ہوگی مگر وہاں نہ وہ تھی نہ اس کے کہیں قریب قریب اس کا نام و نشان تھا۔ وہ رکے بنا گھر جانے والے راستے کی طرف چل پڑی۔ گھر پہنچ کر اس نے یونیفارم چینج کیا اور کچن میں کھانا کھانے کے لیے جاتے وقت بیگ میں سے موبائل چپکے سے نکال کر دوپٹے کے نیچے کر لیا اور کچن میں آ گئی۔ اس نے وہی نمبر ڈائل کیا جو ثناء نے بتایا تھا اور اس بار کال مل گئی۔ اس نے بات کی دوسری طرف ذکی تھا۔

''ہاں بھئی! کہاں ہیں آپ! ثناء کو میں نے وہیں ڈراپ کر دیا ہے۔'' اس نے کہا۔

''میں گھر پر ہوں۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

''شاباش! ہم نے آپ کو کیا کہا تھا کہ وہاں رکنا.....اس کا انتظار کرنا؟'' دوسری طرف سے تپے ہوئے لہجے میں کہا گیا اور کال کٹ گئی۔ اس نے غصے سے موبائل کو گھورا اور پھر موبائل کو زبان نکال کر چڑایا اور اسے چھپا کر اطمینان سے کھانا کھانا شروع کر دیا۔

☆.....:.....☆

دوسرے دن ثناء کالج اس کے ساتھ گئی۔ راستے میں اس نے موبائل اس کے حوالے کیا۔ ثناء بالکل نارمل اس سے ملی حالانکہ اس کا خیال تھا کہ وہ اس کے انتظار نہ کرنے کی وجہ سے اسے ذکی کی طرح باتیں سنائے گی مگر اس نے اس کی سنجیدگی کے باعث کچھ نہ کہا۔ فلک بالکل خاموشی سے اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اب وہ ایسا کوئی کام دوبارہ نہیں کرے گی لیکن اگر اس نے کہا تو اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ ہرگز ہرگز کسی بھی طرح سے اس کا ساتھ نہیں دے گی۔

☆.....:.....☆

''آج پھر ذکی نے مجھے وہیں سے پک کرنا ہے۔'' چند روز بعد کالج کے لیے نکلتے وقت ثناء نے نہایت اطمینان سے اطلاع دی۔

''کیا؟'' اسے حیرت کے ساتھ ساتھ غصہ بھی آیا اس پر۔

''ہاں! تم پلیز میرا موبائل اپنے پاس رکھو۔'' اس نے موبائل جلدی سے اس کے بیگ میں ڈالا۔ ''اور پلیز اس بار میرا انتظار لازمی کرنا۔'' اس نے التجائیہ انداز میں کہا۔

''دیکھو ثناء! تم جو مرضی کرو مگر مجھ سے اب کچھ بھی توقع مت رکھو۔ تم آج جدھر سے مرضی جاؤ۔ میں تو اپنے راستے سے ہی کالج جاؤں گی۔'' اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ثناء کچھ دیر کے لیے چپ ہوگئی۔

''او کے!'' تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا اور تھوڑی دور جا کر وہ اسی سنسان راستے کی طرف مڑ گئی۔ فلک اطمینان کے ساتھ پُراعتماد انداز میں چلتی ہوئی کالج پہنچ گئی۔ گیٹ سے اندر داخل ہونے کے بعد وہ روش پر چلتی ہوئی کالج کی بلڈنگ کی طرف جا رہی تھی' جب گراؤنڈ میں گھاس پر بیٹھے ثناء کی دوستوں کے گروپ میں سے آسیہ نے زور سے اسے آواز دے کر روکا' وہ رک گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ثناء نے آج کالج نہیں آنا تھا؟" اس نے اس کے قریب آ کر پوچھا۔

تو اس نے تمام صورتِ حال بتادی۔ بات کرتے کرتے وہ دونوں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کلاس روم کی طرف بڑھ گئیں۔

کلاس روم میں پہنچ کر اس نے بیگ میں سے موبائل نکال کر اسے دے دیا۔ پھر یہ ثناء کا معمول بن گیا۔ ہر دوسرے تیسرے دن وہ ملنے جارہی ہوتی تھی اور فلک نے نوٹس کیا کہ باہر ایک نیا بندہ ایک نئی گاڑی میں آتا اور اسے پک اینڈ ڈراپ کرتا۔ فلک کو چار و نا چار اس کے ساتھ آنا جانا پڑتا۔ اس کی کلاس فیلو صاعقہ کے ابو اکثر اپنی بیٹیوں کو کالج چھوڑنے اور واپس لینے آتے تھے۔ فلک کوشش کرتی کہ واپسی پر وہ ان لوگوں کے ساتھ نکلے مگر کالج سے نکلنے میں بھی ثناء بہت ٹائم لیتی اور صاعقہ لوگ نکل جاتیں۔ فلک تو ثناء کے ساتھ بُری طرح سے پھنس چکی تھی۔ گھر میں کچھ بتا نہیں سکتی تھی۔ ان کے پیپرز شروع ہو چکے تھے۔ پروموشن ٹیسٹ تھے اس لیے بھی ثناء کو زیادہ پروانہ تھی مگر فلک کو اپنی پڑھائی اور اپنی ریپوٹیشن ہر شے سے بڑھ کر تھی، وہ پوری لگن اور محنت سے پیپرز دے رہی تھی۔ پروموشن ٹیسٹ ختم ہوئے تو اس نے سکون کا سانس لیا پھر رزلٹ آیا تو اس کے سب ہی مضمون میں بہت اچھے نمبر آئے تھے۔ تقریباً اسی فیصد یا پچاسی فیصد تک ہر مضمون کے جب کہ ثناء دو مضامین میں فیل ہوگئی اور باقیوں کے نمبر بہت کم تھے۔ رزلٹ پتا چلنے کے بعد گھر جاتے وقت ثناء نے فلک سے کہا۔

"امی کو مت بتانا کہ میرے نمبر کم ہیں پلیز..... وہ تم سے لازمی پوچھیں گی۔ اس لیے تم اتنے بتا دینا جتنے تمہارے ہیں۔" فلک کو اس کی بات پر غصہ تو بہت آیا مگر چپ کر گئی۔ وہ تو کبھی بھی کسی سے جھوٹ نہ بولتی تھی اور ثناء ہر کسی سے ہر بات پر جھوٹ بولتی اور اسے بھی اکساتی تھی۔ کچھ حد تک اس کے عیب چھپا کر اسے اندر ہی اندر بے چینی ہوتی رہتی مگر وہ کیا کر سکتی تھی۔ اس کے اتنے گھٹیا اور بُرے کاموں میں بھی یہ سوچ کر اس کی مدد کر دیتی کہ کہیں وہ پھنس نہ جائے کسی مصیبت میں۔

☆.....:.....☆

اس نے دو بار ثناء کو ایک ہی بندے کے ساتھ جاتے دیکھا تھا۔ جو بقول ثناء کے زکی کا دوست تھا۔ جس کے گھر زکی اسلام آباد سے آنے پر ٹھہرتا تھا۔ وہ اسے پک کرتا اور زکی کے پاس لے جاتا۔ پھر ایک دن ایک سفید رنگ کی سوزوکی کار میں وہ گئی۔ فلک کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ چندو بھیا تھے، چاند نام ہے ان کا۔ زکی کے کزن ہیں۔

پھر ایک دن وہ دونوں کالج سے نکلیں تو ایک بلیک کلر کی کار کالج گیٹ سے تھوڑا دور کھڑی تھی۔ ثناء نے کالج سے نکلتے ہی اس کو دیکھ لیا اور فلک کو کھینچ کے جھنجوڑ ڈالا۔

"فلک! وہ دیکھو زکی کھڑا ہے۔" اس نے پُرجوش آواز میں کہا۔

"ہیں.....؟ یہ زکی بھائی ہیں؟" اس نے اشتیاق سے تھری پیس بلیک سوٹ میں ملبوس ایک ہینڈسم سے لڑکے کو اس کار پر کہنیوں کے سہارے ٹیک لگا کر کھڑے دیکھا۔ اس کے دل میں احترام ابھرا کیونکہ زکی نے اسے بہن کہا تھا۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کی طرف بڑھیں۔ وہ دونوں بازو کار کی چھت پر رکھے انہی کو دیکھ رہا تھا۔ قریب سے گزرتے وقت ثناء نے اسے سلام کیا۔ فلک بھی مسکراتی نظروں میں احترام لیے اسے دیکھ رہی تھی۔ سلام کا جواب دیتے وقت اس شخص نے فلک کی آنکھوں میں دیکھا

تھا۔ پل بھر میں فلک کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ اس شخص کی آنکھوں میں بھائیوں جیسا کوئی تاثر نہ تھا۔ عجیب سرخی مائل گدلی گدلی سی نظریں تھیں اس کی اور جب اس نے فلک کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں بھی عجیب سا عامیانہ پن تھا۔ بھائی بہنوں کو کم از کم ایسی نظر سے کبھی نہیں دیکھ سکتے۔ خواہ رشتہ منہ بولا ہی کیوں نہ ہو۔ فون پر اس شخص نے بہت بڑے بڑے دعوے کیے تھے کہ تم میری بہن ہو۔ میری عزت ہو اور اب اس کی نظروں میں میرے لیے احترام نہیں۔ اس نے دکھ سے سوچا۔ پر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ انہیں پتا نہ ہو کہ یہ میں ہوں۔ اگلے ہی پل اس کے ذہن میں یہ خیال ابھرا اور وہ قدرے مطمئن ہوگئی۔ وہ دونوں اب اس سے کافی دور آ گئی تھیں کچھ ہی دیر بعد فلک نے اسی کار کو اپنے سے کچھ فاصلے پر ساتھ ساتھ رینگتے دیکھا۔ اب اس کار میں چار لوگ بیٹھے تھے اور وہ شخص جسے ثناء نے زکی کہا تھا، اب کار ونڈو میں سے تھوڑا سا باہر کو جھکا، مسلسل انہی کو فوکس کیے ہوئے تھا۔ کئی بار فلک نے اس کی نظریں خود پر محسوس کیں مگر اب وہ مطمئن تھی یہ سوچ کر کہ وہ مجھے یقیناً کوئی اور لڑکی سمجھ رہے ہیں۔ تقریباً آدھا راستہ ان کی کار کبھی آگے کبھی پیچھے آہستہ آہستہ ان کے ساتھ چلتی رہی پھر ایک جگہ دکانوں کے سامنے بنے پارکنگ ایریا میں جا کر رک گئی۔ تبھی فلک کو یاد آیا کہ اسی طرح ایک کار مسلسل کئی دنوں تک انہیں فالو کرتی رہی تھی۔ ثناء نے اس بندے کو جاننے سے انکار کر دیا تھا جب کہ وہ کار ان کے گھر تک ان کے پیچھے آئی تھی، فلک ڈر گئی تھی اور ثناء کے سامنے اسے بُرا بھلا کہتی رہتی۔ فلک نے کبھی بھی کار میں موجود بندے کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی مگر ایک دن اتفاقاً اس کی نظر پڑ گئی تھی۔ یہ وہی تھا جسے ثناء نے چاند بھائی کہا تھا، زکی کا کزن!

"ارے یہ تو وہی ہے نا..... زکی بھائی کا کزن....." اس نے چونکتے ہوئے ثناء سے کہا تھا۔

"ہاں یہ..... یہ وہی ہے۔ اصل میں زکی جب اسلام آباد چلا جاتا ہے تو انہیں کہہ کر جاتا ہے کہ ہمارا خیال رکھے۔ اس لیے شاید یہ ہماری نگرانی کرتے ہیں تاکہ راستے میں ہمیں کوئی تنگ نہ کرے۔" ثناء کی ہلکی سی سٹپٹاہٹ کو فلک نے محسوس نہ کیا تھا۔ وہ اپنے ہی دھیان میں تھی۔

"How Nice of Him" ثناء کی بنائی ہوئی بات پر اعتبار کرتے ہوئے وہ زکی کی تعریف کرنے لگ گئی۔ اس وقت اسے یہ قطعی اندازہ نہ تھا کہ ثناء اسے کس کس طرح سے بے وقوف بنا رہی ہے اور وہ اپنی سادہ فطرت اور بھولپن کی بناء پر اس کی ہر بات کو سچ سمجھ کر اعتبار کرتی چلی جاتی۔

☆.....:.....☆

کبھی کبھار وہی چاند بھائی بائیک پر ان کے پیچھے ہوتا تھا۔ ایک دن وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اسی گلی میں کھڑا ہے۔ ثناء کا گھر پہلے آتا تھا، آگے تین چار منٹ کے فاصلے پر فلک کا گھر تھا۔ ثناء کو اللہ حافظ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتی گھر کی طرف بڑھنے لگی۔

بے دھیانی میں اس نے اپنے پیچھے آتی بائیک کی طرف یونہی پلٹ کر دیکھا۔ بائیک کا انجن بند تھا جسے چاند آہستہ آہستہ چلاتا ہوا اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ اس کی مسکراتی نظریں اسی پر جمی تھیں۔ اس کا چہرہ تپ گیا، وہ اور زیادہ تیز رفتاری سے گھر کی طرف بڑھ گئی تھی۔ زکی بھائی سے پھر بات ہوئی تو اس کی شکایت کروں گی۔ اس نے غصے سے سوچا۔

☆.....:.....☆

"تمہارے لیے ایک میسج ہے۔" اگلے دن وہ ثناء کے ساتھ ہلکی پھلکی باتیں کرتی ہوئی چل رہی تھی، جب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ثناء نے اچانک کہا۔ اسے لگا شاید ذکی نے کچھ کہا ہوگا۔

"کس نے دیا؟" اس نے پوچھا۔

"چندو بھیا نے.....!" ثناء نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

"کیا.....؟" اس کو تعجب ہوا۔ "کیا کہا ہے اس نے؟" اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"اس نے کہا ہے تمہاری دوست ڈیسنٹ سی لگتی ہے اس سے کہو مجھ سے دوستی کرے۔"

"کیا.....؟ کمینہ 'ذلیل' کتا.....!" اس نے سُن کر اسے اس کے شایانِ شان گالیوں سے نوازا۔

"ارے یار! دوستی نہیں کرتیں تو نہ کرو پر ایسے تو نہ کہو' وہ ذکی کا کزن ہے۔" ثناء کو شاید اسے گالیاں پڑنے پر تکلیف ہو رہی تھی۔ اس لیے اس نے اسے ٹوکا اور اس کے بعد اس نے فلک کو اس کے متعلق کبھی کچھ نہ کہا۔

اس کے کچھ دن بعد ثناء نے پھر بتایا کہ وہ ذکی کی امی سے ملنے جا رہی ہے۔ ذکی اسے اپنی امی سے ملوانا چاہتا ہے اور اس بار بھی اسے زلفی نے پک کرنا تھا (ذکی کا وہی دوست جس کے گھر وہ ٹھہرتا تھا)۔

"اوہ!" فلک کو اب اس کی اس روز روز کے آنے جانے کی تقریباً عادت ہو چکی تھی۔

اور اس دن بھی ثناء چلی گئی۔ اس دن بھی اسے پک کرنے ایک نئے ماڈل کی کار میں کوئی آیا تھا۔ فلک نے صرف دور سے کار کو ہی دیکھا۔ کار کے اندر موجود شخصیت کو دیکھنے سے محروم ہی رہی کیونکہ جب جب وہ جس جس طرح سے گئی' ایسا ہی لگا کہ جیسے اسے لینے والا شخص مکمل طور پر چھپنے کی کوشش میں ہے۔ جیسے کوئی باپردہ خاتون ہو۔ فلک کو اس سے قطعی کوئی دلچسپی بھی نہ تھی کہ کب اسے کون لینے آیا اور کون چھوڑنے.....!

☆.....:.....☆

رمضان کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ اس لیے کالج سے جلدی چھٹی ہو جاتی تھی۔ وہ جب گھر جاتی ابو گھر پر ہوتے۔ اس کا روزانہ کا معمول تھا وہ ایک مقررہ وقت پر ہی گھر پہنچ جاتی تھی۔ اپنے معمول کے وقت سے وہ ایک منٹ بھی اِدھر اُدھر نہ ہوتی۔

ایک دن کالج ٹائم آف ہونے کے بعد وہ ثناء کو ڈھونڈتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ وہ بشریٰ کے ساتھ کھڑی نقاب لگا رہی تھی۔

"جلدی چلو لیٹ ہو رہے ہیں۔" اس نے کہا۔

"ایک منٹ.....!" وہ فلک سے کہہ کر بشریٰ کے ساتھ تھوڑا سائیڈ پر ہو کر موبائل نکال کے باتوں میں مصروف ہو گئی۔ فلک نے ایک کوفت بھری نظر اس پر ڈالی اور شہلا کے پاس کھڑی ہو گئی۔ شہلا کی ابھی وین نہیں آئی تھی کچھ دیر وہ اس سے باتیں کرتی رہی پھر شہلا وین کے آ جانے پر چلی گئی۔ وہ کچھ دیر اس کا انتظار کرتی رہی مگر وہ باہر نہ نکلی۔ وہ ایک بار پھر اسے بلانے گئی۔ وہ بشریٰ کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس کے قریب آ کر اس نے فلک کا ہاتھ تھاما اور بولی۔

"پلیز یار! دس منٹ ہمارا یہیں انتظار کرو۔ ہم مارکیٹ تک جا رہے ہیں۔ مجھے ذکی کے لیے عید گفٹ خریدنا ہے اور بشریٰ نے بھی واحد بھائی کے لیے گفٹ لینا ہے۔ ہم بس ابھی گئے اور ابھی آئے۔"

اس نے کہا تو فلک تلملا اٹھی۔ مگر مروتاً خاموش رہی۔ وہ دونوں کہہ کر عجلت میں چلی گئیں۔ وہ شدید غصے کے باوجود کالج سے نہیں گئی۔ تقریباً دس منٹ تک تمام کالج خالی ہو گیا۔ اب صرف اکا دکا لڑکیاں ہی گیٹ کے پاس رہ گئی تھیں۔ اسے بے طرح اُلجھن ہونے لگی۔

وہ تھوڑی دیر اور انتظار کرتی رہی تقریباً پچیس منٹ تک انتظار کرنے کے بعد اس پر جھنجلاہٹ طاری ہونے لگی۔ کالج اب تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ چوکیدار گیٹ بند کرنے کے لیے اس کے نکلنے کا انتظار

کر رہا تھا۔ اب اسے چوکیدار مشکوک نظروں سے دیکھنے لگ گیا۔ گھبرا کر وہ گیٹ سے باہر نکل آئی۔ باہر آ کر اس نے غصے سے تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ گھر پہنچ کر اس نے غصے سے جا کے کتابیں رکھیں اور سائس لیے بنا ابو کو اس کی حرکت بتا دی۔

"تو بیٹا! تمہیں کسی بات کا ڈر نہیں' تم اکیلی ہی چلی جایا کرو۔" ابو نے نارمل انداز میں کہا تو اس پر اور زیادہ جھنجلاہٹ سوار ہوئی۔

لڑکیوں کے امی ابو ان کی طرف سے کتنے فکرمند رہتے ہیں۔ ان کو چھوڑنے اور لینے بھی اکثر والدین کو آتے جاتے دیکھا تھا اس نے مگر اس کے ہمیشہ سے اچھے چال چلن کی وجہ سے ابو کو اس پر بے حد اعتماد تھا۔ وہ اکثر نہیں جانا ہوتا تو گھر میں سے کسی کو ساتھ چلنے کے لیے کہتی تھی تو ابو کہہ دیتے کہ تمہیں کوئی ڈر نہیں۔ اکیلی ہی چلی جاؤ لیکن اب یہ بات اس کی برداشت سے باہر ہو گئی تھی۔

"نہیں! اگر آپ یہ چاہتے ہو کہ میں کالج جاؤں تو آپ مجھے اب روز چھوڑنے جایا کریں اور واپسی پر بھی کسی سے نہیں مجھے لانے کے لیے۔" اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے' میں چھوڑ آیا کروں گا۔" ابو مان گئے تب اسے تسلی ہوئی اور چینج کرنے چلی گئی۔

اگلے روز ابو کے ساتھ اسے دیکھ کر ثناء بوکھلا گئی۔ ثناء کے دادا باہر کھڑے تھے۔ ابو کچھ دیر رک کر ان سے بات کرتے رہے۔ وہ دونوں ان سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھیں۔ ثناء نے اسے پہلو میں کہنی مار کر متوجہ کیا۔

"ابو کو کیوں ساتھ لائی ہو؟" اس نے ناگواری سے پوچھا۔

"کل میں کالج میں تمہارا انتظار کرتی رہی' بہت لیٹ گھر پہنچی تھی۔ ابو نے مجھے بہت ڈانٹا کہ لیٹ کیوں آئی ہو..... اور اب اسی لیے مجھے خود چھوڑنے جایا کریں گے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں بتا دیا۔

وہ چپ کی چپ رہ گئی۔ ابو نے اس کے دادا سے طے کر لیا کہ اب ان دونوں کو چھوڑنے اور لینے جانا پڑے گا۔ جوان بچیاں ہیں اکیلے بھیجنا ٹھیک نہیں۔ ثناء کے دادا نے بھی اس بات سے اتفاق کیا اور ذمہ داری خود لے لی اور وہ بھی ان کے ساتھ چل پڑے۔ وہ دونوں ان کے پیچھے پیچھے چل پڑیں۔ فلک دل ہی دل میں بے حد مسرور تھی۔ کالج پہنچ کر اس نے نہایت پُرجوش انداز میں اپنا کارنامہ شہلا کے گوش گزار کیا۔ وہ بھی سُن کر اسے داد دینے لگی۔

اس طرح ثناء کی سرگرمیاں کچھ محدود ہو گئیں۔ واپسی پر ابو نے صاعقہ کے ابو صفدر چاچو کو کہہ دیا کہ انہیں بھی ساتھ لے کر آیا کریں۔ اب وہ صاعقہ کے ساتھ نکلتیں۔ ثناء کے کارناموں کے متعلق تمام کالج کو آہستہ آہستہ خبر ہو چکی تھی مگر وہ نہایت چالاک تھی۔ اس کے متعلق جو بھی باتیں ہوتیں ڈھکی چھپی ہوتیں۔ اس نے ہر کلاس کی' ہر طرح کی لڑکیوں سے دوستیاں گانٹھ رکھی تھیں۔ کھل کر کسی کی بھی ہمت نہ تھی کچھ کہنے کی.....! کچھ وقت آرام سے گزر گیا مگر ایک بار پھر وہ دونوں اکیلی آنے لگیں۔

☆.....:.....☆

ایک دن ثناء اس کے ساتھ کالج کے لیے نکلی تو بالکل خاموش تھی۔ اس کی آنکھیں بھی گلابی گلابی سی' روئی روئی سی لگ رہی تھیں۔

"کیا ہوا ہے.....؟" فلک نے پوچھا۔

"کامی اور امی نے مجھ سے موبائل نکلوا لیا۔" اس نے روتے ہوئے بتایا۔

"اوہ....." اس نے کہا۔ "کیسے پتا چلا انہیں؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے پوچھا۔

''کل رات تقریباً صبح کے تین بجے کامی نے مجھے جگایا اور کہا کہ موبائل نکالو۔ میں نے کہا کون سا موبائل؟ تو اس نے بولا۔ نکالو..... نکالو..... امی بھی یہی بولیں اور انہوں نے مجھ سے لے لیا۔ یہ سب اس کمینی رانو کی وجہ سے ہوا ہے۔ اسی نے میری شکایتیں لگائیں۔'' اس نے اپنی چچی کا نام لیا۔ ''بہت ڈانٹا انہوں نے اور بہت بے عزتی کی میری۔'' وہ روتے ہوئے بتاتی رہی۔ فلک کو سچ مچ بہت دکھ ہو رہا تھا۔ وہ بھی افسردہ ہوگئی اس کے رونے پر۔ اس دن کالج سے لوٹتے وقت ثناء نے ذکی کے نمبرز فلک کو لکھ کر دیئے اور کہا۔

''تم ذکی کو گھر کے نمبر سے کسی طرح کال کر کے بتا دینا کہ میرے ساتھ کیا ہوا۔'' فلک نے سر ہلایا۔

گھر پہنچ کر اس نے موقع دیکھ کر ذکی کو بتا دیا۔ وہ بے حد پریشان ہوا تھا۔

☆.....:.....☆

''یہ پھر ہمارے پیچھے آ رہا ہے۔'' کالج سے واپسی پر کنکریٹ والی ڈھلوانی گلی میں سے اوپر چڑھتے وہ ہانپنے لگی تو سانس لینے کے لیے رکی۔ تبھی اس کی نظر اپنے پیچھے آتے چاند پر پڑی۔ وہ ابھی ان سے کافی دور تھا اس نے گھبرا کر ثناء کو دیکھا۔

''چلو جلدی.....'' اس نے اسے کھینچا مگر وہ جمی کھڑی رہی۔

''چاند بھائی کو ذکی نے بھیجا ہے۔ اس نے میرے لیے موبائل بھیجا ہے ان کے ہاتھ.....'' اس نے اسے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

وہ اب قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ سجی تھی۔ فلک کو اس کی شکل اور اس پر سجی مسکراہٹ مکروہ سی لگی۔ ثناء کھڑی تھی مگر اس نے اس کے قریب آنے سے پہلے ہی تیز چلنا شروع کر دیا۔ ثناء کا گھر اب بالکل سامنے تھا۔ وہ موبائل ثناء کو تھما کر تیزی سے گلی کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ فلک کے قریب پہنچ کر ایک لمحے کے لیے اس نے رک کر اس پر ایک نظر ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔

☆.....:.....☆

ثناء کی پھر وہی سرگرمیاں زور و شور سے شروع ہوگئیں۔ وقت گزرتا رہا پھر ایک دن ثناء کا فلک کے گھر فون آیا شام کے وقت۔

وہ عجیب گھٹی گھٹی سی آواز میں بات کر رہی تھی اور اسے بصد اصرار صبح کالج ساتھ چلنے کے لیے کہہ دیا۔ ان دنوں ان کے کالج لیول پر فائنل پیپرز سے پہلے ٹیسٹ پیپرز ہو رہے تھے اور فلک ہمیشہ کی طرح پوری سنجیدگی کے ساتھ پیپرز دے رہی تھی مگر اگلے دن اس کی چھٹی تھی۔ اسے سمجھ نہ آیا کہ ثناء کیوں اس طرح کالج جانے کی ضد کر رہی ہے۔ اس کے اصرار پر اس نے کہہ دیا کہ میں ابو کو بتا چکی ہوں کہ کل کالج کی چھٹی ہے۔ ثناء نے فون بند کر دیا۔

فلک کو اندازہ تھا کہ ضرور اس نے کوئی ایسا ویسا کچھ سوچ رکھا ہے اس لیے وہ اس کے ساتھ جا کر خود بھی لوگوں کی نظروں میں مشکوک نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے انکار کر دیا تھا۔ یہ تو اسے بعد میں احساس ہوا تھا کہ اس کا یہ انکار اسے معجزاتی طور پر کتنی بڑی مصیبت سے بچا گیا تھا۔

دوسرے دن ثناء کا صبح دس بجے کے قریب فون آیا۔ اس نے فلک کو بتایا کہ وہ بشریٰ کے ساتھ اس کے لیے کالج آئی ہے۔ بشریٰ کے نمبر سے ہی کال کر رہی ہوں اگر کہو تو اس سے بات کرواؤں؟ پتا نہیں کیوں اس نے فلک کو بذاتِ خود صفائی بھی دینے کی کوشش کی۔ فلک کو اس سے کچھ دلچسپی نہ تھی۔ اس

نے ثناء سے کال کرنے کی وجہ پوچھی۔

''یار! میری امی اگر تم سے پوچھیں تو انہیں یہی بتانا کہ اکنامکس گروپ کا پیپر نہیں تھا پر باقی کلاس کا آج پیپر ہے۔ اس لیے ثناء گئی ہے کالج..... پلیز!''

فلک نے سادگی سے کہہ دیا کہ ''او کے کہہ دوں گی!'' اور فون رکھ دیا۔

☆.....:.....☆

اگلے دن وہ روٹین کے مطابق ثناء کو بلانے اس کے گھر گئی۔

اپنی سادگی میں اسے بالکل بھی کسی طرح کی غیر معمولی بات کا اندازہ تک نہ ہوا۔ ثناء کی امی کنیز فاطمہ جن کو وہ باجی کہتی تھی۔ اسے وہ جب بلانے گئی تو اس کی امی بھی اس کے ساتھ کالج چلنے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ اس نے ثناء سے پوچھا کہ باجی کیوں جا رہی ہیں؟ تو اس نے سرسری سا کہا۔ ''انہیں کام ہے'' فلک نے مزید کچھ نہ پوچھا۔ کالج پہنچ کر وہ کلاس روم کی طرف چل پڑی جب کہ ثناء اور کنیز باجی ہاسٹل میں پرنسپل صاحبہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

''ثناء آ گئی ہے.....؟'' گراؤنڈ میں اسے آسیہ نے روکا۔

''ہاں! پرنسپل سے ملنے گئی ہے ابھی آ جائے گی۔'' اس نے سرسری سے انداز میں بتایا اور آگے بڑھی۔

''ثناء واپس آ گئی ہے؟'' اس کی کلاس کی کچھ اور لڑکیوں نے وہی سوال تھوڑے ردّ و بدل کے ساتھ پوچھا۔ وہ سر ہلا کر آگے بڑھی۔

''ثناء واپس آ گئی ہے؟'' بشریٰ اس کے قریب آئی اور پوچھا۔

''اُف! ہاں بابا آ گئی ہے۔'' کچھ ہی دیر میں اس کے گرد لڑکیوں کا ہجوم سا لگ گیا۔ وہ حیرت زدہ تھی۔ شہلا اس کی حالت دیکھ کر اس کی مدد کے لیے آگے بڑھی اور لڑکیوں کے بیچ کھڑے کھڑے اسے ڈانٹنے والے انداز میں بولی۔

''کچھ پتا بھی ہے تمہیں؟ تم ثناء کے ساتھ پھر کیوں گھوم رہی ہو؟''

''کیا ہوا ہے؟'' اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''لو جی! اس کو پتا ہی نہیں ہے۔'' اس کی دوستوں نے اس کی کم عقلی کو کوسا پھر شہلا اسے بتانے لگی۔

''ثناء کل کسی کے ساتھ بھاگ رہی تھی کالج سے..... اور پکڑی گئی۔''

''اُف میرے اللہ!'' اسے جھٹکا سا لگا۔ ''بھاگ رہی تھی؟ مگر وہ تو.....'' وہ سخت الجھن کا شکار تھی۔ بشریٰ اور آسیہ اس کے قریب کھڑی تھیں۔ ''پر وہ تو کل تمہارے ساتھ تھی ناں؟'' اس نے بشریٰ کو مخاطب کیا۔

''کیا؟ میرے ساتھ.....؟ میں تو کل کالج آئی ہی نہیں تھی۔ تمہیں پتا ہے کہ کل چھٹی تھی۔'' بشریٰ کی بات پر اس نے گہرا سانس لیا۔

''ذکی بھائی بھی پکڑے گئے؟'' اس نے ان سے پوچھا۔

''نہیں! وہ کسی بوبی نامی شخص کے ساتھ پکڑی گئی ہے۔ کل گیارہ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب اس کا بھائی اسے کالج سے لینے کے لیے آیا تو پرنسپل اور ٹیچرز نے اس کی موجودگی سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ تب اس کا بھائی مس رابعہ کو دھمکانے لگا کہ آپ لوگ جھوٹ بولتے ہو۔ میں آپ لوگوں پر مقدمہ چلاؤں گا اگر ثناء نہ ملی تو..... میڈم کو سخت غصہ آیا اور انہوں نے پہلے ہی کالج کی طرف سے پولیس میں رپورٹ درج کروا دی کہ ان کی لڑکی نجانے کب اور کیسے غائب ہوئی اور اب الزام کالج انتظامیہ پر دھر رہے ہیں پھر پتا چلا کہ باہر کسی بندے نے کالج کے پاس سے اس لڑکی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو گاڑی میں بیٹھ کر کھیوڑہ والی سائیڈ پر جاتے دیکھا ہے' اس سے پوچھ پڑتال کر کے ثناء کے ماموں گاڑی لے کر اس کے پیچھے گئے اور پتا نہیں کہاں سے اور کیسے اسے ڈھونڈ لائے۔'' وہ تفصیلاً بتانے لگیں۔

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ کل میں اس کے کہنے پر اس کے ساتھ نہیں آئی۔ کل اس نے مجھے فون کر کے بہت اصرار کیا ساتھ چلنے کے لیے۔'' اس نے بے ساختہ اللہ کا شکر ادا کیا اور آہستہ آہستہ انہیں اس کی تمام سرگرمیوں کے متعلق بتاتی چلی گئی اور ان سب لڑکیوں سے اسے پتا چلا کہ اس کی ایک سے نہیں بلکہ کئی لڑکوں سے دوستی تھی۔ بازار میں کئی دکان داروں سے بھی اس کی دوستی تھی۔ بشریٰ کے ساتھ مارکیٹ جانے کی وجہ گفٹ خریدنا نہیں بلکہ کسی سے ملنے اس کی شاپ پر گئی تھی۔ جس کا نام فرحان ہے۔ اس کی دکان کے اردگرد کہیں کسی اور سے بھی اس کی دوستی تھی۔ یہ بوبی یا فرحان سے ملنے گئی تھی اور اس لڑکے کے کسی حریف نے اس کے گھر اس کی شکایت لگادی۔ تبھی ثناء کا بھائی کالج پتا کرنے آیا تھا اور ساری بات پھر سامنے آ گئی تھی کھل کر.....! بوبی کے ساتھ گئی تھی یا فرحان کے ساتھ؟ اس نے الجھ کر بتانے والی سے سوال کیا۔

''فرحان ہی کا نام بوبی بھی ہے۔'' لڑکی وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''پورے کالج میں صرف ثناء ہی موضوع بحث تھی۔ ہر کسی کی زبان پر ثناء کا قصہ تھا۔ یہاں تک کہ اس دن کسی ٹیچر نے بھی کلاس کا رخ نہ کیا۔ پرنسپل نے اسے کالج سے نکال دیا۔ اس کے خلاف آرڈر جاری کیا کہ اب اس کالج میں قدم بھی رکھنے کی اسے اجازت نہیں۔ انہوں نے اس کی خوب بے عزتی کی اور ایک عدد تھپڑ بھی مارا تھا۔ اب وہ پڑھائی جاری نہ رکھ سکتی تھی۔

یقیناً ایسی ہی کسی وجہ سے اسے چکوال کے اس مخلوط تعلیمی ادارے سے بھی نکالا گیا ہوگا۔ فلک نے سوچا کیوں کہ ایک دن ثناء نے راستے میں اپنے ایک کلاس فیلو کا بھی ذکر کیا تھا۔ جو بقول ثناء کے اس سے پیار کرتا تھا۔ ثناء کافی خوب صورت تھی اور اپنے چہرے پر معصومیت طاری کرنے کی کوشش کرتی رہتی اور بولتے وقت لہجے کو بہت میٹھا اور ملائم بنانے کی بھرپور کوشش کرتی اور اس نے اپنی خوب صورتی اور مصنوعی مٹھاس والی آواز کا خوب خراج وصول کیا تھا۔ ان کے درمیان بیٹھی فلک اپنی بے خبری اور سادہ لوحی پر افسوس کر رہی تھی۔ صد شکر کہ وہ بے خبری میں مار نہ کھا بیٹھی اور اللہ نے اسے بچالیا۔ وہ اللہ تعالیٰ کا بار بار شکر ادا کر رہی تھی۔

☆.....☆

وقت گزرتا رہا اور فلک کے بی اے کے سالانہ امتحانات شروع ہوگئے۔ ان کے پیپرز چکوال کے ڈگری کالج میں ہو رہے تھے۔ پہلے پیپر کے دن ثناء کو وہاں موجود پا کر اس کے متعلق چہ میگوئیاں چلتی رہیں۔ ثناء کے رنگ ڈھنگ اور انداز واطوار سے قطعی نہ لگ رہا تھا کہ وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہے یا اسے اس واقعہ سے کچھ فرق پڑا ہے۔ وہ پیپر دینے بھی اس طرح تیار ہو کر آتی جیسے کسی پارٹی میں آئی ہو۔ اس کی امی اس کے ساتھ ہوتیں۔ پیپرز کے اختتام پر سب اپنے اپنے گھروں کو سدھاریں۔ کون کہاں گیا' کس کے ساتھ کیا ہوا' کچھ خبر نہ تھی۔ سب گھروں میں بند ہوگئیں۔ رزلٹ آیا تو فلک پاس ہوگئی۔ اس کی اکثر سہیلیاں آتیں' گھر قریب ہونے کے باعث اسے ثناء کے متعلق ابھی بھی کچھ نہ کچھ سننے کو ملتا رہتا تھا۔ اس نے سنا کہ ثناء فیل ہوگئی ہے۔ ایک دن وہ فلک کے گھر کے قریب واقع اپنے نانا' نانی کے گھر کی چھت پر کھڑی

تھی۔ فلک نے اسے دیکھا تو مجبوراً اسے بلانا پڑا۔ فلک نے ثناء سے اس کے رزلٹ کے متعلق پوچھا تو اس نے ہنس کر کہا کہ پاس ہوں۔ فلک اس کی دروغ گوئی پر مسکرادی۔ اب اسے ثناء کی کسی بھی بات کا اعتبار نہ ہوتا تھا کیونکہ فلک سے آج تک اس نے جو کہا اس کا ایک ایک حرف جھوٹ ثابت ہوا تھا۔

☆.....☆

بی اے کے بعد فلک نے کمپیوٹر کا ایس جوائن کرلی۔ اس کے بعد اس کی شدت سے خواہش تھی کہ وہ ماسٹرز کرے۔ اس لیے اس نے اپنے شہر کے ایک پرائیوٹ ادارے میں ایڈمیشن لیا۔ پاکستان ایجوکیشنل سینٹر جو دو بہن بھائی چلا رہے تھے۔ اس ادارے کے ایڈمنسٹریٹر خرم شہزاد نے ایک دن اسے کہا۔

''میڈم'' (خرم شہزاد کی بہن) جن کا نام انیلہ تھا'' کہہ رہی ہیں کہ ہمیں ریسیپشن پر ایک لڑکی درکار ہے' جس کی تعلیم انٹر ہو.....''

فلک نے کہا کہ ''وہ دیکھے گی اگر کوئی ایسی لڑکی ہوگی تو وہ بتادے گی۔''

فلک کے پاس پڑوس کی ایک لڑکی جس کا نام شبنم ہے۔ پڑھنے آتی تھی ان دنوں اس کے پیپرز ہو رہے تھے۔ فلک نے شبنم سے یونہی ذکر کیا کہ اس کے سینٹر پر ریسپشنسٹ کی ضرورت ہے۔ اگر کسی کو جاب کی ضرورت ہو تو بتانا۔ پھر خیال آنے پر اسی کو آفر کی کہ وہ یہ جاب کیوں نہیں کرلیتی۔ شبنم خوش ہوگئی اور گھر سے اجازت لے کر اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہوگئی۔ شبنم کی ماں سوتیلی ہے۔ شبنم کی اپنی ماں ایک حادثہ میں گزر گئی تھی۔ وہ اور اس کی بڑی بہن لیلیٰ سوتیلی ماں کے ستائے ہوئے کبھی پھوپی کے گھر کبھی چاچا کے گھر رہ رہی ہوتیں۔ اس نوکری کے لیے اس کی سوتیلی ماں نے بہت مشکل سے فلک کے امی ابو کے کہنے پر اجازت دی۔ خیر وہ اگلے دن فلک کے ساتھ سینٹر چلی گئی۔ سرخرم کو اس نے اس کے متعلق پہلے ہی بتادیا تھا۔

سر نے کہا کہ ''یہ دو تین دن یہاں کام کرے گی تو تب ہی اس کے متعلق کچھ فیصلہ ہوگا۔'' وہ دونوں ہچکچاہٹ کا شکار تھیں کہ اگر دو تین دن بعد سر نے اسے ریجیکٹ کردیا تو شبنم کی سوتیلی ماں اس کا جینا حرام کردے گی۔ شبنم کی بڑی بہن لیلیٰ کی شادی فلک کے چچازاد بھائی سے ہوئی تھی۔ اس لیے لیلیٰ کو تو کوئی مسئلہ نہ تھا وہ اپنے گھر میں خوش تھی۔ مگر شبنم اپنی سوتیلی ماں کے رحم وکرم پر تھی۔ وہ خوف زدہ تھی۔ اس نے فلک سے کہا۔

''باجی! آپ سر سے بات کریں پلیز کہ ان کا فیصلہ جو بھی ہو اس کے حق میں ہو۔'' اس کے اصرار پر نہ چاہتے ہوئے بھی فلک نے مجبوراً سرخرم کو اس کے کچھ حالات بتا کر درخواست کی کہ اسے ریجیکٹ نہ کریں۔ سرخرم خاموشی سے سنتے رہے۔ یہ سب جاننے کے بعد بھی انہوں نے ہامی نہ بھری۔ فلک کی ماسٹرز کی کلاسز شام کو شروع ہوتی تھیں۔ وہ شبنم کو وہاں چھوڑ کر گھر آ گئی۔

ایک دن بخیر وعافیت گزر گیا۔ اگلے دن شبنم اکیلی ہی گئی۔ شام کی کلاسز کے لیے فلک تیار ہو رہی تھی جب شبنم آئی۔ وہ فلک کے پاس ہی رک گئی' فلک کو اندازہ ہوگیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ اس نے اس سے پوچھا تو اس نے جھجکتے ہوئے بتادیا کہ سرخرم نے اسے آفس میں اکیلے میں تنگ کیا۔ اس کے ساتھ کافی بدتمیزی کرنے کی کوشش کی۔ جب شبنم رونے لگی تو وہ بھی قدرے سنبھل گئی۔ فلک خاموشی سے اس کی تمام باتیں سنتی رہی پھر وہ سوچ میں پڑ گئی کہ اب کیا کیا جائے۔ نہ اب شبنم وہاں جاسکتی تھی نہ جاب چھوڑ سکتی تھی۔ وہ دونوں معمولی سی لڑکیاں اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے خلاف کیا کرسکتی تھیں۔ کچھ سوچ کر فلک نے میڈم سے بات کرنے کی ٹھانی۔ میڈم نے تحمل سے سنا اور گویا ہوئیں۔

"میں اپنے بھائی کو جانتی ہوں' اسے اپنے ادارے کی ریپوٹیشن کا خیال ہے وہ ایسی حرکت نہیں کرسکتا۔ پھر بھی مردوں کا کیا بھروسا آپ کل اس لڑکی کو ساتھ لے کر آنا پھر آمنے سامنے بات ہوگی۔"

جب اگلے دن وہ دونوں ان کے پاس گئیں تو سر ہتھے سے ہی اکھڑ گئے اور میڈم نے بھی پینترا بدل لیا۔ وہ دونوں خاموشی سے گھر واپس آ گئیں۔ اب فلک بھی اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکتی تھی' جس کا اسے بہت افسوس تھا۔ اس میڈم نے فلک کی امی کو گھر بلا کر بہت کچھ کہا۔ شبنم نے اپنی کسی دوست کے بھائی سے کہہ کر سرخرم کو کال بھی کروایا تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ اس بات کا بھی میڈم نے فلک کی امی کو بتا دیا۔ امی نے جا کر شبنم کی سوتیلی ماں کو بھی سب بتا دیا۔ معاملہ بہت سنگین ہوگیا تھا۔ فلک بے قصور ہوتے ہوئے بھی ڈانٹ کھا رہی تھی۔ وہ بے حد پریشان تھی۔ وہ شبنم کی سوتیلی ماں کی فطرت کو اچھی طرح سے جانتی تھی اور وہی ہوا جس کی اسے توقع تھی۔ ساجدہ بیگم نے شبنم اور فلک کو ہی قصوروار ٹھہرایا۔ فلک کو بظاہر تو وہ کچھ نہ کہہ سکتی تھیں مگر در پردہ وہ اس کے پیٹھ پیچھے اس پر الزام ترشیاں کرنے لگی۔ شبنم اپنی پھوپی کے گھر چلی گئی تھی کیونکہ اپنے باپ کے گھر اس کی سوتیلی ماں نے اس کا جینا حرام کر دیا تھا۔ کچھ دن بعد لیلیٰ کی نند نورین جو فلک کی چچازاد بہن تھی' فلک کے گھر آئی اور بتایا کہ لیلیٰ کی ماں ہمارے گھر بیٹھی تھی اور میری امی سے کہہ رہی تھی کہ فلک پہلے ثناء کے ساتھ تھی تو اسے خراب کر دیا اور اب شبنم کے ساتھ بھی ویسا ہی کیا اس نے..... فلک کو بے حد غصہ آیا۔ وہ جانتی تھی کہ ثناء کی ماں اور ساجدہ بیگم کی ایک دوسرے سے کافی بنتی تھی۔ ثناء نے خود کو پارسا ظاہر کرنے کے لیے تمام الزام فلک پر دھر دیئے تھے اور خود معصوم بننے کی کوشش کر رہی تھی۔ ساجدہ بیگم بھی اسی قماش کی عورت ہے۔ وہ محلے میں اور ہر آنے جانے والے کو یہی کہتیں..... مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ ثناء اور ساجدہ بیگم جب بھی فلک کے سامنے آتیں تو ایسے ظاہر کرتیں جیسے اس کی سب سے بڑی خیر خواہ ہوں۔ وہ نورین کی باتیں سن کر سخت غصے میں تھی مگر ساتھ ساتھ اسے سخت تعجب بھی تھا کہ آخر اس کی غلطی کیا تھی۔ صرف یہی ناں کہ وہ ان دونوں کی بھلائی چاہتی تھی اور ان دونوں یعنی شبنم اور ثناء کے ساتھ بھلا کرنے میں لگی رہی۔

جس کا صلہ اسے الزامات کی صورت مل رہا تھا۔ شبنم بیگم نے بھی اب آنکھیں ماتھے پر رکھ لی تھیں اور فلک سے بے رخی جتانے کی بھرپور کوشش کرتی۔ اسے سخت حیرت اور صدمہ ہوا کہ شبنم کو فلک نے دو سال بناء کسی فیس کے ٹیوشن پڑھایا تھا۔ بناء کسی صلے کی توقع رکھے مگر اسے اندازہ نہ تھا کہ اسے یہ صلہ ملے گا۔ ثناء کی اب بھی وہی حرکتیں تھیں۔ اب تو اس نے دو موبائل رکھ لیے تھے تاکہ ایک پکڑا جائے تو وہ دوسرا استعمال کر سکے۔ شبنم کی شادی اس کے چچازاد سے ہو چکی تھی۔ فلک اکثر ایسے ہی الزامات کا سامنا کرتی رہتی ہے مگر وہ پھر بھی اللہ کی شکر گزار ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ایسا کردار' ایسی سیرت عطا کی ہے کہ وہ کبھی بھی ایسا کوئی غلط کام کرنا تو دور ایسا ارادہ بھی نہیں کرسکتی تھی۔

مکافات

محترم بھائی عمران احمد!

امید ہے خیریت سے ہوں گے۔ اپنی ایک اور تحریر بعنوان "مکافات" ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے یہ آپ کے معیار پر پوری اترے گی اور قارئین بھی اسے پسندیدگی کی سند عطا کریں گے۔ کہانی کا موضوع عام سا ہے لیکن اس کا انجام بہت ہی خاص اور حساس ہے۔ یہ واقعہ گو میڈیا میں نہیں آیا کیونکہ یہ اس وقت وقوع پذیر ہوا تھا جب الیکٹرانک میڈیا نے اتنی ترقی نہیں کی تھی لیکن پھر بھی اس سانحہ نے جاننے والے لوگوں کو لرزا کے رکھ دیا تھا۔

والسّلام

زین نقوی

ساہیوال

"امی مجھے لوگوں سے ڈر لگتا ہے' میں ملازمت نہیں کرسکتی۔" اس نے بے چارگی سے کہا۔

"تو نہ کرو' ہم بھی تو یہی کہہ رہے ہیں۔" سلطانہ بیگم نے مسکرا کر جواب دیا۔

"مگر میں چاہتی ہوں کہ ملازمت کروں۔ میں اپنی تعلیمی قابلیت کو زنگ آلود نہیں ہونے دوں گی۔" اس کا اصرار تھا۔

"تو یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔" سلطانہ بیگم نے پوچھا۔

"جی ہاں!" اس نے مضبوط لہجے میں مختصر سا جواب دیا۔

وہ ایم اے کا امتحان دے چکی تھی' ابھی نتائج کا اعلان نہیں ہوا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ وہ کامیابی حاصل کرے گی۔ گھر کے در و دیوار کھانے کو آ رہے تھے' پہلے ایسی فرصت نہیں تھی اور ایسے احساسات بھی نہیں تھے۔ بڑے دونوں بھائی اور والد صاحب سرکاری ملازمتوں پر فائز تھے گھر اچھا چل رہا تھا مگر ملازمت کرنا اس کی ضد تھی۔ آخر اس نے اس بات کا تذکرہ اپنی خاص دوست آصفہ سے کر ہی ڈالا۔

"یار! گھر میں فارغ رہ کر بور ہوگئی ہوں' کہیں ملازمت کرنا چاہتی ہوں۔" عاشی آصفہ سے کہہ رہی تھی۔

"تم لڑکی ہو گھر کے کام کاج میں آنٹی کی مدد کرسکتی ہو۔ کھانا پکانا سیکھو' سلائی کڑھائی کرو۔ سو کام ہیں تمہارے سیکھنے کے لیے۔" آصفہ نے جواب دیا۔

"اور..... اور..... میں ستر کی دہائی کی سلیقہ شعار بہو بننے کے خود کو لیے خود کو مکمل تیار کر رکھوں۔" عاشی نے چوٹ کی۔

"ہاں تو کیا حرج ہے عورتوں کو یہ سب سیکھنا چاہیے' ڈاکٹر مقدر بیگ پتا نہیں نسخے میں کیسا گھر اور کیسی زندگی لکھ دے۔" آصفہ نے اس کی بات جیسے سنی ہی نہیں۔

"بس کرو اماں جی! اتنا دماغ تو میری نانی اور دادی بھی نہیں پکاتی تھیں جتنا تم پکا رہی ہو۔ میرے مسئلے کا حل سوچو۔" عاشی جھنجلا گئی۔

"اچھا اپنا سیل فون دو میں مراد بھائی سے بات کرتی ہوں۔" آصفہ نے اس کی ضد دیکھ کر کہا۔

"نہیں! میں اپنا سیل فون نہیں دوں گی' ان کے پاس میرا نمبر چلا جائے گا تم اپنے سیل فون سے ٹرائی کرو۔" عاشی نے گھبرا کر جواب دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تو کیا ہو جائے گا۔ ان سے کہہ کر تمہارا نمبر ڈیلیٹ کروادوں گی۔ میرے پاس کریڈٹ نہیں ہے ورنہ تم سے نہ کہتی۔" یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"آصفہ ڈارلنگ! تم تو بُرا مان گئیں یار! دراصل میں اس معاملے میں کسی پر اعتماد نہیں کرتی۔ تم کہتی ہو تو مان لیتی ہوں مگر مراد بھائی سے کہنا مجھے ملازمت ملنی چاہیے۔" عاشی نے اس کی ناراضگی بھانپ کر پینترا بدلا۔

"لاؤ دو۔" آصفہ نے بے دلی سے سیل فون لیا اور مراد کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ وہ خود گھبرا رہی تھی کیوں کہ اس کے اکلوتے بھائی مراد کا ریکارڈ اچھا نہیں تھا اس کے بارے میں اطلاعات تھیں کہ اس کے دو تین لڑکیوں سے معاشقے چل رہے ہیں اور یہ بھی کہ اسے ایسی جگہوں پر آتے جاتے دیکھا گیا ہے جہاں سے شریف لوگوں کا گزر نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود اسے اپنے بھائی پر اعتماد تھا۔ وہی اعتماد اس کا حوصلہ بڑھا رہا تھا کہ اس کا بھائی اس کی دوست کو بھی اپنی بہن ہی سمجھے گا۔ کئی رنگز کے بعد مراد نے فون اٹھایا۔

"بھائی! میں آصفہ بول رہی ہوں، مجھے اپنی ایک دوست کے لیے ملازمت تلاش کرنی ہے۔" اس نے تیزی سے بات مکمل کی۔

"وہ کمپیوٹر کا کام جانتی ہے؟" مراد نے پوچھا۔

"جی ہاں بھائی! میں نے اور اس نے اکٹھے کورس کیا تھا۔ کمپیوٹر کے متعلق وہ مجھ سے بہتر جانتی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"میرا ایک دوست شیراز اپنے ہوٹل کے لیے ایک ریسپشنسٹ ڈھونڈ رہا ہے اگر تمہاری دوست کو اعتراض نہیں ہے تو وہ یہ ملازمت کر سکتی ہے۔" مراد نے بتایا۔

"جی بھائی! ابھی پوچھ کر بتاتی ہوں اور پلیز آپ اس کا یہ نمبر ڈیلیٹ کر دیجیے گا، وہ اس معاملے میں کسی پر اعتبار نہیں کرتی۔" آصفہ نے کہا۔

"یار! وہ میری بہن ہی ہے بالکل تمہاری طرح۔" مراد نے جواب دیا اور رابطہ ختم ہو گیا۔

کچھ پس و پیش کے بعد عاشی نے ملازمت منظور کر لی۔ آصفہ نے ایک بار پھر مراد کا نمبر ڈائل کیا۔

"اپنی دوست اور میری بہن سے کہنا ہوٹل شیراز میں کل صبح نو بجے پہنچ جائیں۔ بڑی بڑی تعلیمی اسناد ساتھ لانے کی ضرورت نہیں ہے بس اپنے کمپیوٹر کورس کی سند لے آئیں کیونکہ ریسپشنسٹ کے لیے یہ ضروری ہے۔" مراد کی طرف سے جواب ملا۔

"میں ضرور جاؤں گی۔" عاشی نے رابطہ ختم ہوتے ہی آصفہ سے کہا۔

"ہاں آخر بھائی کا ملازمت، دفتر کام آ ہی گیا۔" آصفہ نے سوچا۔

مراد معاوضے لے کر لوگوں کو کام دلواتا تھا۔ اس نے باقاعدہ آفس بنا رکھا تھا۔ صبح کے معمولات میں ذرا سی تبدیلی آئی تھی، آج عاشی بھی جلدی بے دار ہو گئی تھی، اس کے ملازمت کرنے کے فیصلے پر سب کو خوش گوار حیرت ہوئی تھی، سلطانہ بیگم نے کئی بار اس کا صدقہ اتارا۔

"بیٹی! دل پریشان سا ہے۔" انہوں نے ایک بار دبے لفظوں میں کہا لیکن بیٹی کی خوشی دیکھ کر پریشانی دب گئی۔ نو بجنے والے تھے۔ وہ جلدی سے تیار ہو کر گھر سے نکل گئی۔ گھبراہٹ ہو رہی تھی، کیا نام تھا ہوٹل کا "شیراز ہوٹل" اس نے دل میں بار بار سوچا۔ نو بجنے میں چند منٹ باقی تھے جب وہ ہوٹل کے ریسپشن پر پہنچ گئی۔

"مجھے شیراز صاحب سے ملنا ہے۔" الفاظ حلق سے جیسے پھنس پھنس کر نکلے۔ ریسپشن پر کھڑی لڑکی نے غور سے اس کی عرق آلود پیشانی کو دیکھا۔

"تم ایسی لگتی تو نہیں ہو۔" اس نے کہا۔ اس کے یہ الفاظ بے ساختہ تھے۔

"مہرین اپنے کام سے کام رکھو۔ شیراز صاحب اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔" ریسپشن پر بیٹھے کیشیئر نے اسے جیسے نظروں سے نوچ ڈالا۔

"وہ ایک کسٹمر کی شکایت پر تیسرے فلور پر گئے ہیں۔ آپ وہاں چلی جائیں، شاید کمرہ نمبر ۳۱۴ ہے۔" لڑکی نے اس سے کہا۔

تیسرا فلور کمرہ نمبر ۳۱۴ اس نے سوچا اور بے اختیار اس کے قدم لفٹ کی طرف اٹھ گئے۔ وہ ڈری ہوئی تھی، سہمی ہوئی تھی، گھبرائی ہوئی تھی ایک سیکنڈ کے لیے بھی نہ سوچ سکی کہ انٹرویو بند کمروں میں نہیں ہوتے لیکن قدم تو اٹھ چکے تھے۔ ہوٹل میں رہنے والے مسافروں کا بھی پتا نہیں چلتا کہ وہ کمرے آباد ہیں یا خالی۔ اس نے ہر کمرے کو دیکھ کر خود کو دلاسہ دیا کہ اس کے اندر کوئی نہ کوئی نفس ضرور ہے۔ کمرہ نمبر تین سو چودہ قریب آ رہا تھا۔ آخر وہ پہنچ گئی۔ ڈرتے ڈرتے اس نے دستک دی۔

"دروازہ کھلا ہے۔" اندر سے ایک آواز ابھری۔ لہجے سے ہی وہ قصائی لگ رہا تھا، ڈرتے ڈرتے اس نے دروازہ کھولا، وہ شخص ہرگز آصفہ کا بھائی نہیں تھا۔

"اندر آ جاؤ، غالباً تم ہی وہ لڑکی ہو جو انٹرویو کے لیے آئی ہو۔" اس شخص نے مہذب لہجے میں کہا آنکھوں میں شیطانیت برقرار تھی، اس کے مہذب لہجے نے اسے کچھ حوصلہ دیا اور وہ دروازے سے کئی قدم اندر چلی آئی۔ "بیٹھو!" اس نے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، چہرے پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"شکریہ سر!" وہ یہ کہہ کر اس کے مقابل بیٹھ گئی، گھبراہٹ بڑھ گئی۔ وہ بھیڑیوں کے جھنڈ میں گھری ہرنی کی طرح خوف زدہ تھی اور بھیڑیا نوچتا ہے، اسے بھوک کم اور ہوس زیادہ ہوتی ہے۔ وہ چلا رہی تھی، گریہ کر رہی تھی مگر سب انسان جیسے سو گئے تھے، وہ لٹ رہی تھی اور لٹ چکی تھی۔ وہ شیطان کمرے سے جا چکا تھا۔ وہ سسکیاں بھر رہی تھی اپنے لہولہو بدن کو دیکھ رہی تھی، لباس بھی ایسا رہ گیا تھا کہ نہیں تھا اور عزت بھی نہیں رہی تھی، اس نے اپنے مسلے اور پھٹے لباس کو اٹھایا اور واش روم کی طرف بڑھ گئی، بار بار بدن کو دھونے کے بعد بھی گندگی کا احساس نہیں دھلا لیکن حواس بیدار ہو چکے تھے، وہ سوچ رہی تھی، سمجھ رہی تھی اور کوئی فیصلہ کر رہی تھی۔ اسے ماں کی باتیں یاد آ رہی تھیں کہ کسی پر بھروسہ نہ کرو اور خود کو کمزور نہ سمجھو۔ اسے اب مضبوطی کا مظاہرہ کرنا تھا، وہ جلدی سے باہر نکلی حالت خستہ تھی لیکن کوئی شناسا نہیں ملا۔ اس کا رخ ایک پرائیویٹ میٹرنٹی ہوم کی طرف تھا جہاں بن بیاہی مائیں اپنے گناہ دھلوانے کے لیے آتی تھیں، وہ ابھی سے اس غلاظت کو ختم کر دینا چاہتی تھی جو چند ماہ بعد اس کے وجود میں ظاہر ہونے والی تھی، ایک خطیر معاوضے کے عوض اسے لباس بھی مل گیا اور ضروری

کرن خان ..... کراچی

جس بستی میں ہم رہتے ہیں پتھر گیت سناتے ہیں
اتنی سرد ہوا ہے باہر، آنسو بھی جم جاتے ہیں

عرفانہ محبوب ..... جتوئی

مزا برسات کا چاہو تو ان آنکھوں میں آ بیٹھو
وہ برسوں میں کبھی برسے، یہ برسوں سے برستی ہیں

عینا اورکزئی ..... ہنگو

ہم تو مر جائیں گے اے ارض وطن، پھر بھی تجھے
زندہ رہنا ہے قیامت کی سحر ہونے تک

صدف ہاشمی ..... جھنگ صدر

شکست کھا کے بھی میں سرخرو سا لگتا ہوں
کہ دوستی کا مزا دشمنوں کی چال میں تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹریٹمنٹ بھی۔ ہر چیز جیسے پہلے سے طے شدہ تھی چند ماہ پہلے وہ یہاں موبل کو لے کر آئی تھی' وہ حرافہ اکثر یہاں آیا کرتی تھی اور یہاں آنا اس کی مجبوری تھی۔

شام ڈھلے وہ واپس آئی تو بہت تھکی ہوئی تھی۔ کچھ کما کے تھک جاتے ہیں کچھ گنوا کے تھک جاتے ہیں' اس نے فوراً آصفہ کا سیل فون نمبر ڈائل کیا۔ گھر آتے ہی یہ اس کا پہلا کام تھا۔

''آج کا دن کیسا رہا جانی!'' آصفہ نے خوش دلی سے پوچھا۔

''بہت اچھا!'' کہتے ہوئے لہجے میں تلخی گھل گئی اور کئی آنسو گالوں پر لڑھک آئے۔

''مراد بھائی نے تعاون کیا نا!'' آصفہ پوچھ رہی تھی۔

''بھی کچھ ان کے تعاون سے ہی ہوا۔'' عاشی کی آواز رندھ گئی لیکن اس نے سیل فون فوراً دور ہٹا لیا۔ آنسو صاف کر لیے۔ ''یار! میں آج اکیلی بور ہوگئی ہوں۔ تم کیوں نہیں آجاتیں' ایک اور جگہ خالی ہے۔'' اس نے کہا۔

''بھائی اجازت نہیں دے رہے' میں نے پہلے بھی ایک بار بات کی تھی۔'' آصفہ کا جواب تھا۔

''کل تم کسی سے کوئی بات نہ کرنا بس اپنی کمپیوٹر کورس کی سند لے کر شیراز ہوٹل جانا' کاؤنٹر پر اگر میں موجود نہ بھی ہوئی تو کہہ دینا شیراز صاحب سے ملنا ہے' ملازمت کے سلسلے میں اور میں تمہاری نہ نہیں سنوں گی۔'' عاشی نے کہہ کر رابطہ ختم کر دیا۔

یہ صبح بھی قیامت خیز تھی نو بجنے میں چند منٹ باقی تھے جب آصفہ شیراز ہوٹل کے کاؤنٹر پر پہنچ گئی۔ پہلی ملازمت اور پہلے انٹرویو کے تصور سے پیشانی عرق آلود تھی۔

''مجھے ملازمت کے سلسلے میں شیراز صاحب سے ملنا ہے' اس نے کہا۔ آج بھی ریسیپشن پر مہرین ہی تھی' اس نے دکھ سے آصفہ کو دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہ بولی شاید کل اس کو شیراز کے بارے میں کوئی بھی بات کرنے سے منع کیا گیا تھا۔

''ایک کسٹمر کی شکایت پر وہ تیسرے فلور پر گئے ہیں آپ ان سے وہاں مل لیں۔'' مہرین نے رٹی رٹائی کہانی دہرائی۔

''جی شکریہ!'' اس نے کہا۔ ''اوپر کہاں؟'' اس نے استفسار بھی کیا۔

''کمرہ نمبر تین سو چودہ!'' مہرین نے بتایا۔

وہ شکریہ ادا کر کے لفٹ کی طرف بڑھ گئی۔ تیسرا فلور کمرہ نمبر ۳۱۴ اس نے دل میں سوچا۔ تیسرا فلور سنسان تھا مگر وہ خود کو حوصلہ دے رہی تھی کہ کمروں کے اندر مسافر ضرور ہوں گے اس نے کمرہ نمبر تین سو چودہ پر دستک دی۔

''دروازہ کھلا ہے' اندر آجاؤ۔'' اندر سے ایک آواز ابھری۔ لہجہ کسی قصائی جیسا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ وہ اندر اکیلا تھا آنکھوں سے شیطانیت ٹپک رہی تھی۔ ''آیئے اندر آجایئے' آپ انٹرویو کے لیے آئی ہیں نا!'' اس نے آصفہ کو دروازے میں رکتے دیکھ کر کہا' لہجہ مہذب تھا لیکن آنکھوں کی شیطانی چمک بڑھ گئی تھی۔

''جی سر!'' وہ تھوک نگلتے اندر چلی آئی۔ ایک دن پہلے وہاں اس کی سہیلی بھی آئی تھی اور جو اسے مل رہا تھا وہی اسے مل رہا تھا۔ اس کی چیخ و پکار پر بھی کوئی نہیں آرہا تھا' وہاں کوئی انسان موجود نہیں تھا جو موجود تھا وہ انسان کے روپ میں شیطان تھا۔ بنتِ حوا لٹ رہی تھی اور وہ لوٹ رہا تھا۔ چیخ و پکار کا طوفان تھم گیا' سب کوششیں بے سود ہوگئیں' وہ جا چکا تھا اور جاتے ہوئے اس کا سب کچھ لے گیا تھا۔

عاشی آج بھی شیراز ہوٹل آئی تھی لیکن آج اس نے خود کو سیاہ چادر سے چھپا رکھا تھا اس کی نظریں مسلسل تیسرے فلور کی طرف تھیں' جیسے ہی اسے وہ شخص نظر آیا اس نے اپنے سیل فون سے مراد کا نمبر ڈائل کیا وہ دو دن سے ابھی تک اس کے سیل فون میں محفوظ تھا۔ وہ شخص خاصی جلدی میں تھا اس کے چہرے پر خباثت کی گہری چھاپ بتا رہی تھی کہ طوفان گزر چکا ہے۔

''جی کون؟'' مراد کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''میں عاشی بول رہی ہوں آصفہ کی سہیلی! آپ کے دوست شیراز نے میرے ساتھ.....'' اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر رونا شروع کر دیا۔

''کیا ہوا؟ میں ابھی وہاں آرہا ہوں۔'' مراد نے کہا' لہجہ کھوکھلا اور مصنوعی تھا۔

''آپ جلدی آجایئے بھائی! میں پاپا کو بتاتی ہوں اور میرے لیے کچھ کپڑے.....'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔ ہچکیاں اور آنسو بڑھ گئے۔

''انکل کو فون مت کرنا' میں آرہا ہوں چند منٹ انتظار کرو۔'' مراد گھبرا گیا شاید آج سے پہلے کسی لڑکی نے یہ بات اپنے والدین یا پولیس کو بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا کہ انہیں ملازمت کے نام پر لوٹ لیا گیا ہے' کون اپنی بے آبروئی کی کہانی کسی کو بتائے گی ہر لڑکی خاموشی سے واپس چلی جاتی تھی' صرف چند لوگ جانتے تھے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا دنیا بھر کے لیے وہ اسی طرح معزز اور عزت دار رہتی تھی۔ واقعی مراد نے پہنچنے میں دیر نہیں کی تھی' وہ چند منٹ میں ہی آپہنچا تھا۔ اب عاشی کے لیے یہ جاننا ضروری نہیں تھا کہ اس پر کیا گزری۔

وہ خاصی عجلت میں تھا اور واقعی تیزی سے تیسرے فلور پر پہنچ گیا۔ کمرہ نمبر تین سو چودہ آدھا کھلا نظر آرہا تھا۔

''میری پیاری منہ بولی بہن عاشی!'' مراد بڑبڑایا' چہرے پر خباثت ابھر آئی لیکن اگلے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا۔ جونہی اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اس کے ہاتھ سے پلاسٹک بیگ گر گیا۔ وہ اس میں عاشی کے لیے تن ڈھانپنے کو کچھ کپڑے لایا تھا۔ آج سے پہلے بھی ملازمت کے لیے آنے والی اور خاموشی سے لٹ کر جانے والی ہر لڑکی کے لیے وہ اسی طرح کپڑے لایا کرتا تھا۔ آصفہ نے اپنے آپ کو بستر کی چادر میں چھپا رکھا تھا۔ اس کی بکھری حالت اور جابجا بکھری لباس کی دھجیاں ساری کہانی سنا رہی تھیں۔

''تت..... تت..... تم..... آآآ ص.....

آصفہ! مراد کے منہ سے بمشکل نکلا۔ آصفہ بھی خود کو سنبھال چکی تھی۔

''جی بھائی میں.....'' اس نے تحمل سے کہا اور بھائی کے پیروں میں پڑا پلاسٹک بیگ اٹھا لیا' جس میں کپڑے تھے۔

''مگر یہاں عاشی آنے والی تھی۔'' مراد چیخا۔

''وہ کل یہاں آچکی ہے بھائی! اور اسی نے کہا تھا کہ آج میں بھی انٹرویو دینے آؤں۔'' آصفہ نے کہا اور روتی ہوئی باتھ روم میں گھس گئی باہر مراد بے دم سا ہو کر زمین پر گر گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

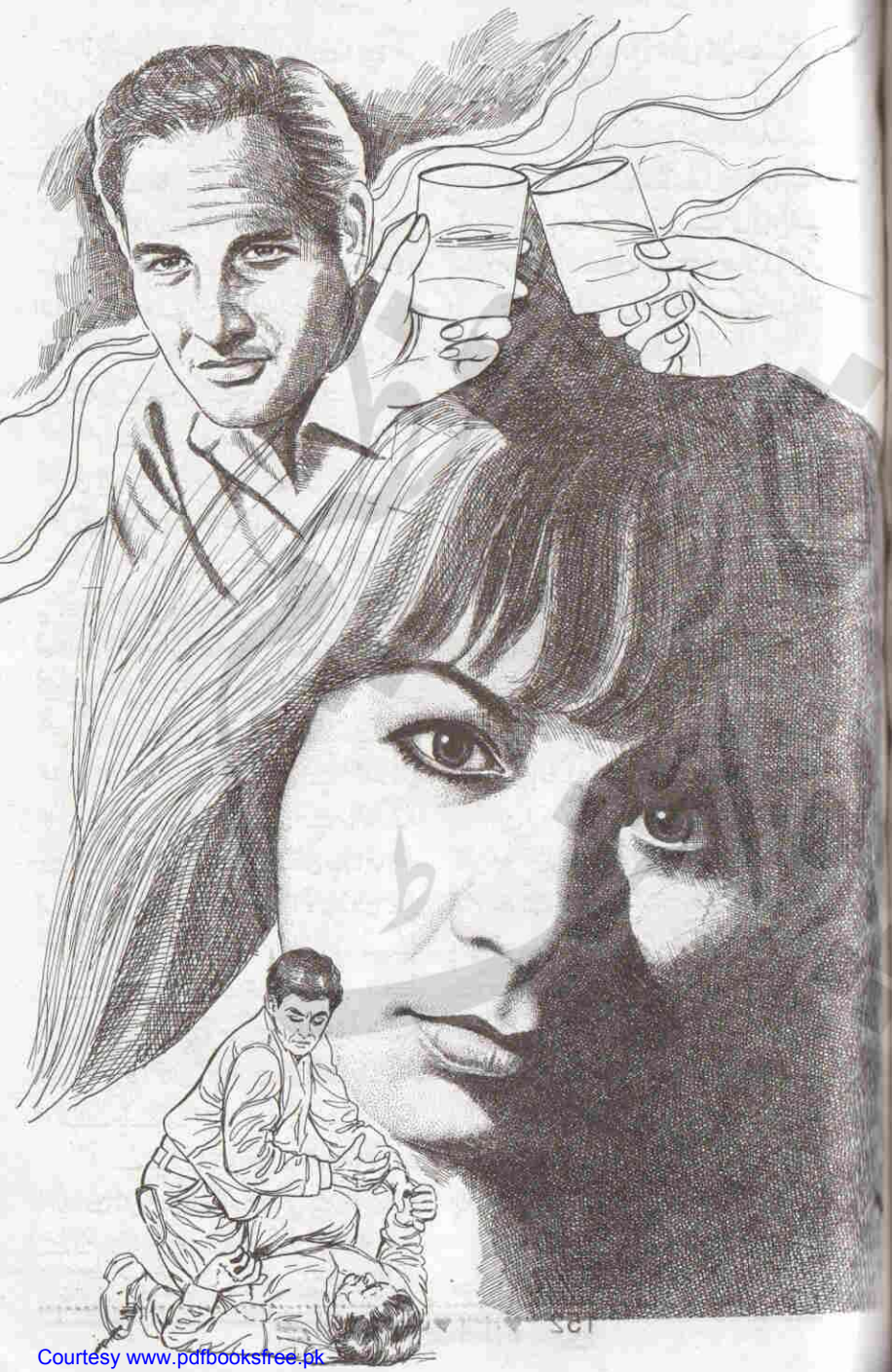

قسط نمبر 5

گردش

شہناز بانو

دنیا میں فساد کا محرک زن' زر' زمین رہی ہے۔ دنیا کا پہلا قتل بھی عورت ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ یہ نیا سلسلہ وار ناول ہمارے موجودہ دور کی کہانی ہے۔ اس کے بیش تر کردار ابھی تک بقید حیات ہیں۔ کچھ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرچکے ہیں۔ جب کہ بعض کے دامن میں صرف پچھتاوے باقی رہ گئے ہیں اور وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ وقت کی گرد نے ان کی شناخت تک گم کردی ہے۔

محبت کی روایتی تکون سے شروع ہونے والی یہ خونی داستان جوں جوں آگے بڑھتی ہے کہانی سے جڑے کرداروں کو کسی عفریت کی طرح نگلتی جاتی ہے۔ اس میں کرپٹ سیاست دانوں کی نقاب کشائی نہایت مہارت کے ساتھ کی گئی ہے کہ کیسے وہ وطن عزیز کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے ساتھ ساتھ عوام کہلانے والے مجبور و مقہور طبقے کے بنیادی حقوق کا استحصال کرتے چلے آرہے ہیں۔ گفتار کے یہ غازی کیسے عوام کو سبز باغ دکھا کر ان کی عزت و جان اور مال و متاع کے سودے وطن دشمنوں سے کرتے ہیں۔ اپنے مفادات کی خاطر کیسے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں۔ ان کے وعدے پانی پر کھینچی گئی لکیر کی طرح نا پائیدار ہوتے ہیں۔

اس طویل داستان میں محبت اور نفرت کے تمام رنگ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ کہیں مجبوری' بے بسی اور مفلسی کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں تو کہیں جابروں اور ظالموں کے سماعت شکن قہقہے گونجتے ہیں۔ کہیں قانون اپنے روایتی انداز میں مظلوموں کی عزت و جان سے کھیلتا نظر آتا ہے تو کہیں جابروں کی دہلیز پر ماتھا ٹیکتا دکھائی دیتا ہے۔

تحیر اور ایکشن پسند قارئین کے لئے نئے افق کی دلکش و دلچسپ سلسلے وار کہانی

نوٹ:۔ محترم قارئین کرام آپ سلسلہ وار ناول گردش کا مطالعہ کررہے ہیں۔ کچھ ناگریز وجوہات کی بناء پر یہ ناول اب میں یعنی شہناز بانو تحریر کروں گی۔ ناول میں اپنے انداز اور خیالات سے لکھ رہی ہوں۔ اس لیے گزارش ہے کہ گزشتہ تین اقساط کو بھلا کر نئے سرے سے اس ناول کا مطالعہ جائے تاکہ بوقت مطالعہ آپ کو کسی بھی قسم کی الجھن نہ ہو۔ مجھے امید ہے کہ گزشتہ ناول ''زنجیر'' کی طرح یہ ناول بھی آپ سب کو پسند آئے گی۔ شکریہ

یکایک مجھے اپنے اوپر مینا کی مہربانیاں کھلنے لگیں۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہورہے ہیں۔ بھئی اگر میری ذات انہیں شک وشبے سے بالاتر لگی ہے تو مجھے آزاد کردیں اور جانے دیں' جہاں بھی جاؤں یہ میری مرضی ہے لیکن اس ٹھکانے سے جہاں انہوں نے مجھے قید کررکھا تھا میری آنکھوں پٹی باندھ کر پر لائے تھے میں اس جگہ کو پہچان نہ سکوں لیکن اپنے اس دوسرے ٹھکانے پر مجھے آنکھوں سے پٹی کھول کر لے آئے مجھے غسل کرا کے صاف ستھرا لباس پہننے کے لیے دیا' کھانا کھلایا اور اب جابر مجھ سے کچھ باتیں کرنے والا ہے۔ آخر وہ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتا ہے۔ میں شش و پنج کی کیفیت میں مینا کے ساتھ ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا اور مجھے دیکھتے ہی اس نے ایسی بات کہی کہ میں کھڑے کھڑے پسینے میں نہا گیا اور لمحہ بھر میں ہی مجھے بڑے عجیب عجیب سے خیالات آنے لگے۔ اس نے مجھے تیز نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تو تم سردار شیر افضل خان سے اپنے گھر والوں کی موت کا انتقام لینا چاہتے ہو۔" اس کے لہجے میں نہ جانے ایسا کیا تھا کہ میں فوری طور پر کوئی جواب نہ دے سکا۔

"گھبرا کیوں گئے' آؤ بیٹھو!" میرے چہرے پر سراسیمگی کی کیفیت سے اس نے میری گھبراہٹ کا اندازہ کرتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو میں اس کے نزدیک ہی صوفے پر بیٹھ گیا مینا بھی میرے قریب بیٹھ گئی۔ تب جابر خان بولا۔

"ہم نے تمہارے بارے میں ساری معلومات کروالی ہیں۔ تم نے اپنے بارے میں ساری باتیں بالکل سچ بتائی تھیں۔ مگر تم ایک بات بتانا بھول گئے۔"

"وہ کیا؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ اسے میری اور مہوش کی محبت اور تعلقات کا علم ہوگیا ہے اور یہی بات میں نے اسے نہیں بتائی تھی۔ یہ بات اسے بتانی ضروری بھی نہیں تھی۔ مہوش کو میں اس وقت تک کے لیے بالکل بھول جانا چاہتا تھا جب تک میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوجاتا اور ویسے بھی اپنے ساتھ رکھ کر مجھے اسے مشکلات سے دوچار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اگر اسے میری موت کا علم ہوجائے گا تو چند دن میری موت کا سوگ منائے گی اور پھر اپنے باپ کے کہنے پر اپنے جیسے کسی انسان سے شادی کرکے گھر بسالے گی۔ جو اسے ایک پُرآسائش زندگی مہیا کردے گا' میرے صبر کا امتحان ختم ہونے میں تو نہ جانے کتنا عرصہ لگ جائے گا۔

"تم نے یہ نہیں بتایا تھا کہ انسپکٹر خالق نے اخبارات میں تمہارے بارے میں یہ خبر شائع کرائی ہے کہ تم نے اپنے بوڑھے باپ کو قتل کرڈالا اور جوان بہن کو بھی کسی کے ساتھ بدکاری کے شبے میں قتل کر ڈالا اور اب پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔" جابر خان نے کہا۔

"اچھا.....!" میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بات تمہیں نہ بتانے کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی ہو' اپنے آپ کو مردہ ظاہر کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ پولیس بھی یہ سوچ کر میری تلاش ختم کرکے کیس کو دفتر فائل کردے کہ مشتبہ ملزم مرچکا ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے' میں نے تمہارے بارے میں "باس" کو بتایا تھا۔ تو انہوں نے یہی کہا ہے کہ وہ خود تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ کراچی پہنچ چکے ہیں اور ہمیں ان سے ملنے کے لیے کراچی جانا ہوگا۔" جابر نے کہا۔

"جو تم مناسب سمجھو' مجھے باس سے ملنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔" میں نے آمادگی ظاہر کی۔

"ارے ہاں ایک بات کی معذرت کرنا تو میں بھول گیا۔" جابر نے اچانک کچھ یاد آجانے پر کہا۔

"کس بات کی معذرت؟" میں نے پوچھا۔

"یہی کہ ہم لوگوں نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا' تمہیں مارا پیٹا بھی اور قید میں بھی رکھا لیکن یار تم سمجھ سکتے ہو کہ ایسا کرنا ضروری تھا۔ تمہارے پاس ہمارے ایک ساتھی کا پرس ملا اور پھر وہ بھی غائب ہے تو ہمارے لیے تو تم مشتبہ ہی تھے۔"

"نہیں جابر اس میں معذرت کرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم نے وہی کچھ کیا جو ان حالات میں تمہیں کرنا چاہیے تھا لیکن یہ اچھی بات ہے کہ تم نے میرے بارے میں ساری تحقیقات کرلیں اب تم مجھ پر اور میں تم پر بھروسا کرسکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے صبح ہونے میں تھوڑی دیر ہی باقی ہے اب ہمیں آرام کرنا چاہیے۔ تاکہ فریش ہوکر ہم

کراچی کے لیے روانہ ہوسکیں۔" مینا نے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے شاہ زمان تمہیں مینا تمہارا کمرہ دکھادے گی۔ بہتر یہی ہے کہ تم بھی تھوڑی نیند لے لو۔" جابر خان نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں جابر۔" میں نے بھی کھڑے ہوکے کہا۔

"ہاں بولو!" جابر خان نے اپنی سرخ سرخ آنکھیں میرے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا' اس شخص جابر خان کے چہرے پر بے پناہ سختی تھی وہ ایک عام بات بھی کرتا تھا تو اس کا چہرہ تناؤ کا شکار ہوجاتا تھا۔ میری بات سن کر بھی لمحہ بھر کو اس کا چہرہ تن سا گیا۔

"اب جب کہ میں نے دنیا کو یہ دھوکا دے ہی دیا ہے کہ میں مرچکا ہوں تو میرا نام بھی تبدیل ہوجانا چاہیے۔ میں مرگیا تو یہ نام بھی مرجانا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو' تم ہی بتاؤ کہ تمہارا نیا نام کیا ہونا چاہیے۔" جابر خان نے دلچسپی سے کہا۔

"میرے خیال میں تمہاری پرسنالٹی پر شمروز خان سوٹ کرے گا۔" مینا نے کہا اور میری جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو' تمہارا کیا خیال ہے۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے ہامی بھری۔ "ایک بات بتاؤں' میرے دادا کا نام شمروز خان تھا۔"

"واہ! کیا بات ہے' زندہ پوتا مردہ ہوگیا اور مردہ دادا زندہ ہوگیا۔" جابر نے قہقہہ لگایا اور میں اسے ہنستے ہوئے دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا؟" مجھے اس طرح دیکھتے ہوئے پاکر جابر خان نے پوچھا۔

"میں نے تمہیں پہلی بار ہنستے ہوئے دیکھا ہے' اچھے لگ رہے ہو' کبھی کبھی یوں ہی ہنس لیا کرو۔" میں نے کہا۔

"ہماری لائف بھی کیا ہے یہاں ہنسنے اور انجوائے کرنے کے مواقع کم ہی ملتے ہیں روزانہ ہر وقت ایک نئی ٹینشن ہماری منتظر رہتی ہے۔" جابر خان نے سنجیدگی سے کہا پھر بولا۔

"ارے ہاں میں ایک بڑی اہم بات بتانا بھول ہی گیا اور وہ یہ کہ میں نے روہڑی میں موجود اپنے ایک ساتھی سے کہا تھا کہ وہ اسپتال کے مردہ خانے میں ڈاکٹر شاہ زمان کی لاش کو دیکھے اور اس کے چہرے میں سلطان کا عکس تلاش کرے اگر وہ سلطان ہی ہو تو ہمیں بتائے اور یہ بھی دیکھے کہ لاش وصول کرنے کے لیے کوئی آیا ہے یا نہیں۔ میرا ساتھی یہ وہی تھا جس کے ساتھ تم کار میں سوار ہوئے تھے۔ دلشاد نام ہے اس کا' اس نے بتایا کہ جب وہ اسپتال پہنچا تو اسے پتا چلا کہ ڈاکٹر شاہ زمان کی ڈیڈ باڈی ایک شخص وصول کرکے اپنے ساتھ لے گیا ہے' اس کا نام ذوالفقار تھا۔ نتھیا گلی سے آیا تھا اور اپنے آپ کو ڈاکٹر کا دوست بتا رہا تھا۔ اس لیے وہ سلطان کی لاش کو نہیں دیکھ سکا۔ یہ بتاؤ کہ نتھیا گلی میں تمہارا کوئی ذوالفقار نامی دوست رہتا ہے کیا؟"

"اچھا تو گولی استاد اس لاش کو وصول کرکے لے گیا۔ گولی استاد کا اصل نام ذوالفقار ہی ہے۔ بہت ہی اچھا انسان ہے۔ اس نے اس برے وقت میں میری بڑی مدد کی ہے' زندگی نے کبھی موقع دیا تو میں اس کا یہ احسان اتارنے کی ضرور کوشش کروں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"اب تمہارا کیا ارادہ ہے تم اپنے دوست کی یہ غلط فہمی دور کرو گے یا نہیں کہ تم مرے نہیں بلکہ زندہ ہو۔" جابر خان نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اگر میں سیدھا کراچی پہنچ جاتا تو ضرور گولی استاد کو اپنے زندہ ہونے کی خبر دیتا مگر اب جب کہ مجھے تم لوگوں کا ساتھ مل گیا ہے تو میں اس سے کوئی رابطہ نہیں کروں گا۔" میں نے صاف صاف جواب دیا۔

"تم نے بڑی عقل مندی کی بات کی ہے فی الحال کسی کو بھی اپنے بارے میں کوئی اطلاع دینے کی ضرورت نہیں ہے، ہم تمہارا حلیہ بھی بدل دیں گے۔ نئے نام کے ساتھ تم ایک نئی شناخت کے ساتھ زندگی گزارو گے اور اپنے دشمنوں سے بھی انتقام لے سکو گے۔" جابر خان نے توصیفی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور قدرے نرم لہجے میں کہا۔

"بھئی مجھے تو بڑے زور کی نیند آ رہی ہے اب سونے کی کرو باقی باتیں صبح کر لینا۔" مینا نے ایک زور دار انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں چلو.....!" یہ کہہ کر جابر خان کسی اور کمرے کی جانب چلا گیا اور مینا مجھے اپنے ساتھ اس بیڈ روم میں لے آئی جہاں واش روم میں میں نے غسل کیا تھا۔

وہ دھپ سے بیڈ پر بیٹھی اور بیڈ پر ہاتھ مار کر بولی۔

"آؤ لیٹ جاؤ۔"

"میں یہاں لیٹوں گا اور تم.....؟" میں نے چونک کر کہا۔

"اگر تم کہو تو میں بھی یہیں لیٹ جاؤں۔" اس نے شوخی سے کہا۔

"سوری مینا، مجھے تنہا سونے کی عادت ہے۔" میں نے خاصے خشک لہجے میں کہا۔

"بڑے پارسا ہو۔" اس نے ترچھی نگاہیں کر کے کہا۔

"جو تم سمجھو میں ابھی تک کسی بھی عورت کی تاریخ و جغرافیہ سے ناواقف ہوں۔" میں نے سابقہ لہجے میں کہا۔

"ارے بابا مذاق کر رہی تھی ویسے تم ہو بہت زبردست، دل تو یہی چاہ رہا ہے کہ تمہارے ساتھ ہی سو جاؤں مگر جابر خان کی موجودگی میں یہ ناممکن ہے۔ وہ مجھے جان سے مار دے گا۔" مینا نے کہا اور اٹھ کر چلی گئی جاتے جاتے وہ مجھے مڑ مڑ کر دیکھتی جا رہی تھی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے دروازہ بند کیا اور بیڈ پر ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔ بہت دنوں کے بعد فوم کے نرم گدے پر لیٹنے کا موقع ملا تھا ورنہ میں تو کب سے اپنے فلیٹ سے نکلا ہوا تھا۔ آج اس بیڈ پر لیٹا تو اپنے بیڈ روم کا بیڈ یاد آ گیا۔

شمروز خان.....! میں نے یہ نام زیر لب دہرایا۔ آج سے میں ڈاکٹر شاہ زمان نہیں شمروز خان ہوں۔ اب دنیا مجھے اس نام سے پکارے گی پہچانے گی۔ میں نے معزز پیشہ اختیار کیا تھا انسانیت کی خدمت کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا مگر اب میں جرائم پیشہ لوگوں کا ساتھی بن گیا ہوں۔ پتہ نہیں کتنے اور کون کون سے جرم بھی کرنے پڑیں گے۔ اب میں ایک بدمعاش بن کر زندگی گزاروں گا۔ شریف بن کر بھی دیکھ لیا۔ دنیا شرافت کو بزدلی سمجھتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ ہمارے معاشرے میں انصاف نہیں ہے جو انصاف مانگتا ہے اسے کبھی بھی انصاف نہیں ملتا یہاں حق و انصاف صرف چھیننے سے ملتا ہے۔ میں نے بھی کشکول توڑ ڈالا تھا۔ اب میرے ہاتھ میں بارود ہوگا جو بھی میری راہ میں آئے گا میں اسے اپنے قدموں تلے روند ڈالوں گا۔ رحم کس چڑیا کا نام ہے میں اپنی لغت سے اس نام ہی کو مٹا ڈالوں گا۔ اب لوگ مجھے ایک وحشی درندہ کہیں گے۔ میں لیٹا لیٹا یہ باتیں سوچ رہا تھا۔ اور میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میری

رگ رگ میں لہو نہیں آگ بھری ہوئی ہے۔ میرے سر کی رگیں تن گئیں، کنپٹیوں میں درد ہونے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا بلڈ پریشر بڑھ رہا ہے۔

مجھے اپنے آپ کو نارمل کرنے کی ضرورت تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہا۔

"تم حقیقت میں شمروز نہیں ڈاکٹر شاہ زمان ہو، کول ہو جاؤ شاہ زمان، دماغ ٹھنڈا رہے تو عقل بھی باقی رہتی ہے میں نے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر دیکھا پانی کی بوتل اور گلاس رکھا تھا۔ میں نے ایک گلاس پانی نکال کر گھونٹ گھونٹ کر کے پیا تو تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے۔ پھر ان باتوں سے اپنا دھیان ہٹانے کے لیے میں مینا کے بارے میں سوچنے لگا۔ مینا اندازاً تیس سال کی ایک لڑکی نما عورت تھی۔ اس کا جسم بھرا بھرا اور جنس مخالف کے لیے باعث کشش تھا۔ ہونٹ بھی بھرے بھرے گداز تھے۔ ستواں ناک اور موٹی موٹی سیاہ آنکھیں تھیں۔ رنگت گندمی تھی اور بال شولڈر کٹ تھے۔

اسپتال میں، میں نے اسے نرس کے سفید لباس میں دیکھا تھا۔ تو کیا وہ پیشے کے لحاظ سے ایک نرس ہے اور روہڑی کے اسپتال میں جاب کرتی ہے یا کوئی اور چکر تھا۔ وہ جرائم پیشہ گروہ سے تعلق رکھتی ہے خاصی بے باک ہے میرے ساتھ فری ہونے میں اس نے زیادہ دیر نہیں لگائی۔ جابر خان نے اس کے تعلقات کس حد تک اور کس نوعیت کے ہیں یہ بات رفتہ رفتہ پتہ چل جائے گی۔ میں ان لوگوں کا اعتماد حاصل کر کے ان کے ساتھ رہوں گا تو ہر بات کا علم ہو ہی جائے گا۔ ساری الجھنیں سلجھ جائیں گی ساری گرہیں بھی کھل جائیں گی مگر مینا کے پرکشش شباب کو دیکھ کر بھی میرے دل میں کوئی جذبہ نہیں جاگا نہ میرے جوان جسم نے مجھے کوئی سگنل دیا۔ مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرا دل غم واندوہ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایسی ہی باتیں سوچتے سوچتے میں کب نیند کی وادی میں اتر گیا مجھے پتا نہیں چلا۔

اگلے روز دن گیارہ بجے کے قریب میں سو رہا تھا تب مجھے اپنے سینے پر کسی کی انگلیوں کی سرسراہٹ محسوس ہوئی میرا ہاتھ بے ساختہ تیزی کے ساتھ سینے پر آیا اور میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس چیز کو جھٹک دیا مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی سانپ یہاں سرسرا رہا ہے اور میں تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گیا تب میری نگاہ مینا پر پڑی وہ میرے بیڈ پر بیٹھی تھی اور حیرت اور غصے بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

مینا کو یہاں دیکھ کر لمحہ بھر کو جو سانپ کی دہشت میرے دل میں آئی تھی وہ نکل گئی اور میں نے اطمینان کی سانس لی اور کہا۔ "اوہ! یہ تم تھیں۔"

"یہ کیا بدتمیزی تھی بالکل ہی اجڈ ہو تم۔" اس نے ناگواری سے کہا۔

"اس میں اجڈ پنے کی کیا بات ہے، میں سمجھا کہ کوئی سانپ میرے اوپر آ گیا ہے۔ عجیب سی کیفیت ہو گئی تھی۔ سوتے میں شاید میں نے کوئی خواب دیکھا تھا۔" میں نے اس کا غصہ دور کرنے کے لیے کہا۔

"میں تمہیں جگانے کے لیے آئی تھی ہمیں بارہ بجے تک یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ باس سے ہمیں ساڑھے پانچ بجے ملنا ہے۔ انہوں نے یہی وقت دیا ہے باس وقت کی سختی سے پابندی کرتے ہیں اور اگر کوئی دوسرا پابندی نہ کرے تو وہ اسے سزا دیتے ہیں۔" مینا نے میری بات کے جواب میں کہا۔

"تمہارے باس آخر ہیں کون؟" میں نے پوچھا۔

"ملو گے تو خود ہی دیکھ لینا۔ ویسے تم لکی ہو کہ اتنی جلدی اور فوری تمہیں باس سے ملاقات کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ ورنہ تو لوگ ترستے ہی رہتے ہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میری خود کافی عرصہ کے بعد باس سے ملاقات ہوئی تھی۔'' مینا نے بیڈ سے کھڑے ہو کر کہا پھر روم سے جاتے ہوئے بولی۔

''تمہارے کپڑے دھلوا کر استری کروا دیتے ہیں فی الحال تو تمہیں انہیں ہی پہننا ہوگا۔ ہم کراچی تو جا رہے ہیں۔ وہیں سے تمہارے لیے نئے ڈریسز کی شاپنگ بھی کریں گے۔''

''شاپنگ.....!'' میں نے کہا۔

''فکر نہ کرو تمہارے آٹھ لاکھ روپے ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ وہ تمہیں واپس مل جائیں گے اس کے علاوہ تمہارا موبائل بھی اور ہاں اب جلدی سے فریش ہو کر آ جاؤ' ہم ناشتے کی ٹیبل پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ چھپاک سے کمرے سے نکل گئی۔

میں واش روم میں گیا تو میرے لیے ٹوتھ برش رکھا تھا۔ میرے کپڑے بھی استری کیے ہینگر میں لٹکے تھے۔

میں نے غسل کیا اور شیو بھی کر لی سارا سامان یہاں موجود تھا۔ میں اپنے آپ کو کافی تر و تازہ محسوس کر رہا تھا۔

باہر آیا تو جابر اور مینا ٹیبل پر ناشتے کے ساتھ میرے منتظر تھے۔ ناشتے کے کافی لوازمات ٹیبل پر موجود تھے۔ میں جابر کے سامنے والی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''کیوں نیند تو اچھی آئی؟'' جابر نے پوچھا۔

''ہاں! بہت دنوں کے بعد اپنے بیڈ جیسا سونے کے لیے ملا تھا۔ ورنہ فرش پر لیٹنے سے میری کمر تختہ ہو گئی تھی۔'' میں نے کہا۔

''تمہارے زخم اب کیسے ہیں؟'' مینا نے پوچھا۔

''پاؤں کی تکلیف تو خاصی کم ہے البتہ ہاتھ میں ابھی درد ہے میں کہہ رہا تھا ناں کہ زخم گہرا ہے یہاں ٹانکے لگنے چاہیں اگر ٹانکے لگ جاتے تو جلدی اچھا ہو جاتا اور پھر میڈیسن بھی نہیں لیں۔'' میں نے زخم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم ایسا کرو کہ جو میڈیسن تمہیں چاہیں وہ راستے میں لے لینا تاکہ تم جلدی صحت یاب ہو سکو۔'' جابر نے کہا۔

''ہاں میڈیسن کی ضرورت تو ہے ورنہ زخم بگڑ جائے گا بلکہ یہ بگڑ رہا ہے۔'' میں نے کہا اور چائے کا کپ اٹھا کے منہ سے لگا لیا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر ہم تینوں اس کار میں بیٹھ گئے جس میں آئے تھے۔ اس مرتبہ ڈرائیونگ سیٹ جابر نے سنبھال لی۔ میں جابر کے برابر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا اور مینا نے پچھلی نشست سنبھال لی۔

''تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے؟'' جابر نے سوال کیا۔

''ہاں آتی ہے۔ میرے پاس ایک پرانی سوزوکی کار تھی جو میں گولی استاد کو دے آیا تھا۔ شاید وہ اس کار کی رقم تھی جو زبردستی گولی استاد نے مجھے دی تھی۔'' میں نے کہا۔

''اچھی بات ہے ورنہ تمہیں ڈرائیونگ بھی سکھانی پڑتی ویسے تو تمہاری ٹھیک ٹھاک ٹریننگ ہو گی یہ بتاؤ لڑائی بھڑائی کر لیتے ہو۔'' جابر خان نے ونڈ اسکرین سے نگاہیں ہٹا کر ایک نظر میرے اوپر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''میری کس چیز کی ٹریننگ ہو گی اسلحہ چلانا میں جانتا ہوں۔ رہی لڑائی بھڑائی تو اس سے بچپن سے ہی بابا نے مجھے دور ہی رکھا ویسے وقت پڑنے پر ہاتھ پاؤں چلا سکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''خالی ہاتھ پاؤں چلانے سے کام نہیں چلتا۔ تمہیں ہر کام کی ٹریننگ حاصل کرنی ہو گی۔ میں خود بھی تمام فنون سے واقف ہوں اور تو اور ہماری مینا

سے دو دو ہاتھ کر کے دیکھو۔ منٹوں میں تمہیں زمین چٹا دے گی۔'' جابر نے گردن موڑ کر مینا کو دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا اور ساتھ ہی ایک میڈیکل اسٹور پر کار روک لی۔

میں کار سے اترا تو مینا بھی میرے ساتھ اتر آئی۔ وہ مجھ سے چپک کر چل رہی تھی۔ میڈیکل اسٹور سے میں نے اپنی مطلوبہ دوائیں لیں۔ مینا نے منرل واٹر کی بوتلیں اور کچھ بسکٹ کے پیکٹ لیے پھر سب چیزوں کے پیسے بھی اسی نے دیے کیونکہ میری جیب تو خالی تھی۔ ہم واپس کار میں آ کے بیٹھ گئے میں نے دوائیں کھائیں اور جابر سے کہا میں زخم کی پٹی کرنا چاہتا ہوں تو جابر نے کہا تم پچھلی نشست پر چلے جاؤ مینا ڈریسنگ کرنے میں تمہاری مدد کرے گی۔

میں پچھلی نشست پر آ گیا تو جابر نے دوبارہ کار اسٹارٹ کر دی میں نے مینا کی مدد سے زخم کو اچھی طرح سے صاف کیا۔ اور میڈیکل اسٹور سے لائی ہوئی دوا زخم پر لگا کے دوسری صاف پٹی باندھ لی۔

تقریباً ساڑھے تین گھنٹے کے سفر کے بعد ہم کراچی کی حدود میں داخل ہو گئے مینا اور جابر مجھے کراچی کی بلند ترین اور مشہور عمارات کے بارے میں بتاتے جا رہے تھے۔

میں کراچی میں پہلی بار آیا تھا۔ یہاں کی ہر جگہ میرے لیے بالکل ہی انجان تھی۔

''ہم کس جگہ جا رہے ہیں؟'' میں نے علاقے کا نام پوچھا۔

''کلفٹن! یہاں باس کی کوٹھی ہے۔'' جابر نے جواب دیا۔

''تمہیں پتا ہے کراچی میں سمندر بھی ہے تم نے کبھی سمندر دیکھا ہے۔'' مینا نے پوچھا۔

''نہیں! میں کبھی کراچی نہیں آیا تو دیکھتا کیسے' سوچا تھا کہ کبھی فرصت ملی تو کراچی جاؤں گا۔ شادی ہو جائے گی تو بیوی کو لے کر جاؤں گا' مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ قسمت مجھے یہاں لے کر تو آئے گی مگر حالات اتنے زیادہ مختلف ہوں گے۔'' میں نے دکھی لہجے میں کہا۔

''اب تم اداس ہونا چھوڑ دو' آگے کی سوچو ابھی تم نے بہت بڑے بڑے کام کرتے ہیں۔ اپنے دل و دماغ سے ہر دکھ' ہر غم کو مٹا ڈالو ایک مضبوط اور فولادی شہروز خان بنو۔ شہروز خان کا دوسرا نام فولاد ہونا چاہیے۔'' جابر خان نے کہا۔

''شکریہ دوست تم میری حوصلہ افزائی کر رہے ہو' تمہارا ساتھ رہا تو میں اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔ مگر ابھی دلی دور ہے۔'' میں نے ممنونیت کے گہرے جذبے کے ساتھ کہا تو مینا مسکراتی ہوئی نگاہوں سے میری جانب ایسے دیکھنے لگی جیسے کہہ رہی ہو میں تو دل و جان سے تمہاری ہوں اور ہر وقت تمہارے ساتھ ہوں۔ میں بھی جواباً مسکرانے لگا تو اس نے سیٹ پر رکھے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور دیر تک رکھے رکھا۔ میں فوری طور پر ایسی کوئی حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا کہ جابر خان ہماری جانب متوجہ ہو۔ میں دیکھ اور سن چکا تھا وہ مینا میں انٹرسٹڈ ہے۔ اس لیے تھوڑی دیر بعد آہستہ سے غیر محسوس طریقے سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نیچے سے نکال لیا اور گود میں رکھ لیا اور آنکھیں موند کر سیٹ کی پشت گاہ سے سر ٹکا دیا۔

کار ایک جھٹکے سے رکی تو میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ ہم ایک بہت شاندار کوٹھی کے سامنے کھڑے تھے۔ اتنی بڑی اور شاندار کوٹھی پہلی بار میں نے ایک سیاسی جماعت کے لیڈر کی دیکھی تھی۔

جابر خان نے زور زور سے ہارن بجایا تو بغلی گیٹ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے ساتھ لگی ایک چھوٹی سی کھڑکی کھلی اور گارڈ نے جھانکا پھر چھوٹا گیٹ کھول کر باہر نکل آیا اسلحہ اس کے کندھے سے لٹک رہا تھا۔ وہ کار کے نزدیک آیا اور ڈرائیونگ سیٹ کی کھڑکی سے جھانک کر جابر سے بولا۔

"صاحب سے ملاقات کا ٹائم لیا ہے؟"

"ہاں ساڑھے پانچ بجے ہماری میٹنگ طے ہے ان کے ساتھ۔" جابر نے سخت لہجے میں کہا۔

"تم ایک منٹ ابھی ادھر رکو، ہم معلومات کر کے آتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔

تقریباً دو تین منٹ بعد بڑا اور آہنی گیٹ کسی خود کار سسٹم کے تحت کھل گیا۔

جابر تیزی کے ساتھ کار کو اندر لے گیا۔ جیسے ہی کار اندر آئی گیٹ خود بخود بند ہو گیا۔ یہ آٹومیٹک سسٹم تھا۔ وہ شخص جو ان لوگوں کا باس تھا اس کی کوٹھی میں ایسا سسٹم ہونا ہی چاہیے تھا۔ جرائم پیشہ لوگ اپنی جان کی حفاظت کا پورا انتظام رکھتے ہیں۔

اندر کئی باوردی گارڈ میری نگاہ میں آئے۔ کئی جگہ پوچھ گچھ کے بعد ہمیں اندر جانے دیا گیا۔ پھر ہمیں ایک ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔ مجھے وہاں بیٹھا کر جابر اور مینا اندر جا کر غائب ہو گئے اور میں تنہا بیٹھا پہلے تو ڈرائنگ روم میں موجود قیمتی اور نایاب ڈیکوریشن پیس کا جائزہ لیتا رہا پھر ٹیبل پر رکھے میگزین اٹھا کر دیکھنے لگا۔

ایک ملازمہ چائے کی ٹرالی کھینچتی ہوئی لے آئی ٹرالی میں چائے کے ساتھ ساتھ ناشتے کے کافی لوازمات اور کچھ پھل بھی رکھے تھے۔ اس وقت جابر اور مینا بھی آ گئے ہم تینوں نے چائے کے ساتھ اسنیکس بھی لیے میری نگاہ بار بار وال کلاک پر جا رہی تھی۔ میں باس کی وقت کی پابندی دیکھنا چاہتا تھا میری وال کلاک پر اٹھتی نگاہ کو دیکھ کر جابر نے کہا۔

"تم بار بار گھڑی کیوں دیکھ رہے ہو، ابھی سوا پانچ بجے ہیں۔ باس کے آنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔"

"ہوں!" میں نے مختصر سا جواب دیا۔ میں ان دونوں سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ مجھے یہاں تنہا بٹھا کر وہ دونوں کہاں چلے گئے تھے۔ مگر میں نے ان سے یہ سوال نہیں پوچھا اور انہوں نے خود بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

پانچ منٹ بعد ملازمہ دوبارہ اندر آئی اور ٹرالی واپس سمیٹ ہوئی لے گئی۔

جیسے ہی وال کلاک نے ساڑھے پانچ بجائے ایک بہت زبردست پرسنالٹی کا حامل شخص جو ویل ڈریس تھا اندر داخل ہوا اس نے سنہری رنگ کا باریک کمانی کا چشمہ لگایا ہوا تھا اور اپنی پرسنالٹی سے وہ کوئی "باس" قسم کی شے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

جیسے ہی وہ اندر آیا مینا اور جابر اپنی جگہ سے اٹھ کے کھڑے ہو گئے تو میں بھی ان کی دیکھا دیکھی کھڑا ہو گیا۔

ان لوگوں نے باس کو سلام کیا تو میں نے بھی کر دیا۔ تب باس نے سوفے پر بیٹھتے ہوئے ہمیں بھی بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے چہرے پر ایک بہت مہربان مسکراہٹ تھی۔ جیسے ہی باس کے چہرے پر نگاہ پڑی تو مجھے ہلکی سی شناسائی کا احساس ہوا۔ میں نے اس کو کب اور کہاں دیکھا ہے یہ یاد نہیں آ رہا تھا۔ بعد میں اس نے خود ہی مجھے بتا دیا۔

جابر خان، مینا اور میں اس کا اشارہ پاتے ہی دوبارہ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔

"سب معاملات ٹھیک ٹھاک ہے نا جابر؟" اس نے معنی خیز لہجے میں جابر سے پوچھا۔

"یس باس! ایوری تھنگ از پرفیکٹس آل رائٹ!" اس نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

"اور مینا تم.....!" وہ مینا کی جانب متوجہ ہوا تمہاری نرسنگ کیسی چل رہی ہے۔ وہ والا پروجیکٹ ہو گیا۔"

"یس باس! وہ کام مکمل ہو گیا ہے، جب ہی میں آپ کو یہاں دکھائی دے رہی ہوں اور یہ اتفاق ہی ہے اسپتال میں میرا ٹکراؤ ڈاکٹر شاہ زمان سے ہو گیا۔" مینا نے مسکراتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ باس کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"سلطان کا کچھ پتا چلا؟" باس اس مرتبہ جابر خان سے مخاطب تھا۔

"اس کے بارے میں ابھی کام جاری ہے۔ ویسے اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں چل رہا ہے۔ سنی بھی غائب ہے، ایسا لگ رہا ہے جیسے ان دونوں نے مل کر غداری کی ہے۔ لیکن آپ فکر نہ کریں ہم انہیں پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔" جابر خان نے جواب دیا۔

"ہاں جابر یہ بہت ضروری ہے، سلطان کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ ہمارا بہت خاص بندہ تھا۔ بلکہ وہ دونوں ہی خاص تھے۔ تم نے ان کے بارے میں معلوم کیا کہ پچھلے دنوں ان کے تعلقات یا ملنا جلنا کن لوگوں سے تھا۔ تم نے مجھے فون پر بتایا تھا کہ سنی کے بنگلے پر پولیس نے ریڈ کی تھی۔ ذرا معلوم کر کے مجھے اس انسپکٹر کا نام تو بتاؤ جو وہاں گیا تھا۔" باس نے پُرسچ انداز میں کہا۔

"جی باس!" جابر نے آہستہ سے کہہ کر گردن جھکا لی۔

میں خاموشی سے بیٹھا ان لوگوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہا تھا۔ یہ ان لوگوں کی Confidential گفتگو تھی۔ جو یہ میرے سامنے کر رہے تھے۔ اس بات کا یہی نتیجہ نکالا جا سکتا تھا کہ ان لوگوں نے مجھے اپنا ساتھی بنا لیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو باس کبھی بھی میرے سامنے یہ سب باتیں نہیں کرتے۔

"ہاں بھئی ڈاکٹر صاحب! اب آپ سے بھی بات چیت ہو جائے۔" کچھ دیر خاموشی سے کچھ سوچنے کے بعد وہ ایک دم مجھ سے مخاطب ہوا۔ جواب میں، میں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا اور اس کی جانب دیکھنے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ باس مجھ سے کیا پوچھے گا۔

"ان لوگوں نے تو تمہارے بارے میں معلوم کر لیا ہے کہ تم حقیقت میں کینٹ کے اسپتال میں ملازمت کرتے تھے۔ لیکن اگر میں تمہیں پہلے دیکھ لیتا تو بتا دیتا کہ تم سچ کہہ رہے ہو، شاید تمہیں یاد ہو یا شاید تمہارے ذہن سے نکل گیا ہو کیونکہ روزانہ تمہارا واسطہ مختلف پیشنٹ سے پڑتا ہے۔ شاید ڈیڑھ سال پہلے میرا ایک معمولی سا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور ایمرجنسی میں مجھے کینٹ اسپتال لے جایا گیا تھا جہاں تم نے ہی مجھے اٹینڈ کیا تھا۔ اس لیے تمہیں دیکھتے ہی تمہاری شکل میرے ذہن میں آ گئی۔" باس خاموش ہوئے تو میرے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا اور مجھے یاد آ گیا کہ ایک مرتبہ میں رات کی ڈیوٹی پر تھا۔ ایمرجنسی وارڈ میں میری ڈیوٹی تھی۔ سردیوں کی اس رات بہت زیادہ دھند تھی اور اس دھند کی وجہ سے دو گاڑیاں آپس میں ٹکرا گئی تھیں۔ اس رات کچھ زخمی ایمرجنسی میں لائے گئے تھے۔ ان میں ایک باس بھی تھا اور باس کا نام میں نے ذہن پر زور دیا۔ پھر مجھے یاد آ گیا۔ اس کا نام قزلباش تھا۔

"یاد آیا؟" اس نے پوچھا۔

"جی!" میں نے مختصر سا جواب دیا۔ اس وقت میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنا ڈیسنٹ دکھائی دینے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

والا شخص کسی جرائم پیشہ گروہ کا سرغنہ بھی ہوسکتا ہے اور کبھی میں اس طرح اس سے ملوں گا۔"

"تمہارے حالات کا جان کر ہمیں بہت افسوس ہوا لیکن کیا تمہیں اندازہ ہے کہ تم کن لوگوں سے ٹکر لینے کا سوچ رہے ہو؟ کیا تم ان تک پہنچ پاؤ گے۔ تمہارے پاس کس چیز کی طاقت ہے۔" باس نے کہا۔

"مجھے ان لوگوں کی طاقت کا اچھی طرح سے اندازہ ہے اور اپنا بھی..... کہ میرے پاس نہ افرادی قوت ہے اور نہ ہی مالی اس لیے میں نے جابر سے کہا تھا کہ میں تم لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہتا ہوں تاکہ میں اپنی افرادی قوت کو مضبوط کرسکوں اور اگر آپ لوگ میرا ساتھ دیں گے تو میں اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوجاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"تمہارا پلان کیا ہے؟ تم کیا کرنا چاہتے ہو۔ ختم کرنا چاہتے ہو ان لوگوں کو۔" باس نے اپنی تیز نگاہیں میرے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا۔

"جس طرح ان لوگوں نے میرے پورے خاندان کو ختم کردیا صرف میں ہی بچا ہوں۔ تڑپنے اور سسکنے کے لیے اپنے زخموں کو چاٹنے کے لیے۔" میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔

"اس کام کے لیے تمہیں بہت جدوجہد کرنی ہوگی یہ کام کہہ دینے میں جتنا آسان ہے عملی طور پر اتنا ہی مشکل ہے لیکن تم فکر نہ کرو۔ ہم تمہیں اس قابل بنائیں گے کہ تم اپنے دل کی آگ کو ٹھنڈا کرسکو۔ تمہارا پورا پورا ساتھ بھی دیں گے۔ لیکن یہ بتاؤ کہ تمہارے کام آنے میں ہمیں کیا فائدہ ہوگا۔ بھئی تم اتنا تو جانتے ہوگے کہ اس دنیا کا کاروبار کچھ دو اور کچھ لینے سے ہی چلتا ہے۔" باس نے ایک عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اس کے ہاتھ میں بجھا ہوا سگار دبا تھا۔ جس سے وہ مسلسل کھیل رہا تھا۔ بات ختم کرکے اس نے سگار دوبارہ سے سلگا لیا اور گہرا کش لینے کے بعد اس کا دھواں اپنے نتھنوں سے خارج کرتے ہوئے میری جانب دیکھنے لگا۔ اس کی تیز نگاہیں مجھے اپنے اندر چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ جیسے اپنی نگاہوں سے وہ میرے دل اور دماغ کے اندر اترتے ہوئے میرا جائزہ لے رہا ہو۔

"آپ کو دینے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے سوائے میرے اپنے وجود کے یہ میں آپ کے حوالے کرتا ہوں۔ آپ جس طرح چاہیں اس کا استعمال کریں۔" میں نے صاف صاف کہہ دیا۔

"سوچ لو ڈاکٹر! اچھی طرح سوچ لو یہ تو تم جان ہی چکے ہو کہ ہمارا تعلق جرائم کی دنیا سے ہے، ہمارا کوئی ایک کام نہیں ہے ہمارے ساتھ رہو گے تو آہستہ آہستہ ہمارے بارے میں سب کچھ جان لو گے۔ تمہیں ہمارے ساتھ مل کر ہر وہ کام کرنا ہوگا جو ہم تمہیں کرنے کے لیے کہیں گے۔ ہوسکتا ہے تمہیں کسی کی جان بھی لینی پڑے۔"

"میں لے لوں گا۔ میں کسی کو بھی قتل کرسکتا ہوں۔" میں نے جذباتی ہوکر بے ساختہ کہا۔

"وہ ہاتھ جو لوگوں کو آج تک زندگی دیتے رہے مسیحائی کرتے رہے جان لے سکیں گے کسی کی؟" اس نے ہلکے سے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ڈاکٹر شاہ زمان مر چکا ہے باس۔ وہ ہاتھ جو مسیحائی کرتے تھے لوگوں کو زندگی دیتے تھے وہ دفن ہوچکے ہیں اب تو صرف شہروز خان زندہ ہے۔" میں نے اپنی سرخ آنکھوں سے باس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"گڈ!" باس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ پھر سوفے سے اٹھ کر مجھے کھڑے ہونے کا اشارہ کیا تو میرے ساتھ ساتھ جابر اور مینا بھی کھڑے ہوئے۔

باس نے سرتا پیر گہری نگاہوں سے جائزہ لیا

میرے کندھوں اور کمر پر ہاتھ مارا پھر بولا۔

"ہاتھ پاؤں سے بہت مضبوط اور صحت مند دکھائی دیتے ہو کبھی کسی سے ہاتھا پائی کی ہے۔"

"میری زندگی میں کبھی اس بات کی نوبت ہی نہیں آئی میرا زیادہ تر وقت اپنی پڑھائی میں گزرا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کوئی عورت تمہاری زندگی میں آئی.....؟"

"نہیں!" میں نے مہوش کے بارے میں کسی کو بھی کچھ نہ بتانے کا فیصلہ کیا اور صاف جواب دیا۔ میرا جواب سن کر اس نے ایک اونچا قہقہہ لگایا اور بولا۔

"کیا عورتوں سے الرجک ہو۔"

"ایسی بھی کوئی بات نہیں میں نے کہا ناں کہ میرا سارا وقت پڑھائی میں گزرا پھر تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں اپنے پروفیشن کے لیے وقف ہوگیا۔ میری شادی کب اور کس سے ہوگی یہ فیصلہ میں نے اپنے والدین پر چھوڑ دیا تھا۔"

"گڈ، ویری گڈ، یو نو مجھے ایسے ہی مرد پسند ہیں۔ ہر طرح کی عورت پر رال ٹپکانے والے کمزور ہوتے ہیں۔ عورت بہت جلد مرد کی کمزوری بن جاتی ہے۔ اب وہ کسی بھی صورت میں ہو۔ اچھا ہے تمہارے ساتھ ایسی کوئی کمزوری نہیں ہے۔" باس نے کہا۔ وہ دوبارہ سوفے پر بیٹھ گیا اور ہاتھ کے اشارے سے ہمیں بھی بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

"ایک بات آخری بار تم پر واضح کردینا چاہتا ہوں کہ میں بار بار اپنی بات کو دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔ میری بات ہمیشہ پہلی اور آخری ہوتی ہے۔ اس لیے کہہ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے رکا پھر بولا۔

"ہم سے ہاتھ ملانے کے بعد ہم سے غداری کرنے کے بارے میں سوچنا بھی مت، ہم تمہارے خیر خواہ اس وقت تک ہیں جب تک تم ہمارے خیر خواہ ہو۔ ورنہ دوسری صورت میں..... بندے کو چیونٹی کی طرح مسل دینا ہمارے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے یہ کراچی ہے یہاں روز بوری میں بند لاشیں ملتی ہیں کس نے مارا کیوں مرا اس سے کسی کو غرض نہیں ہوتی۔" باس نے بدلے ہوئے لہجے اور کڑے تیور کے ساتھ کہا۔

"آپ بے فکر رہیں باس، میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں نے شریف بن کے دیکھ لیا۔ کیا دیانت شرافت نے مجھے سوائے اپنوں کی جدائی اور بے بنیاد الزامات کے آج میں اپنے ہی باپ کا قاتل اور بہن کے قتل کا ملزم ٹھہرا دیا گیا۔ اب میں ان ہی کے جیسا بن کے ان ہی کی زبان میں انہیں جواب دینا چاہتا ہوں۔" میں نے غرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے آج سے تم ہمارے ساتھیوں میں شامل ہو، تمہیں وہ کام کرنا ہوگا جو ہم تمہیں کہیں گے ڈن؟" باس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ڈن!" میں نے بھی پرجوش لہجے میں کہا۔

"ہاں جابر تم ایسا کرو کہ شہروز کو ٹریننگ سینٹر لے جاؤ، وہاں یہ شہروز بننے کے سارے داؤ پیچ سیکھ لے گا۔ پھر اسے بھی کام کرنے میں آسانی ہوگی اور ہمیں کروانے میں۔" باس نے جابر سے کہا۔

"جی باس، میں سمجھ گیا۔" جابر نے تابعداری سے جواب دیا۔

پھر باس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر جابر کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا۔

"یہ پیسے رکھو تمہارے کام آئیں گے۔ شہروز کو شاپنگ کرواؤ، اس کی ضرورت کی ساری چیزیں اسے لے کر دو۔ اسے گلشن والے فلیٹ میں ٹھہرا دو۔ مینا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہیں ٹھہرے گی تم حیدرآباد واپس چلے جاؤ اور اسے اس کی رقم اور سارا سامان واپس کر دینا۔"

"ٹھیک ہے باس جیسا آپ حکم کریں۔" جابر نے نوٹوں کی گڈی اٹھاتے ہوئے گردن ہلائی۔

"جابر تم ذرا میرے ساتھ آؤ مجھے تم سے ایک دو اور ضروری باتیں کرنی ہیں۔" اتنا کہہ کر باس کمرے سے نکل گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے جابر بھی چلا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ باس کو جابر سے ضروری بات کیا کرنی ہے۔ وہ جابر کو میرے بارے میں ضروری ہدایات دے گا کہ میرے اوپر کہاں کہاں اور کس طرح نگاہ رکھنی ہے مگر پھر بھی میں نے مینا سے پوچھا۔

"باس کیا بات کرنے کے لیے گئے ہیں؟"

"مجھے کیا پتا۔" اس نے کندھوں کو اچکا کر کہا پھر بولی۔

"باس تمہیں کیسے لگے؟"

"اب کیسے بھی لگے ہوں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میری حیثیت ایک محکوم کی ہے اور ان کی حاکم کی۔" میں نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ تو مینا معنی خیز انداز میں مسکرانے لگی وہ کچھ دیر کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔ "میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ مزہ آئے گا۔"

"مزہ.....! کیا مطلب؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"اچھا چھوڑو تم زیادہ مت سوچو وہاں تمہاری ہم دوسرے ساتھیوں سے ملاقات کروائیں گے۔" اس نے بات کو ٹالتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد جابر واپس آ گیا اور ہم باس کے اس بنگلے سے باہر نکل آئے جابر نے بتایا کہ ہم گلف جا رہے ہیں۔ تب مینا نے جابر سے کہا کہ وہ صدر چلے تھوڑی دیر دونوں میں بحث ہوتی رہی آخر یہ طے ہوا کہ صدر چلا جائے اور ہم صدر آ گئے۔

کراچی انسانوں کا جنگل ہے۔ اتنے سارے لوگ اتنی گاڑیاں ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کراچی کے ہر بندے کے پاس ایک کار ہے۔ ہر جگہ لوگ ہی لوگ ٹریفک کا شور جگہ جگہ ٹریفک جام میں تھوڑی دیر کے لیے تو گھبرا گیا۔ تب مینا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"گھبراؤ مت' تھوڑے ہی دنوں میں تمہیں یہ سب دیکھنے کی عادت ہو جائے گی۔ جو شخص کراچی میں پہلی بار آتا ہے وہ اس طرح گھبرا جاتا ہے۔

ابھی ہم ایک دوکان میں تھے کہ اچانک فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ دھڑا دھڑ دکانوں کے شٹر گرانے لگے ہم نے بھی جو کچھ خرید لیا تھا وہی کچھ لے کر لوگوں اور ٹریفک کے اژدھام میں شامل ہو گئے۔

کچھ بھی پتا نہیں چلا کہ کیا ہوا تھا۔ خیریت سے گھر پہنچے تو سکون کا سانس لیا۔

"تمہیں سب سے پہلے ان چیزوں کا عادی ہونا پڑے گا۔ دوسری چیزوں کی باری بعد میں آئے گی۔" مینا نے میرے چہرے پر گھبراہٹ دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا تو جابر نے مینا کی بات کی تائید کی۔

جابر نے ایک بڑی سی بلڈنگ کے احاطے میں کار روک دی۔ یہ ایک چھ منزلہ عمارت تھی۔ ہم کار سے اتر کر لفٹ کے ذریعے سکس فلور پر پہنچے یہاں ایک دروازے کے سامنے رک کر جابر نے برقی گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔ ایک منٹ بعد ہی دروازہ کھل گیا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔

یہ ایک لگژری فلیٹ تھا۔ چار بیڈ رومز ایک ڈرائنگ اور ایک لاؤنج پر مشتمل یہ فلیٹ قیمتی فرنیچر اور دیدہ زیب آرائشی اشیاء سے مزین تھا۔

ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے' کراچی کے حالات کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔ پنڈی میں مجھے کراچی کے حالات کے بارے میں پتا تو چلتا رہتا تھا آج اس کا تجربہ بھی ہو گیا۔ پھر ذرا ہی دیر میں اس فلیٹ میں رہنے والے دوسرے افراد ایک ایک کر کے وہیں آ گئے۔ جابر نے میرا ان سب سے تعارف کروایا۔ "یہ جعفر ہے' یہ کلیم ہے اور یہ کنیز ہے۔" یہ تینوں اس فلیٹ میں دوستوں کی طرح رہتے ہیں۔ آج سے تم بھی یہیں رہو گے دوست بن کے' جعفر تمہیں ٹریننگ سینٹر لے جائے گا۔ یہ تمہاری ٹریننگ میں تمہاری مدد کرے گا۔ میرے یہ تینوں ساتھی پوری طرح ٹرینڈ ہیں۔ تمہیں ان کا ہر کہنا ماننا ہو گا۔ ہمارے وفادار ہیں اور باس کے قریبی ساتھی بھی ہیں۔ مینا چند دنوں کے لیے یہیں رکے گی۔ باس نے اسے یہی حکم دیا ہے۔ باقی باتیں تمہیں معلوم ہوتی رہیں گی۔ میں ابھی تھوڑی دیر بعد یہاں سے حیدر آباد کے لیے روانہ ہو جاؤں گا اور ہاں تم جعفر کے ساتھ جا کر بینک میں اکاؤنٹ کھلوا لینا۔ میں تمہاری رقم تمہارے رقم اکاؤنٹ میں جمع کروا دوں گا۔" جابر نے کہا۔

"لیکن جابر اکاؤنٹ کھلوانے کے لیے مجھے نئے شناختی کارڈ کی ضرورت ہو گی۔" میں نے کہا۔

"اوہ یس! مجھے یاد آیا باس نے تمہارے لیے کچھ مزید ہدایات دی تھیں اور وہ یہ کہ تمہیں یہ موجودہ حلیہ تبدیل کرنا ہو گا اور پھر تمہارا کارڈ بھی بن جائے گا۔" جابر نے اچانک یاد آنے پر کہا۔

"لیکن میں اپنے حلیے میں کیا تبدیلی لا سکتا ہوں۔" میں نے پوچھا تو جابر بغور میرے چہرے کا جائزہ لینے لگا پھر بولا۔

"وہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔" یہ کہہ کر اس نے جیب سے اپنا سیل فون نکالا اور کسی کا نمبر ملانے لگا رابطہ ہونے پر اس نے کہا۔

"ہاں ریحان تم ایسا کرو کہ اگر مصروف نہیں ہو تو گلشن والے فلیٹ پر آ جاؤ' اپنا ضروری سامان ساتھ لیتے آنا۔" پھر کچھ دیر دوسری جانب سے کچھ سننے کے بعد بولا۔ "ہاں میں شام تک رک جاؤں گا۔ بس تم فوراً نکلو۔" بات ختم کر کے وہ مجھ سے بولا۔

"میں نے ریحان کو بلوایا ہے۔ وہ آ کے تمہارے چہرے کو دیکھ کر بہتر طور پر بتا سکتا ہے کہ تم اپنی موجودہ شکل میں کس طرح تبدیلی لا سکتے ہو۔" پھر وہ کنیز کو مخاطب کر کے بولا۔ "کھانے کا کیا سلسلہ ہے۔ بھئی تم لوگوں کا ایک نیا ساتھی آیا ہے۔ آج کچھ خاص چیز ہونی چاہیے۔"

"لگتا ہے ہمارا یہ نیا ساتھی خاصا بور نگ ہے کوئی بات ہی نہیں کر رہا۔" کنیز نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں گڑبڑا گیا۔ اور کہا۔

"اب تو مجھے یہیں رہنا ہے باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔"

"بے چارہ پہلی مرتبہ کراچی آیا ہے۔ شاید یہاں کے شور ہنگامے سے گھبرا گیا ہے۔" مینا نے شوخ لہجے میں کہا تو کنیز ہنس پڑی اور میں جل سا ہو کر رہ گیا۔

"بھئی بہت بری بات ہے تم لوگ کیوں اس کو تنگ کر رہی ہو' نیا ہے ناں آہستہ آہستہ اس ماحول کا بھی عادی ہو جائے گا۔" کلیم نے کہا تو کنیز نے شوخی سے کہا۔

"چہ چہ چہ بے چارا.....!"

"میں بے چارا نہیں ہوں۔" میں ایک دم چیخ اٹھا۔ "کیا سمجھ کے تم لوگ میرا مذاق اڑا رہی ہو۔"

"ارے ہم تو مذاق کر رہی تھیں تم تو ناراض ہو گئے۔" میرے بری طرح چیخنے سے مینا نے گھبرا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے کہا تو جابر نے آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں چپ رہنے کو کہا۔

مجھے ایک دم سے بہت غصہ آ گیا اور میرا موڈ خراب ہو گیا۔ تو دونوں مجھ سے سوری کرنے لگیں۔ جعفر اور کلیم بھی میرے نزدیک آ گئے۔ دونوں نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے اور مسکرا کے مجھے کول رہنے کے لیے کہا۔ جواباً میں نے بھی اپنے ہائیڈ ہونے پر معذرت کی۔

جابر کچھ دیر کے لیے وہاں سے اٹھ کر چلا گیا تو وہ لوگ مجھ سے میرے بارے میں پوچھنے لگے تو مینا نے مختصراً انہیں میری کہانی سنا دی۔ سب نے مجھ سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ ذرا دیر پہلے جو تناؤ ماحول پر چھایا ہوا تھا وہ دور ہو گیا۔ تب ہی ڈور بیل سنائی دی۔ جعفر نے دروازہ کھولا تو ایک ادھیڑ عمر شخص اندر داخل ہوا معلوم ہوا کہ یہی ریحان ہے۔

ریحان کے آنے کے بعد جابر بھی آ گیا اور اس نے ریحان سے کہا کہ وہ میری شکل وصورت میں مناسب تبدیلی کر کے مجھے ایک دوسری شکل دے دے۔

ریحان نے میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے مجھے کچھ ہدایات دیں۔ تب کنیز بولی۔

''ریحان بھائی شمروز اچھا خاصا خوب صورت بندہ ہے۔ کیوں اس کی شکل تبدیل کر رہے ہیں۔''

جواب میں ریحان نے کنیز کی جانب معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور بولا۔

''بھئی تمہارے لیے تو یہ وہی شمروز رہے گا۔''

ریحان کے جانے کے بعد میں نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا تو مجھے اپنی شکل خاصی حد تک تبدیل لگی۔ اس نے میرے چہرے پر کافی گھنی اور نوک دار مونچھیں لگا دیں تھیں۔ ہلکی سی داڑھی بھی تھی۔ جیسے اچھی خاصی بڑھی ہوئی شیو ہوتی ہے۔ سر کے بال بھی لمبے تھے۔ سیدھی مانگ نکال کر بالوں کو دونوں شانوں پر ڈال دیا تھا۔ آنکھوں میں پتلیوں کی رنگت تبدیل کرنے کے لیے لینس لگا دیے تھے۔

جابر نے مجھے دیکھا تو اس کے منہ سے بے ساختہ 'واہ' نکل گیا۔ اس نے اپنے موبائل سے میرے کئی پوز لیے۔ پھر کہا کہ میں یہ ساری اضافی چیزیں اپنے چہرے سے اتار دوں۔ اب مجھے اپنے بالوں کو اس حد تک بڑھانا تھا کہ میرا یہی حلیہ بن جائے۔

کھانے کے بعد جابر وہاں سے چلا گیا۔ میں وہاں رہنے لگا۔ جعفر اور کلیم میرے ساتھ اس ہیلتھ کلب جاتے تھے وہاں مجھے کافی ایکسرسائزز کروائی جاتیں۔ جوڈو کراٹے اور کنگ فو کی تربیت ہوتی۔ میں نے ہر طرح کا اسلحہ چلانے کی تربیت بھی حاصل کی۔

میں زیادہ تر خاموش رہ کر وقت گزارتا تھا۔ مینا بھی کچھ روز کے بعد واپس چلی گئی تھی۔ تنہا رہتا تو ماضی کی تکلیف دہ یادیں کسی ناگ کی طرح پھن پھیلا کے میری آنکھوں کے سامنے آ جاتیں اور میں ان میں کھو جاتا۔

میں دن رات جان توڑ محنت کر رہا تھا۔ میں جلد از جلد آئرن مین بن جانا چاہتا تھا اور اپنے فولادی شکنجے میں سردار شیر افضل خان کو کسنا چاہتا تھا۔ راجہ صاحب بھی میری اس لسٹ میں شامل تھا۔ مگر اس کا نمبر ان دونوں کے بعد ہی آنا تھا۔ کیونکہ راجہ صاحب ہی وہ شخص تھا جو اگر چاہتا تو میرے ساتھ وہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہو گیا۔ رہی مہوش تو اسے بھی میں اپنے دل سے کھرچ کر پھینک دینا چاہتا تھا حالانکہ اس نے میری مدد کرنے کی پوری کوشش کی مگر اس کے کمینے باپ نے اپنی چہیتی بیٹی کی بات بھی نہیں مانی' اگر

مہوش کی محبت میرے دل میں کسی بھی کونے میں چھپی رہ گئی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے باپ راجہ صاحب سے انتقام لیتے ہوئے ایک لمحے کے لیے یہ سوچ کر میرے ہاتھ نہ کانپ جائیں کہ وہ مہوش کا باپ ہے اور اپنے باپ کے انجام سے اسے تکلیف پہنچے گی۔

اس روز جب ہم کلب سے واپس آئے تو جعفر اور کلیم نے مجھے تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ماننا پڑے گا شمروز تمہارے اندر بے حد اسٹمنا ہے۔ ذہانت اور لگن بھی ہے تم بہت تیزی کے ساتھ بہت کچھ سیکھ رہے ہو۔''

جعفر اور کلیم میرے اوپر بہت محنت کر رہے تھے۔ مجھے ایک مہینہ ہو گیا تھا یہاں آئے ہوئے۔ اس دوران میں میرا شناختی کارڈ بھی بن کے آ گیا تھا اور بینک اکاؤنٹ بھی کھل گیا تھا۔ میری آٹھ لاکھ کی رقم میرے اکاؤنٹ میں جمع ہو گئی تھی اور میرے بال بھی کافی بڑھ چکے تھے۔ ابھی سر کے بالوں کی مطلوبہ لمبائی نہیں ہوئی تھی۔

اس دن بہت دیر تک کنیز دکھائی نہیں دی۔ تب میں نے اس کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا کے اس کی طبیعت خراب ہے۔ طبیعت خراب کا سن کر میں پہلی مرتبہ اس کے کمرے میں اسے دیکھنے کے لیے گیا۔ وہ کمبل اوڑھے آنکھیں موندے لیٹی تھی۔ تیز بخار کی شدت سے اس کا سانولا چہرہ سرخی مائل ہو رہا تھا۔ سانسیں بھی بھاری ہو رہی تھیں۔

''کنیز.....!'' میں نے اسے ہولے سے پکارا۔ یہ جاننے کے لیے کہ وہ سو رہی ہے یا یوں ہی آنکھیں موندے لیٹی ہے لیکن وہ جاگ رہی تھی۔ میری آواز سن کر اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں' اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور ہونٹ خشک پپڑی زدہ ہو رہے تھے۔ وہ دھیرے سے کراہی اور بولی۔ ''پانی.....!''

میں نے قریب رکھی پانی کی بوتل سے گلاس میں پانی ڈال کر اس کی جانب بڑھایا۔ تو وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر اس سے اٹھا نہ گیا اور وہ کراہتے ہوئے دوبارہ تکیے پر گر پڑی۔ تب میں نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دے کر اٹھایا اور پانی کا گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا۔ اس نے چند گھونٹ لے کر منہ ہٹا لیا۔ وہ بے دم سی ہو رہی تھی۔ میں نے گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھا پھر آہستہ سے اس کا سر تکیے پر رکھ دیا۔

میں اس کا معائنہ کرنے لگا۔ اچانک ہی میرے اندر کا وہ ڈاکٹر جسے میں نے تھپک تھپک کر سلا دیا تھا بے دار ہو گیا۔

بخار کافی تیز تھا۔ ''کب سے بخار آ رہا ہے؟'' میں نے پوچھا تو اس نے چند لمحوں بعد جواب دیا۔ ''کل رات سے۔''

''تم نے کوئی دوا لی؟'' میں نے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی تھا ہی نہیں تم لوگ صبح ہی چلے گئے تھے۔ میں سو کر اٹھی تو رحیمہ بھی کام کر کے جا چکی تھی۔ بس اسی طرح لیٹی ہوں۔ بخار تیز ہوتا جا رہا ہے' جسم میں اتنا زیادہ درد ہے کہ ذرا بھی جسم ہلاؤں تو بری طرح دکھنے لگتا ہے۔ سر بھی درد سے پھٹا جا رہا ہے۔'' اس نے آہستہ آہستہ دھیمی آواز میں بتایا۔ وہ بار بار بولتے بولتے رک جاتی اور ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگتی۔

میں سمجھ گیا کہ اسے کیا ہوا ہے میں نے ایک پرچے پر دوائیں لکھ کر کلیم کو دی کہ وہ یہ دوائیں میڈیکل اسٹور سے لے آئے۔ ساتھ ہی انجکشن اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سرنج بھی منگوائیں۔ وہ صبح سے بھوکی تھی اس لیے میں کچن میں آیا اور اس کے لیے چائے بنائی اور سلائس لے کر آ گیا۔

اس نے کچھ بھی کھانے سے انکار کر دیا۔ لیکن دوا کھانے کے لیے پیٹ میں کچھ ہونا ضروری تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ سے بہلا بہلا کر اسے ایک سلائس کھلایا اور چائے پلائی۔ پھر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں اس کے ماتھے پر رکھیں تو بخار میں کچھ کمی ہوئی۔

کلیم دوائیں لے آیا تو میں نے اسے دوائیں دیں اور انجکشن لگایا تھوڑی دیر بعد وہ سو گئی تو میں کمرے سے باہر آ گیا۔

کلیم اور جعفر خوش بھی ہوئے اور حیران بھی جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میں ایک ڈاکٹر ہوں۔

"یار تمہارے ساتھ واقعی بہت زیادتی ہوئی ہے۔ تم ایک معزز پیشے سے تعلق رکھتے ہو ایک با عزت زندگی گزار رہے تھے لیکن تمہارے حالات اور تقدیر نے تمہیں کس جگہ لا کے کھڑا کر دیا ہے۔ ہماری بھی کوئی زندگی ہے کہیں سے بھی کوئی بھی گولی کسی بھی وقت آ کے ہمارے جسموں کو چاٹ سکتی ہے۔ ہمارے دوست کم اور دشمن زیادہ ہیں۔" جعفر نے کہا۔

"ہاں یار! کسی کو نہیں معلوم ہوتا کہ اس کی زندگی میں اگلا آنے والا دن اس کے لیے کیا کیا طوفان لے کر آنے والا ہے۔ میں بھی کبھی یہ سب نہیں سوچا تھا۔" میں نے ایک گہری سانس اپنے اندر خارج کرتے ہوئے کہا۔

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ گارڈ حشمت بازار سے کھانا لے کر آ گیا۔

"کیا آج کھانا نہیں پکا' دینو چاچا کہاں ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"وہ دو چار دن کے لیے بدین گئے ہیں۔ ان کے کسی رشتے دار کا انتقال ہو گیا ہے۔" حشمت نے جواب دیا۔

"اچھا' اچھا جب ہی کنیز کی کسی نے خبر نہیں لی۔" میں نے کہا۔

حشمت باہر چلا گیا تو کلیم برتنوں میں کھانا نکال کر لے آیا۔ کھانے کے دوران ہم باتیں بھی کرتے جا رہے تھے تب پہلی بار جعفر نے مجھ سے میری مظلومی کی داستان سنانے کی خواہش ظاہر کی۔ میں بولنے لگا تو کلیم بولا۔

"ابھی ٹھہر جاؤ میں چائے لے کر آ جاؤں پھر سنانا۔" وہ جھوٹے برتن سمیٹ کر کچن میں لے گیا اور تین کپ چائے لے کر آ گیا۔ چائے پینے کے دوران میں نے اپنے اوپر گزری ہوئی لفظ بہ لفظ داستانِ ظلم سنا دی۔ مہوش کا ذکر میں گول کر گیا۔

"پھر تو تیرا پورا پورا حق بنتا ہے کہ تو ان میں سے کسی ایک کو بھی نہ بخشے تو فکر نہ کر دوست ہم تیرے ساتھ ہیں۔" دونوں نے کہا اور مضبوطی سے میرے ہاتھ تھام لیے۔

"یار ان نام نہاد شریف اور عزت دار سیاست دانوں سے کہیں زیادہ اچھے تو غنڈے بدمعاش ہیں جو ظلم کو سمجھتے ہیں اور ساتھ دیتے ہیں۔" میں نے ممنونیت کے گہرے احساس کے ساتھ کہا۔

کافی دیر ہو چکی تھی۔ اس لیے میں کنیز کو دیکھنے کے لیے اس کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ دوا کے زیر اثر گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پسینہ آ رہا تھا۔ بخار اتر رہا تھا۔ میں نے ٹشو لے کر اس کا پسینہ صاف کیا۔ اس کا ہاتھ مڑا ہوا رکھا تھا وہ سیدھا کیا اور اسے ٹھیک سے کمبل اوڑھا کر باہر آ گیا۔

"اب کیا حال ہے کنیز کا بخار کچھ کم ہوا؟" جعفر نے پوچھا۔

"ہاں صبح تک بخار مکمل طور پر اتر جائے گا' اسے کافی زیادہ پسینہ آ رہا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

پھر ہم سونے کے لیے لیٹ گئے سونے سے پہلے ہمیشہ کی طرح میں نے وضو کیا اور عشاء کی نماز ادا کی اور بستر پر لیٹ گیا۔ میں چونکہ بہت تھکا ہوا تھا۔ اس لیے فوراً ہی نیند آ گئی۔

صبح آنکھ کھلی تو سب سے پہلا خیال کنیز کا آیا کہ اس کا نہ جانے کیا حال ہے۔ اس کو جا کر دیکھنا چاہیے۔ یہ سوچ کر میں تیزی سے اٹھا اور منہ دھو کر سیدھا کنیز کے کمرے میں گیا۔ میں نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو وہ جاگ رہی تھی۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ مجھے اس کے چہرے سے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا بخار اتر چکا ہے۔ مگر پھر بھی میں نے اس کی پیشانی کو چھو کر دیکھا۔ پھر اس کی طبیعت پوچھی۔ جواب میں اس نے ایک دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے تھینک یو کہا۔

"تم نے میرا اتنا خیال رکھا' میں بہت ممنون ہوں تم نے مجھے دوائیں کیسے دیں۔ تمہیں کیا پتا دواؤں کے بارے میں۔" اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

"بس یوں ہی اندازے سے دوائیں دے دیں یہ سوچ کر کہ شاید ان کے استعمال سے تم ٹھیک ہو جاؤ۔" میں نے اپنی مسکراہٹ لبوں میں دبا کر کہا۔

"اوہ گاڈ! اگر دواؤں سے مجھے کچھ اور ہو جاتا تو.....؟" اس نے کہا۔

"کچھ ہوا تو نہیں ناں دیکھو تم ٹھیک ہو گئیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"ارے واہ! کہتے ہیں ناں نیم حکیم خطرہ جاں بابا آئندہ سے مجھے بخش دینا میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔" اس نے کہا۔

"لیکن شروز نیم حکیم نہیں بلکہ کوالیفائڈ ڈاکٹر ہے۔" اندر آتے ہوئے جعفر نے کنیز کا جملہ سن لیا تو کہا۔

"ڈاکٹر.....!" کنیز نے شدید استعجاب سے کہا۔

"ہاں! اور ہمیں بھی یہ بات رات کو ہی پتا چلی ہے۔ تمہیں پتا بھی نہیں ہے شروز آدھی رات تک تمہاری دیکھ بھال کرتا رہا ہے۔ اس نے خود تمہارے لیے چائے بنائی۔ تمہیں اپنے ہاتھوں سے ایک سلائس کھلایا' دوائیں کھلائیں اور انجکشن لگایا۔ پھر تم سو گئیں اور تمہیں پسینہ آ کر بخار اترنے لگا تب یہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں گیا ہے۔" جعفر نے کہا۔

"ہاں مجھے کچھ کچھ یاد ہے دراصل بخار بہت تیز تھا اور مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔" اس نے کہا اور پھر میرا شکریہ ادا کرنے لگی۔

میں نے اسے مزید ایک دن آرام کرنے اور دوا کھانے کا مشورہ دیا تاکہ وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو سکے۔

اس واقعے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ کنیز کا رویہ میرے ساتھ خاصا تبدیل ہو گیا ہے۔ میں دن رات وہ ساری ایکسرسائز کر رہا تھا جو جعفر اور کلیم نے مجھے بتائی تھیں۔ یوں سمجھ لیں کہ میرے اندر ایک جنون سا پیدا ہو گیا تھا بلکہ میں اپنے اندر خود بہت زیادہ تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔ میرا مزاج بھی تیزی سے تبدیل ہو رہا تھا۔ میرے اندر بہت زیادہ خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی بات کرتے کرتے میرا لہجہ سخت ہو جاتا تھا۔ میرے لہجے کی وہ نرمی اور حلاوت جو ایک ڈاکٹر کی شخصیت کا خاص حصہ تھی۔ بالکل ہی ختم ہو گئی تھی۔

اس روز بھی میں کلب سے واپس آیا تو غسل کر کے فریش ہوا اور پھر ناشتہ کرنے لگا۔ جعفر اور کلیم کلب میں ہی تھے۔ گھر میں صرف کنیز تھی اور وہ عورت جو گھر کی صفائی کا کام کرنے آیا کرتی تھی۔ ان لوگوں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فل ٹائم کسی ملازم کو نہیں رکھا ہوا تھا۔ ملازمہ آتی اور اپنا کام کر کے چلی جایا کرتی تھی ظاہر ہے ان لوگوں کا کام ہی اس طرح کا تھا کہ کسی کو کل وقتی اپنے گھر نہیں رکھ سکتے تھے۔

میں ناشتہ کر ہی رہا تھا تب کنیز اپنے کمرے سے نکل کر میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے ایک نگاہ اس کے اوپر ڈالی پھر اپنے ناشتے کی جانب متوجہ ہو گیا۔ میں اپنی ڈائٹ کا بہت خیال رکھا کرتا تھا۔ پہلے بھی میرے اندر طاقت و توانائی تو بہت تھی مگر اس طاقت کو مجھے اس طرح استعمال کرنا پڑے گا۔ یہ میں نے کبھی سوچا تھا۔ کنیز تھوڑی دیر چپ چاپ بیٹھی رہی پھر بولی۔

"ناشتہ کرنے میں اتنے مگن ہو کہ تمہیں کسی کے آنے کا پتا بھی نہیں چلا۔"

"نہیں! میں نے تمہیں دیکھا ہے تمہیں کوئی کام ہے مجھ سے!" میں نے روکھے لہجے میں کہا۔

"ایک ہی گھر میں رہتے ہیں بندہ یوں ہی کبھی کسی کا حال چال ہی پوچھ لیتا ہے مگر تم تو لگتا ہے تنہا ہی رہتے ہو کبھی بات ہی نہیں کرتے۔" اس نے کہا۔

"مجھے فضول باتیں کرنے کی عادت نہیں ہے۔" میں نے اس کی جانب دیکھے بنا ہی اپنا سابقہ لہجہ برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا مجھ سے باتیں کرنا محض وقت کا ضیاع ہے۔" اس نے کہا۔

"میں نے یہ تو نہیں کہا۔" میں نے چائے کا مگ اٹھا کر منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔

"بہت مغرور ہو۔" وہ بولی۔

"مغرور۔" میرے لبوں پر ایک تلخ سی ہنسی آ گئی۔ "میں بھلا کس چیز پر غرور کروں گا میرے پاس رکھا ہی کیا ہے۔"

"تمہاری مردانہ وجاہت! تم بہت وجیہہ ہو اتنے کہ کوئی بھی لڑکی تمہارے اوپر دل و جان سے فدا ہو کر تمہارے ایک اشارے پر اپنا سب کچھ نچھاور کرنے پر تیار ہو جائے۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"مگر مجھے ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"کیا کسی کو اپنا دل دے بیٹھے ہو۔" اس نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"شٹ اپ کنیز مجھے لڑکیوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" میں نے چائے کا مگ زور سے ٹیبل پر رکھا اور کھڑا ہو گیا۔

"مگر مجھے تم میں دلچسپی ہے تمہاری ذات میں دلچسپی ہے۔ میں تمہارے اندر جھانکنا چاہتی ہوں۔ تمہارے سارے دکھ اپنے اندر سمیٹ لینا چاہتی ہوں۔" وہ میرے بگڑے ہوئے موڈ اور لہجے کی پروا کیے بغیر اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے نزدیک آ کے بولی۔

"تم محض اپنا ٹائم ویسٹ کرو گی۔ میرے اندر جو جوار بھاٹا پک رہا ہے وہ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔"

"ہاں میں جانتی ہوں تم اندر سے کتنے دکھی ہو لیکن شمروز دکھ کہہ دینے سے کم ہو جاتے ہیں۔ چلو تم مجھے اپنے گھر کی اپنے والدین کی بہن بھائی کی باتیں بتاؤ مجھے وہ سب سننا اچھا لگے گا۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور دوبارہ مجھے سوفے پر بٹھاتی ہوئی بولی۔

"کیوں میرے سوئے ہوئے زخموں کو جگانا چاہتی ہو۔" میں نے بوجھل لہجے میں کہا۔

"جب دکھوں کے بادل بہت زیادہ گہرے ہو جائیں تو اپنے ماضی کی کوئی اچھی یاد ذہن میں دہرا لینا چاہیے۔ بہت اچھا لگتا ہے کم از کم تھوڑی دیر کو سکون ہی مل جاتا ہے۔" اس نے دکھی لہجے میں کہا تو

میں حیرت سے اس کی شکل دیکھنے لگا۔

"ہاں میں ایسا ہی کرتی ہوں۔ جب سب کی یاد آتی ہے تو رات کی تنہائی میں جب نیند آنکھوں سے اوجھل ہوتی ہے اور ایک ایک لمحہ گزارنا مشکل ہوتا ہے۔ تو میں اپنے ماضی میں چلی جاتی ہوں۔ جہاں میری اماں تھیں، بابا تھے، چھوٹی بہن اور بھائی تھے۔ وہ دن بہت اچھے تھے شمروز بہت ہی اچھے بابا کا ڈھیر سارا پیار تھا۔ چھوٹی بہن کا روٹھ جانا تھا۔ وہ بابا سے روٹھ جاتی تھی۔ صرف اس لیے کہ بابا مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ میری ہر فرمائش پوری کرتے تھے ہر کام کا مشورہ مجھ سے کرتے تھے اور بابا پیار سے مجھے لپٹا کے کہتے۔ "میری کنیز تھوڑے دنوں کی تو مہمان ہے جب یہ یہاں سے رخصت ہو کر اپنے سسرال چلی جائے گی تب میرا سارا کا سارا پیار صرف تیرے لیے ہوگا اور میری ننھی گڑیا سی بہن بابا کی اس تسلی سے بہل جاتی تھی مگر میں نے تو خود اپنا نصیب بگاڑ لیا۔ میں نے اتنے پیار کرنے والے لوگوں کی نہ عزت و آبرو کی لاج رکھی اور نہ مان رکھا۔ سب کچھ اپنے ہاتھوں تباہ کر ڈالا اور آج دیکھو میں کہاں کھڑی ہوں۔ میرا چہرہ اتنا گھناؤنا ہو گیا ہے کہ میں کسی اپنے کو یہ گھناؤنا چہرہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہی.....!" بات کرتے کرتے اس کی آواز بھرا گئی اور وہ چپ ہو گئی۔

کنیز کی بات سن کر میں اپنے ماضی کے سارے دکھ بھول گیا۔ ایک دم ہی میرے اندر سویا ہوا شاہ زمان بے دار ہو گیا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگی۔

"پلیز کنیز چپ ہو جاؤ، کیا ہو گیا ہے تم خود اپنے سے اتنی زیادہ دکھی ہو۔ میں تمہیں ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ مجھے بتاؤ تو کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ۔ آج تم اتنی ڈیپریس کیوں ہو۔" میں نے نرم لہجے میں کہا تو تھوڑی دیر سسکنے کے بعد وہ خاموش ہو گئی تو میں نے ٹشو پیپر نکال کر اسے دیا کہ وہ اپنے آنسو خشک کر لے اپنا چہرہ صاف کرنے کے بعد وہ خجالت سے بولی۔

"آئی ایم رئیلی سوری شمروز مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا بلکہ ہم لوگ جس فیلڈ میں ہیں وہاں اس قسم کی جذباتیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

"ایسا مت کہو کنیز! آخر ہم انسان ہیں اور انسان ہی رہیں گے۔ اپنے سینے میں رکھے گوشت کے اس لوتھڑے کو جسے دل کہتے ہیں پتھر کیوں نہ بنا لیں رہے گا تو وہ دل ہی اور دل میں ہمیشہ کسی کونے میں لطیف جذبات ضرور چھپے رہتے ہیں۔ جو انسان کی کمزور پڑتے ہی باہر نکل آئے ہیں۔ اچھا اب مجھے بتاؤ آج تم اتنی اداس کیوں ہو، لگتا ہے تم رات بھر سوئی ہی نہیں ہو۔" میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سہلاتے ہوئے کہا۔

وہ تھوڑی دیر خاموش رہی پھر جھجکتے ہوئے بولی۔

"آج میرے بابا کی دوسری برسی ہے اور میں بد نصیب ان کا آخری دیدار بھی نہ کر سکی۔"

کنیز نے اپنے بابا کا ذکر کیا تو مجھے بھی اپنے بابا شدت سے یاد آنے لگے۔ مگر میں نے اپنے آپ کو کنٹرول کر لیا میرے دل میں کنیز کے حالات جاننے کی شدت سے خواہش ہونے لگی۔ تب میں نے اس سے کہا۔

"کنیز تم مجھے اپنے بارے میں بتانا پسند کرو گی کہ تم اپنے پیار کرنے والے والدین کے پر شفقت سائے سے نکل کر اس جگہ کیسے آ گئیں اور ان جرائم پیشہ لوگوں کے ہتھے چڑھ گئیں۔ تم مجبوراً ان کے ساتھ ہو یا اپنی خوشی سے.....؟"

"میں تمہیں اپنے بارے میں ضرور بتاؤں گی بلکہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں تو خود چاہتی ہوں کہ کسی کے سامنے وہ ساری باتیں دہرا کر اپنے ضمیر کی چبھن سے کچھ تو نجات حاصل کرلوں۔ مگر اس وقت نہیں' میری کہانی سننے کے لیے بہت سا وقت درکار ہوگا۔ ابھی جعفر اور کلیم بھی آنے والے ہیں۔ اگر رات میں ٹائم ملا تو ہم بات کریں گے۔'' ابھی کنیز نے بات کی ہی تھی کہ جعفر اور کلیم دونوں آ گئے انہوں نے کنیز کو بتایا کہ جابر کا فون آیا تھا سلطان اور سنی کا پتا چل گیا ہے۔

جعفر کی بات سن کر میرے کان کھڑے ہوگئے کیونکہ یہ سلطان ہی تھا جس کے پرس کی وجہ سے میں ان لوگوں کے پاس آ گیا تھا۔

''سلطان زندہ ہے یا مرگیا۔'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''تم سلطان کو جانتے ہو؟'' جعفر نے ابرو اچکا کر پوچھا۔ تو کنیز اور کلیم بھی میری جانب دیکھنے لگے۔

''ہاں تھوڑ بہت۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''لیکن تم بتاؤ تو سہی کہ وہ زندہ ہے یا.....!''

''وہ زندہ ہے' سالا حرامی' نمک حرام غدار!'' جعفر نے نفرت انگیز لہجے میں سلطان کو گالیاں دیتے ہوئے کہا۔

''اچھا حیرت ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جاوید ہی تھا۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی جیب میں سلطان کا پرس کیسے آ گیا۔ کیا جاوید بھی تم لوگوں کا ساتھی تھا۔'' میں نے کہا۔

''کون جاوید؟ ہمارا جاوید نامی کوئی ساتھی نہیں ہے۔ تم پتا نہیں کس کی بات کر رہے ہو۔ جابر نے تو صرف اتنا ہی بتایا ہے آج یا کل باس سے ٹائم لے کر جابر ان دونوں کو باس کے پاس لے کر آ رہا ہے۔ ان سے بات ہوگی۔ تب ہی ساری بات کھلے گی کہ ان لوگوں نے یہ سارا ڈراما کیوں کیا تھا اور اتنے عرصے سے وہ کہاں غائب تھے۔'' جعفر بولا۔

''ہاں ساری بات تو وہی بتا سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

پھر ان لوگوں کے اصرار پر میں نے ٹرین میں اپنی جاوید سے ملاقات' ایکسیڈنٹ میں جاوید کی موت اور اپنی شناخت جاوید کے مردہ اور نہ پہچانے جانے والے چہرے کے ساتھ بدلنے والی ساری روداد کہہ سنائی تب ان لوگوں کی سمجھ میں ساری بات آئی۔

مجھے یہاں آئے ہوئے ایک مہینے سے زیادہ ہوگیا تھا۔ جابر اور مینا یہاں سے گئے تو ان لوگوں سے میری دوبارہ ملاقات ہی نہیں ہوئی اور نہ ان کے بارے میں مجھے کچھ پتا چلا کہ وہ لوگ کہاں ہیں اور کیا کر رہے تھے۔ بلکہ مجھے تو یہ بھی کلیئر نہیں ہوا تھا کہ جابر اور مینا کہاں رہتے ہیں۔ روہڑی میں' یا حیدرآباد میں یا پھر کراچی میں ہی کہیں ان کا قیام ہے۔ جعفر کلیم اور کنیز سے میری اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہوگئی تھی۔ لیکن ابھی تک ان لوگوں کے کام کے بارے میں بھی بات نہیں ہوئی تھی کہ آیا یہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی کنیز' کلیم اور جعفر غائب ہوجاتے تھے لیکن نہ تو انہوں نے اپنے کہیں جانے کے بارے میں بتایا اور نہ ہی میں نے کچھ پوچھنے کی جسارت کی ہاں البتہ کبھی دبے دبے لفظوں میں ان کے کام کے بارے میں جاننے کے لیے کوئی سوال کیا تو اس کا جواب یہی ملا کہ آہستہ آہستہ سب کچھ جان لو گے۔ میں بھی خاموشی سے اپنی آنکھیں اور کان کھلی رکھ کر صبر سے وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ کیونکہ باس نے مجھ سے کہا تھا کہ میری مدد کے بدلے میں مجھے باس کے کچھ کام کرنے پڑیں گے۔ اب پتا نہیں باس مجھ سے کیا کام لے گا۔ میں تو بس دن رات لڑائی بھڑائی کرنے کے فنون سیکھ رہا تھا۔ چونکہ میرا شوق اور لگن تھی اس لیے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں جلد ہی یہ سب سیکھ رہا تھا۔

فی الحال تو مجھے اس بات کا بے چینی سے انتظار تھا کہ سلطان اور سنی آئیں اور مجھے ان کے بارے میں معلوم ہو۔ میں رات میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ جاوید کے گھر والوں کو تو یہ بھی معلوم نہیں ہو سکے گا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا جیسا کہ اس نے اپنے بارے میں بتایا تھا کہ کراچی کے علاقے ناظم آباد میں وہ اپنی بیوہ ماں اور جوان بہن کے ساتھ رہتا ہے۔ تو وہ بے چاری تو اس کا انتظار ہی کرتی رہیں گی۔ اس کے بارے میں سوچ کر میرا دل دکھ سا گیا۔ جاوید ہی ایک ان کا سہارا تھا۔ جاوید نے مجھے اپنے گھر انوائٹ کرنے کے لیے اپنے گھر کا جو ایڈریس سمجھایا تھا جو میری یادداشت میں پوری طرح سے محفوظ تھا۔ میرے خیال کے مطابق اگر جاوید کا ان لوگوں سے کسی بھی قسم کا کوئی تعلق ہوتا تو وہ مجھے اپنے گھر کے بارے میں کیوں بتاتا اور نہ ہی اپنے گھر انوائٹ کرتا وہ تو مجھے بہت دوست نواز لگا تھا۔ پتا نہیں اس کو سلطان نے کس طرح ٹریپ کیا اور استعمال کیا۔ سلطان کا پرس اس کے پاس کس طرح آیا یہ اور بہت سے سوالات میرے ذہن میں کلبلا رہے تھے جاوید تو اس دنیا میں رہا نہیں لیکن سلطان زندہ تھا اور وہی ان سارے سوالات کے جوابات دے سکتا تھا۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ یہ لوگ مجھے سلطان اور باس کے درمیان ہونے والی باتیں بتا دیں۔ بہر حال اب جو بھی ہونے والا تھا۔ اس کے لیے کل کا انتظار کرنا تھا۔

دوسرے دن صبح جعفر نے مجھ سے کہا کہ آج ہم ہیلتھ کلب نہیں جائیں گے بلکہ باس نے ہمیں بلایا ہے۔

"مجھے بھی.....؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں تمہیں بھی کیوں کہ اب تم ہم لوگوں سے علیحدہ نہیں ہو۔" جعفر نے جواب دیا تو میں خاموش ہو گیا۔ اب جو بھی بات ہوگی وہ میرے سامنے ہی ہوگی۔

"جابر اور مینا بھی آ رہے ہیں کیا؟"

"ظاہر ہے وہ تو آئیں گے ہی کیونکہ سلطان اور سنی کو وہ لوگ ہی لے کر آئے ہیں۔ بلکہ وہ لوگ کراچی پہنچ چکے ہیں۔" جعفر نے جواب دیا۔

میرے پوچھنے پر کہ کیا ہم کلفٹن باس کی کوٹھی پر جا رہے ہیں تو جعفر نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور بولا۔

"احمقانہ باتیں مت کرو کلفٹن والی کوٹھی باس کی رہائش گاہ ہے مگر ایسے کاموں کے لیے ہمارا ایک اڈا ہے گلشن معمار میں ہم سب وہیں جا رہے ہیں۔"

آج مجھے ایک اور بات پتا چلی کہ گلشن معمار میں ان کا اڈا ہے ہو سکتا ہے کہ وہاں یہ لوگ اپنے دشمنوں کو رکھتے ہو۔ انہیں سزائیں دیتے ہوں، گلشن معمار کہاں ہے اور کتنی دور ہے۔ میں آج یہ بھی جاننے والا تھا۔

"جعفر باس نے ہم سب کو کیوں بلوایا ہے۔ انہیں جو کچھ پوچھنا تھا سلطان اور سنی سے وہ اکیلے میں بھی پوچھ سکتے تھے۔" میں نے سفر کے دوران جعفر سے سوال کیا۔

"باس سلطان اور سنی سے صرف پوچھ گچھ نہیں کریں گے۔ بلکہ ان کا فیصلہ بھی سنا دیں گے اور پھر ان سے غداری کرنے والوں کا کیا انجام ہوتا ہے یہ سب دکھانے کے لیے ہمیں وہاں بلوایا گیا ہے۔ تاکہ ہمیں بھی عبرت حاصل ہو اور ہم ایسی کوئی حرکت کرنے کے بارے میں سوچیں بھی نہیں۔" کنیز نے کہا۔

"اوہ آئی سی.....!" میں نے کہا۔

"ہم تو ایک مرتبہ یہ سین دیکھ چکے ہیں۔ آج اسپیشل تمہیں دکھانا ہے۔" جعفر بولا تو میں اپنے تصور

میں کوئی بھی بھیانک سی سزائیں سوچنے لگا جو باس ان دونوں کو دے سکتا تھا۔ مگر وہاں جا کر جو انجام ان دونوں کا میں نے دیکھا اس کے بارے میں، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔

کافی لمبے سفر کے بعد ہم گلشن معمار پہنچ گئے۔ اس علاقے میں سناٹے کا راج تھا۔ مین روڈ سے اتر کر ہمیں کافی اندر جانا پڑا تھا۔

ایک بہت بڑی باؤنڈری وال کے احاطے میں یہ عمارت کھڑی تھی۔ جعفر نے ہارن بجایا تو گیٹ کھل گیا اور ہماری گاڑی اندر داخل ہو گئی یہاں پہلے سے دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان دو کاروں کے علاوہ ذرا ہٹ کر ایک بڑی اسٹیشن ویگن بھی موجود تھی۔

ہم گاڑی سے اتر کر اندر پہنچے تو جابر اور مینا سے ہماری ملاقات ہوئی۔ جابر اپنے سابقہ انداز میں مجھ سے ملا لیکن مینا کی آنکھوں میں مجھے دیکھ کر عجیب سی چمک آ گئی لیکن شاید جابر کی موجودگی کا خیال کر کے اس نے زیادہ گرمجوشی نہیں دکھائی۔

جعفر اور کلیم جابر سے دھیرے دھیرے باتیں کرنے لگے۔ کنیز اور مینا میرے پاس بیٹھ گئیں۔ مینا نے ایک نگاہ جعفر اور کلیم سے باتوں میں مصروف جابر پر ڈالی پھر پرستائشی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

"ایک مہینے میں تمہاری شخصیت کافی بدلی بدلی دکھائی دے رہی ہے۔ تم واقعی شاہ زمان نہیں رہے شمروز بن چکے ہو لگتا ہے آج باس تمہارا امتحان بھی لیں گے۔"

"بالکل لے لیں میں تیار ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کی گواہ تو میں ہوں شمروز نے جان توڑ محنت کی ہے۔" کنیز نے میری جانب محبت پاش نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے تم نے شمروز سے اچھی دوستی کر لی ہے۔" مینا نے کنیز کی نگاہوں میں چھپی محبت کو دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"دوستی ہنہ! ارے یہ تو بہت ہی پراؤڈ ہے۔ بات ہی نہیں کرتا، بس اپنے کام اپنی سوچوں میں مگن رہتا ہے۔" کنیز میری جانب شکوہ کناں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا تو مینا کے چہرے پر ایک اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور اس سے پہلے کہ ہماری مزید کوئی بات ہوتی کمرے میں اندرونی حصے سے ایک شخص داخل ہوا۔ اس کو دیکھتے ہی میرے ذہن میں بچپن کی سنی ہوئی کہانیوں میں کسی دیو کی شکل جو ہمارے تصور میں بن جاتی تھی وہی آ گئی۔ وہ ساڑھے چھ فٹ کا ہیوی ویٹ سیاہ رنگت کا حامل تھا۔ چھوٹا سا سر جو اس کی لمبی چوڑی جسامت پر مضحکہ خیز دکھائی دے رہا تھا سر بالوں سے خالی تھا۔ پیشانی تنگ تھی چوڑی ناک اور موٹے بھدے ہونٹوں پر گھنی مونچھیں تھیں۔ ایک کان میں اس نے موٹی سی بالی پہنی ہوئی تھی۔ جینز کی سیاہ پینٹ اور سیاہ بغیر آستین کی ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔ وہ ایک باڈی بلڈر دکھائی دے رہا تھا۔ بازوؤں کے مسلز کافی سخت دکھائی دے رہے تھے۔

"آؤ یار دلبر کیا حال ہیں۔" جعفر، کلیم اور جابر نے خوش دلی سے اس سے ہاتھ ملایا پھر میرا اس سے تعارف کروایا مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے دلبر نے بڑی تیز نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"ہائے گرلز!" دلبر نے ہاتھ اٹھا کر ان دونوں کو مسکرا کر اشارہ کیا اور مسکرانے کی کوشش میں اس کا چہرہ مزید بھیانک لگنے لگا۔ میں نے ایک بات اور نوٹ کی کہ دلبر ترچھی نگاہوں سے کنیز کی جانب دیکھ رہا تھا اور کنیز کے چہرے پر اس کے لیے شدید نفرت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور کراہت کے تاثرات تھے۔ دلبر کو اپنی جانب دیکھتے ہوئے پا کے کنیز نے اپنا چہرہ دوسری جانب پھیر لیا۔ کنیز کے دل میں دلبر کے لیے اتنی نفرت اور کراہیت کیوں ہے اس کی وجہ مجھے بعد میں خود کنیز نے بتائی۔ فی الحال تو میں کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔

تھوڑی دیر بعد میرے سامنے ایک اور نیا چہرہ آیا۔ یہ بھی دلبر کی طرح اپنے چہرے پر زمانے بھر کی خباثتیں سجائے ہوئے تھا اور اس کا چہرہ بھی دلبر کی طرح مکروہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس شخص کی چھوٹی اور اندر کو دھنسی آنکھوں میں سفاکی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے کمرے میں آ کر سرد لہجے میں کہا۔

"باس نے تم سب کو میٹنگ روم میں طلب کیا ہے۔"

"باس آ گئے مگر کب؟ میں نے تو انہیں اندر جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔" میرے منہ سے یہ جملہ غیر ارادی طور پر نکل گیا میرا سوال سن کر اس شخص نے مجھے تیز نگاہوں سے گھورا اور تیزی سے واپس پلٹ گیا۔

"تم سے خاموش نہیں رہا جاتا آئندہ اپنی زبان کو فضول میں مت کھولنا۔" کنیز نے میرے قریب آ کر سرگوشی میں کہا۔

"کیا ہوا؟ میں نے ایسا بھی کیا کہہ دیا۔" میں نے تپے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہ ہاشم ہے۔ باس کا بہت خاص الخاص بندہ ہے۔ اس کے سامنے اپنی زبان ہمیشہ بند رکھنا اور صرف حکم کی تعمیل کرنا۔ میں جو کہہ رہی ہوں اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔" کنیز نے سرگوشی میں کہا۔

میں ان لوگوں کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اس کمرے سے باہر نکلے تو میں نے اپنے آپ کو ایک راہ داری میں پایا یہاں دو آدمی جدید اسلحہ سے لیس مجھے دکھائی دیے جو پوری طرح الرٹ کھڑے تھے۔ راہ داری کے اختتام پر ہم ایک پتلی سی گلی میں مڑ گئے۔ یہاں سامنے ایک اونچا سا دروازہ موجود تھا۔

جابر نے دروازہ کھولا تو مجھے اندر سیڑھیاں نیچے کی جانب جاتی ہوئی دکھائی دیں۔ ہم وہ سیڑھیاں اترنے کے بعد ایک وسیع ہال میں پہنچ گئے۔ یہاں روشنی کا انتظام فضا میں معلق فٹ بال کے برابر گولوں سے کیا گیا تھا۔ ہال کے وسط میں ایک بڑی سی ٹیبل بچھی تھی اور ٹیبل کے گرد کرسیاں رکھی تھیں۔ ٹیبل کے سرے پر موجود ایک کرسی پر باس بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر گمبھیر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ ہم سب کے سلام کا جواب بھی اس نے محض سر ہلا کے دیا۔ پھر ہمیں کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم سب خاموشی سے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ہماری نگاہیں باس کے چہرے کی جانب تھیں۔ مگر وہ کہیں اور دیکھ رہا تھا۔ کسی گہری سوچ میں گم تھا اس کا ایک ہاتھ اپنے بالوں سے کھیل رہا تھا بے دھیانی میں وہ بالوں کی لٹ کو اپنی انگلی میں کھول اور لپیٹ رہا تھا۔

سب لوگ خاموشی سے باس کے بولنے کے منتظر تھے۔ پھر ایک آہٹ پر میں نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا ہال کے اندرونی دروازے سے ایک سیاہ فام آدمی اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس چھیالیس سال ہوگی۔ وہ مضبوط اور گٹھے ہوئے جسم کا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے بلیک ٹی شرٹ اور نیلی جینز پہن رکھی تھی۔

"یہ ہمارے ساتھی ہیں راجہ۔" باس نے اس کا تعارف کرایا۔

راجہ نے باری باری ہم سب سے ہاتھ ملایا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا پھر وہ انگریزی میں ہم سب سے مخاطب ہوا۔

"آپ سب سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"

جواب میں جعفر کلیم اور جابر نے اس سے انگریزی میں ہی بات کی تھی اس دن مجھے اندازہ ہوا کہ یہ لوگ تعلیم سے نابلد نہیں ہیں۔ پڑھے لکھے اور انگریزی جانتے ہیں۔ میں خاموش رہا تو باس مجھ سے بولا۔

"شہروز تم راجہ سے کوئی بات نہیں کرو گے۔"

"میں کیا بات کروں سر! ابھی تو میری ان سے محض صورت آشنائی ہی ہوئی ہے۔" میں نے دلچسپی سے مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"یہ لاس اینجلس میں ہمارے بزنس پارٹنر ہیں۔" باس نے بتایا۔

"کس قسم کا بزنس سر.....؟" میں نے کنیز کی تنبیہہ کو فراموش کرتے ہوئے سوال کیا۔ باس میرا سوال سن کر مسکرانے لگا۔ جب کہ میرے برابر میں بیٹھی ہوئی کنیز نے میرے پیر کو اپنے پیر سے دبا کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"اچھا انٹروڈکشن تو ہو گیا۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی فی الحال جابر تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے سلطان اور سنی سے بات کی۔ وہ اپنے بارے میں کیا کہتا ہے۔" باس نے جابر کو مخاطب کر کے پوچھا۔

"کوئی خاص بات تو نہیں کی ویسے بہتر یہی ہوگا کہ آپ خود ہی اس سے ساری بات سن لیں۔" جابر نے محتاط انداز میں کہا تو باس سر ہلانے لگا پھر مینا سے بولا۔

"مینا تم نے اپنا کام مکمل کر لیا میں نے سنا ہے۔ وہاں اسپتال میں اس ڈاکٹر کو اریسٹ کر لیا گیا تھا۔ تم لوگوں نے اس سلسلے میں کیا کیا۔"

"جی سر ایسا ہوا تو تھا مگر ہم نے پولیس کو کافی تگڑی رشوت دے کر ان کا منہ بند کر دیا اور کیس بھی ختم کروا دیا۔ پولیس نے ہی میڈیا کو ٹھنڈا کیا ورنہ وہ لوگ بہت شور مچا رہے تھے۔ ڈاکٹر راحیل کو بھی پولیس سے چھڑوا کر دبئی روانہ کر دیا گیا ہے۔ مال اپنی جگہ پہنچ گیا ہے اور وہاں سے رقم کی ادائیگی بھی ہو چکی ہے ایوری تھنگ از اوکے.....!" مینا نے کہا۔

"ویری گڈ تم بہت اچھی جا رہی ہو جاتے وقت گلزار سے مل لینا وہ تمہاری شاندار کارکردگی کا انعام تمہیں ادا کر دے گا۔" باس نے کہا۔

"تھینک یو ویری مچ سر!" مینا نے سر جھکا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

پھر باس نے آواز دی۔ "گلزار.....!" باس کی آواز ہال میں گونجی ہی تھی وہی شخص جو ہمیں بلانے کے لیے آیا تھا۔ بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو گیا تب مجھے پتا چلا کہ اس کا نام گلزار ہے اور یہ باس کا نزدیکی ساتھی ہے۔

"یس باس!" اس نے سینے پر دایاں ہاتھ رکھتے ہوئے سر جھکا کر نہایت مؤدب لہجے میں کہا۔

"ان دونوں کو لے کر آؤ.....!" باس نے غالباً سلطان اور سنی کو لانے کے لیے کہا تھا۔

"اوکے باس!" وہ ایڑیوں کے بل گھوم کر تیز تیز قدموں سے ہال کے اندرونی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

تقریباً پانچ منٹ کے بعد وہ ان دونوں کو اس حالت میں لے کر آیا کہ دونوں کے ہاتھ پشت کی جانب کر کے لوہے کی زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے اور پیر میں بھی زنجیر پڑی ہوئی تھی اور ان زنجیروں سے جڑی ایک بڑی زنجیر گلزار کے ہاتھ میں تھی۔

جیسے ہی وہ دونوں کمرے میں آئے تو باس تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ باس کے اٹھتے ہی ہم سب بھی کھڑے ہو گئے باس چند لمحوں تک کینہ توز نگاہوں سے ان دونوں کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھتا رہا پھر بولا۔

"ہاں بھئی سلطان اور سنی تم دونوں کو کیا پریشانی لاحق تھی تم نے ایسا کیوں کیا؟" سلطان اور سنی نے باس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور سر جھکائے کھڑے رہے۔

"میں نے کچھ پوچھا ہے تم سے جواب دو۔" باس نے گرج دار آواز میں چیخ کر کہا۔ میں نے پہلی مرتبہ باس کو اس لب و لہجے میں دیکھا تھا ورنہ ابھی تک تو وہ بہت کول لہجے میں بات چیت کرتا رہا تھا۔

"وہ..... وہ باس..... وہ..... میں.....!" ان میں سے ایک نے سر اٹھا کر ممیائے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ خوف کی شدت سے سفید ہو رہا تھا اور وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ یعنی کہ وہ جانتا تھا کہ اب اس کا کیا انجام ہونے والا ہے۔

"یہ کیا تم کتے کے پلے کی طرح میاؤں میاؤں کر رہے ہو ٹھیک طریقے سے بات کرو کیا کبھی میں نے تمہیں تمہارے کام کا معاوضہ دینے میں کنجوسی سے کام لیا۔ کبھی تمہاری حق تلفی کی تمہیں ہر طرح کا عیش و آرام دیا۔ تمہیں کتنی ہی دفعہ پولیس سے بچایا۔ پھر تم نے مجھ سے غداری کے بارے میں کیسے سوچ لیا اور تم نے یہ بھی سوچ لیا کہ تم مجھ سے بھاگ کر کہیں بھی پناہ لے سکتے ہو آغا قزلباش سے.....!"

باس نے اس شخص کے قریب جا کر اس کے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ کر اس کا سر اونچا کر کے دانتوں کو پیستے ہوئے کہا اور ایک زور کا جھٹکا دے کر اس کے بالوں کو چھوڑ دیا۔

"معاف کر دیں باس..... غلطی ہو گئی..... آ..... آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" وہ دونوں بری طرح رونے اور گڑگڑانے لگے۔

"تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ میں دوسرا موقع کسی کو بھی نہیں دیا کرتا میری عدالت میں غداری کی سزا صرف موت ہے۔" باس نے اسے اپنی خونی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سفاک لہجے میں کہا۔

"ہم نے آپ سے غداری نہیں کی باس میں خدا کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ میں نے غداری نہیں کی میں تو صرف یہ کام چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے وہ سارا ڈراما کیا تھا۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔

"تم بھول گئے کہ میں نے پہلی بات تم سے کیا کہی تھی یہی ناں کہ یہاں آنے کا دروازہ تو ہے مگر واپسی کے لیے کوئی دروازہ نہیں ہے۔" باس نے کہا۔

"یاد تھا باس.....!" اس نے اقرار میں گردن ہلائی۔

"اپنے فرار کے لیے تم نے کیوں سوچا اور کیا ڈراما پلان کیا۔ ٹرین حادثے میں مرنے والے شخص کی جیب میں تمہارا پرس کیسے پہنچ گیا۔ وہ کون تھا اور تمہارا اس سے کیا تعلق ہے۔" باس نے لمحہ بھر میں اپنے آپ کو نارمل کر لیا اور دوبارہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا پھر بولا۔ "یہ یاد رہے میں صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے اگر تم سچ بولو تو میں اپنے فیصلے جو تمہاری موت کی صورت میں ہو چکا ہے نظر ثانی کر لوں۔"

"میں نے آپ کی تنظیم میں شامل ہونے کے بعد اپنے گھر والوں کو چھوڑ دیا تھا۔ آپ کی ہدایت کے مطابق میں ان لوگوں سے ملنے بھی نہیں جاتا تھا۔ صرف رقم منی آرڈر کر دیتا تھا۔ لیکن باس میری اکلوتی بہن کی جب شادی ہو گئی تو وہ اپنے شوہر کے ساتھ بہت خوش تھی میں بھی مطمئن تھا مگر باس جب میرے بہنوئی کی طبیعت خراب ہوئی اسے اپنڈکس کا درد اٹھا تھا تو وہ اسپتال میں داخل ہوا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر کرمانی اس کا آپریشن کرنے والا ہے۔ اور اس آپریشن کے کرنے میں اس کا کیا ارادہ ہے تو میں نے

ڈاکٹر کرمانی سے التجا کی اس مریض کا گردہ نہ نکالا جائے یہ میرا بہنوئی ہے لیکن ڈاکٹر کرمانی نے نہایت بے رحمی سے جواب دیا کہ وہ ایسا ضرور کرے گا کیونکہ اسے "مال" کی شدید ضرورت ہے۔ ڈیمانڈ ہو رہی ہے اور وہ ابھی تک کوئی بھی گردہ حاصل نہیں کر سکا ہے میری بہت التجا کے باوجود ڈاکٹر کرمانی نہیں مانا اور اس نے بجائے اپنڈکس کے آپریشن کے میرے بہنوئی کا گردہ نکال لیا اپنڈکس پھٹ گیا اور میرا بہنوئی آپریشن کے دوران مر گیا۔ بعد میں میں نے ڈاکٹر کرمانی سے ہاتھ پائی بھی کی کہ اس نے میرے بہنوئی کی جان کیوں لی میں نے اپنی بہن کو اسپتال میں تڑپ تڑپ کر روتے ہوئے دیکھا تھا غم سے میرا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔

تب ڈاکٹر کرمانی نے مجھ سے کہا۔ "جب ہم دوسروں کے ساتھ ایسا کرتے ہیں تو ان کے لواحقین پر بھی یہی سب گزرتی ہے۔ تمہیں کبھی کسی دوسرے پر رحم نہیں آیا آج اپنے دل پر چوٹ پڑی ہے تو تمہیں رشتہ داریاں یاد آ رہی ہیں۔ میں باس کے ساتھ غداری نہیں کر سکتا ہمیں جو بھی موقع ملے ہمیں اس سے فائدہ اٹھانے کا حکم ہے۔ ہمارے ہاں رشتہ داری اور محبتوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے اگر تمہیں ہمارے ساتھ کام کرنا ہے تو ہر چیز کو بھلانا ہوگا۔

میں کئی راتوں تک سو یا نہیں رہ رہ کر اپنی بہن کی صورت نگاہوں میں آ رہی تھی اس کی گود میں اس کا شیر خوار بچہ تھا میں کیسا بھائی تھا بھائی تو اپنی بہنوں کو خوشیاں دیتے ہیں۔ میں نے ہی اپنی بہن کے سر سے چادر کھینچ لی۔ اسے بے آسرا کر دیا وہ جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اپنی بہن کی خوشیوں کا قاتل ہوں اپنے بہنوئی کو اپنے ہاتھ سے میں نے قتل کر دیا ہے۔

سنی میرے ساتھ تھا وہ میری حالت دیکھ رہا تھا اس کے بے حد اصرار پر میں نے اسے اپنی ساری کہانی سنا دی اس نے مجھ سے صبر کرنے کے لیے کہا۔ مگر میں نے جواب دیا کہ ڈاکٹر کرمانی کی بات میرے دل کو لگ گئی ہے۔ ہم دوسروں کے ساتھ جب یہ ظلم کرتے ہیں تب ہمیں اس کا احساس نہیں ہوتا کہ ہم کتنے ظالم اور سفاک ہیں۔ درندگی کر رہے ہیں میں نے سنی سے کہا کہ ذرا سوچو سنی آج میرے ساتھ ایسا ہوا ہے کل تمہارے کسی اپنے کے ساتھ ایسا ہوگا تب تمہاری حالت بھی مجھ سے جدا نہیں ہوگی۔ تو سنی سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے ہی اس کو اکسایا تھا کہ ہم اس دھندے سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ تو سنی نے کہا کہ ہم کہیں بھی جائیں گے باس کے آدمی ہمیں ڈھونڈ نکالیں گے۔ تب دماغ میں ایک ترکیب آئی اور میں نے سوچا کہ بس ایک آخری جرم اور اس کے بعد..... اس کے بعد میں اور سنی یہ ملک ہی چھوڑ کے چلے جائیں گے۔

میں نے سوچا کے اپنا پرس کسی انجان شخص کی جیب میں ڈال دیتا ہوں۔ پھر اسے ختم کر کے اس کا چہرا بگاڑ دوں گا۔ میں نے ایک ایسے شخص کو تاڑ لیا۔ جو جسامت اور رنگت میں قدرے مجھ سے مشابہ تھا۔ میں نے اسٹیشن پر اس شخص کو دیکھا جو افراتفری میں ایک چھوٹا سا بیگ اٹھائے ٹرین کی جانب بھاگا جا رہا تھا۔ میں اسے ٹکرایا اور اپنا پرس اس کی جیب میں ڈال دیا مگر اس شخص نے یہ دیکھ لیا اور تیزی سے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام کر کہا۔

"بھائی صاحب آپ نے یہ پرس میری جیب میں کیوں ڈالا ہے۔ کہیں آپ نے کسی اور کا پرس تو نہیں اڑایا اور پولیس آپ کے پیچھے لگ گئی ہو تو آپ نے اپنی جان بچانے کے لیے یہ پرس میری جیب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں ڈال دیا براہِ مہربانی اسے لیتے جایئے۔'' یہ کہہ کر اس نے پرس میرے ہاتھ میں تھمایا اور جانے لگا تب میں نے بڑی لجاجت سے اسے پکارا تو وہ رک گیا اور استفساری نظروں سے میری جانب دیکھنے لگا۔

''دیکھیں یہ پرس میرا ہے اگر آپ کو یقین نہیں آرہا تو آپ اس میں میری تصویر اور شناختی کارڈ دیکھ سکتے ہیں۔ مگر اس پرس میں ایک بہت اہم چیز موجود ہے جس کو مجھ سے حاصل کرنے کے لیے کچھ لوگ میرے پیچھے پڑے ہیں۔ میں نے سوچا کہ آپ ٹرین میں جارہے ہیں۔ میں بھی اس ٹرین سے سفر کر رہا ہوں۔ اب اگر وہ لوگ میری تلاش بھی لیں گے تو انہیں یہ پرس نہیں ملے گا پھر ان کے جانے کے بعد میں آپ سے اپنا پرس واپس لے جاؤں گا۔''

''آپ سچ کہہ رہے ہیں۔'' اس نے مشکوک نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں ہاں آپ کو یقین نہیں آرہا تو آپ پرس کھول کر دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے پرس کھول کر اسے اپنا شناختی کارڈ دکھایا تو اس نے میرا پرس اپنی جیب میں رکھ لیا۔

میں نے اس شخص کو اپنی نگاہوں میں رکھا ہوا تھا۔ ہر اسٹیشن پر اتر کر وہ شخص مجھ سے میرا پرس واپس لینے کے لیے کہتا مگر میں اسے یہی جواب دیتا کہ ابھی وہ لوگ میرے پاس سے ہو کر نہیں گئے ہیں۔

میں موقع کی تلاش میں تھا کہ کب مجھے موقع ملے اور میں اس کا کام تمام کردوں۔ لیکن مجھے خود تو اسے مارنے کا موقع نہیں ملا البتہ قدرت کی جانب سے اس کا وقت پورا ہو چکا تھا ٹرین کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور ایکسیڈنٹ میں بھی میں تھوڑا سا زخمی ہوا تھا لیکن اس کے باوجود میں نے یہ اطمینان کر لیا تھا کہ وہ شخص بھی حادثے کا شکار ہو چکا ہے۔

میں جائے حادثہ سے تیزی سے غائب ہو گیا۔ میرا ارادہ کسی محفوظ ٹھکانہ تلاش کر کے سنی کو بلانا تھا۔ پھر میں نے اپنے ایک دور کے رشتہ دار کے پاس پناہ لی اور سنی کو فوری طور پر وہاں بلوا لیا ہم ابھی تک وہیں چھپے ہوئے تھے۔ ہماری ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی باہر نکلنے کی کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ ہماری تلاش نہایت زور و شور سے جاری ہے۔

اتنا کہہ کر سلطان خاموش ہو گیا اور تھوک نگل نگل کر اپنے خشک ہو جانے والے حلق کو تر کرنے لگا۔

''کیا کہا تم نے تم خاموشی سے اپنے کسی رشتہ دار کے گھر چھپے ہوئے تھے۔'' باس نے ایک بار پھر اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر کہا۔

''جی..... جی باس.....!'' اس نے سراسیمگی سے کہا۔

''میں نے کہا تھا ناں سلطان کہ میں صرف سچ سنوں گا پھر تم نے جھوٹ کیوں بولا.....''

باس نے سلطان کے قریب جا کر اس کے منہ پر ایک زوردار جھانپڑ رسید کیا اس کے لہجے میں شیر کی سی دہاڑ تھی۔

''میں سچ بول رہا ہوں باس.....!'' اس نے ممیائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''پھر جھوٹ..... پھر جھوٹ.....!'' باس نے اپنا سر زور زور سے جھٹکتے ہوئے کہا۔ پھر جابر سے مخاطب ہو کر بولا۔

''جابر تم ہی اپنی زبان میں اس سے پوچھو۔'' تو جابر اپنی کمر سے چمڑے کی بیلٹ کھولتا ہوا شعلہ بار نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے اس کے نزدیک آیا۔ بیلٹ کو پینٹ سے نکال کر اس نے ہاتھ سے جھٹکا دیا تو ایک شڑاک کی آواز فضا میں گونجی اور سلطان کے منہ سے عجیب سی آواز نکلی۔

''بکواس بند کرو..... سلطان.....!'' جابر نے ایک بار پھر بیلٹ کو فضا میں لہرایا۔

''جو کچھ تھا میں نے بالکل سچ سچ بتا دیا ہے۔'' اس نے جابر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔

''باس اب میں کیا کروں۔ جب یہ خود ہی اپنی دشمنی پر آمادہ ہے۔'' جابر نے کہا۔

''تمہاری بات مکمل ہو چکی ہے کچھ اور باقی ہے اگر تو اب بھی بتا دو۔'' باس نے کہا تو سلطان نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''ٹھیک ہے.....!'' باس نے اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ رکھی اور جیب سے سگار نکال کر سلگا کر ہونٹوں سے لگایا اور ایک طویل کش لیتے ہوئے جابر سے کہا۔

''جو سچ یہ ہم سے چھپا رہا ہے تم اسے بتا دو۔''

''تم سیدھے اذلان شاہ کے پاس پہنچے اور اسے بتایا کہ تم نے آغا قزلباش کی تنظیم کو چھوڑ دیا ہے اور تم اس کے ساتھ رہنا چاہتے ہو تم نے نہ صرف اذلان شاہ کو ہمارے قیمتی راز دیے بلکہ پولیس کو بھی خفیہ طریقے سے ہمارے کاروبار کے بارے میں انفارم کیا جس کے نتیجے میں پولیس نے ڈاکٹر کرمانی کو اریسٹ کیا اور بنگلے پر ریڈ کیا۔ اذلان شاہ کے لوگوں سے تمہارا ملنا جلنا پچھلے دو ماہ سے تھا تم یہ سوچ کر بے فکر ہو گئے تھے کہ ٹرین میں اس شخص کی لاش کو ہم تمہاری لاش سمجھ کر خاموش ہو کر بیٹھ جائیں گے مگر دیکھ لو تمہارا بھانڈہ کس طرح سے پھوٹا۔

جس طرح سے تم ایک مردہ جسم کو اپنی شناخت دینا چاہتے تھے اسی طرح ایک اور شخص کو بھی اپنی شناخت بدلنے کے لیے ایک مردہ جسم کی ضرورت تھی اور دیکھو اس شخص کو بھی وہی ایک شخص ملا اور اس نے تمہارا پرس مردہ شخص کی جیب سے اس شخص کا پرس سمجھ کر نکال لیا اور اپنی تمام شناختی علامات اس کے لباس میں منتقل کر دیں اور تمہارے بارے میں یہ ساری معلومات ہمیں اذلان شاہ کے ایک ''پالتو کتے'' نے دی ہیں۔ جیسے تم غدار ویسے ہی وہ بھی اذلان شاہ سے غداری کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ رہتے ہوئے ہمارا کام کر رہا ہے۔ اب بولو تم کیا کہتے ہو۔'' جابر نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر سلطان کے سامنے کہا تو سلطان زمین پر گر کر لوٹنے لگا۔ پھر گھسٹ گھسٹ کر باس کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ رو رہا تھا گڑگڑا رہا تھا کہ اسے معاف کر دیا جائے۔

باس نے چنگھاڑتے ہوئے انداز میں ایک زوردار آواز لگائی۔

''گلزار.....!''

''یس باس!'' وہ ایک قدم آگے بڑھ کر بولا۔

''میرے کتے کتنے دنوں سے بھوکے ہیں۔'' اس نے خوفناک لہجے میں کہا۔

''دو دن ہو گئے ہیں باس آپ کا حکم تھا کہ انہیں خوراک نہ دی جائے۔ وہ اپنے پنجرے میں بہت بے قرار ہیں۔'' گلزار نے سلطان اور سنی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''ان کے پنجرے یہاں لائے جائیں۔'' باس نے گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے کہا۔

''رحم کریں باس، رحم کریں۔ میں نے آپ کی بہت خدمت کی ہے۔ آپ کو بہت مال کما کر دیا ہے۔ باس.....!'' سلطان بری طرح گڑگڑا رہا تھا زمین پر پڑا اس کے قدموں میں اپنا ماتھا رگڑ رہا تھا۔

میں یہ ساری کارروائی سانس روکے دیکھ رہا تھا۔ شکل و صورت اور اپنے ظاہری حلیے سے قزلباش جتنا ڈیسنٹ اور ایجوکیٹڈ دکھائی دیتا تھا اندر سے بالکل جانور کی مانند تھا۔ اپنے مفاد کے لیے سب کچھ کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گزرنے والا انسان کی اس کی نگاہ میں انسانی جان کی کوئی ویلیو نہیں ہے اس نے سلطان کے لیے کتنی درد ناک موت تجویز کی تھی۔ دو دن سے بھوکے کتوں کا پنجرہ یہاں لایا جا رہا تھا اور اب سلطان اور سنی کو ان بھوکے کتوں کے آگے ڈالا جانے والا تھا۔

باس پر سلطان کی آہ و بکا کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اس طرح بیٹھا تھا جیسے اس کے کانوں میں کوئی آواز نہیں آ رہی ہو۔ میں نے راجہ کی جانب دیکھا۔ وہ بہت دلچسپی کے ساتھ یہ منظر دیکھ رہا تھا جعفر اور کلیم کے چہروں پر بھی مجھے وحشت دکھائی دی کنیز کے جسم کی لرزاہٹ میں نے خود محسوس کی اس نے سختی کے ساتھ میرا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ لیکن مجھے مینا کو دیکھ کر بے حد حیرت ہو رہی تھی اس کے چہرے پر کسی بھی قسم کا خوف یا گھبراہٹ نہیں تھی بلکہ اس کی جگہ جابر اور باس کی طرح اس کی آنکھوں میں سلطان کے لیے انتہائی نفرت اور غصہ تھا اور پھر پہیوں کے پھسلنے کی گڑ گڑاہٹ اور کتوں کے بھونکنے کی آوازوں پر سب کی نگاہیں ہال کے اندرونی دروازے کی جانب اٹھ گئیں اور پھر گلزار اور دلبر کتوں کے اس پنجرے کے ساتھ ہال میں داخل ہوئے۔ ہال کے وسط میں پنجرے کو لا کر گلزار اور دلبر رک گئے۔ لوہے کے اس بڑے سے پنجرے میں تین عدد خوف ناک جبڑوں والے کتے تھے۔ جو بڑی بے چینی اور بے قراری کے ساتھ پنجرے میں اِدھر سے اُدھر اچھل کود رہے تھے اور غرا رہے تھے۔

گلزار نے باس کی سمت دیکھا گویا پوچھ رہا ہو "کیا حکم ہے میرے آقا"

"ڈال دو اس کو ہمارے ان بھوکے کتوں کے سامنے اس غدار سے زیادہ تو یہ جانور ہمارے وفادار ہیں۔ تو پھر ان کی وفاداری کے انعام کے طور پر سلطان کو اس کی غداری کی سزا کے طور پر اس پنجرے کو کھول دو.....!" باس نے کہا تو گلزار نے پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔ تینوں کتے تیزی کے ساتھ پنجرے سے باہر نکل آئے اور سیدھے باس کے پاس پہنچ کر اس کے گرد تیزی سے گھومتے ہوئے غوں غوں کرنے لگے۔ باس نے ان کی گردنوں کو سہلایا تو ان کی آواز مزید مدھم ہو گئی۔ مگر ان کی بے چینی کم نہیں ہو رہی تھی۔ بھوک کی شدت نے انہیں بے قرار کر رکھا تھا۔ وہ تیزی سے اس کے گرد گھوم رہے تھے اور منہ اوپر اٹھا اٹھا کر اس کی جانب التجا آمیز نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ سلطان کی آواز بالکل ہی خاموش ہو گئی ہے۔ شاید اپنے بھیانک انجام کے خوف سے وہ بے ہوش ہو چکا تھا جب کہ مسلسل خاموش سی گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا۔ اس کی گردن بھی جھکی ہوئی تھی۔

"اٹیک ہم.....!" باس نے سلطان کی جانب اشارہ کر کے زور سے کہا۔

باس کا اتنا کہنا تھا کہ تینوں کتے سلطان کے جسم پر ہل پڑے ایک اچھل اچھل کر سنی کے جسم کو بھنبھوڑ رہا تھا اس کے خوفناک جبڑے سلطان کے جسم سے گوشت نوچ رہے تھے۔ سلطان کے جسم پر پھڑ پھڑاہٹ طاری ہو گئی اس کی دردناک اور فلک شگاف چیخوں کو سن کو میرا جسم بھی کانپ اٹھا۔ کنیز نے میرے ہاتھ پر اپنی گرفت مزید مضبوط کر لی اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور وہ باقاعدہ کانپ رہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے سلطان اور سنی کا پھڑکتا ہوا جسم ساکت ہو گیا۔ ان کی روحیں قفس عنصری سے پرواز کر گئیں۔ کتے دعوت اڑانے میں مصروف تھے۔ تب باس نے تیزی کے ساتھ سیڑھیوں کی جانب قدم

بڑھاتے ہوئے ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

میں بھی جانے کے لیے مڑا تب میں نے کنیز کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہوئے دیکھے۔ جنہیں اس نے تیزی کے ساتھ صاف کیا۔ واپس جاتے ہوئے ہمارے قدموں میں لرزش تھی۔

سیڑھیاں عبور کر کے ہم اس زمین دوز ہال سے باہر آ گئے اور اس کمرے میں آ گئے جہاں ہم کچھ دیر پہلے بیٹھے تھے۔

باس ایک سوفے پر بیٹھ گیا تو ہم سب بھی بیٹھ گئے۔ باس کے چہرے پر خاصا تناؤ اور گمبھیر سنجیدگی تھی۔ اس نے ایک طائرانہ نگاہ ہم سب کے چہروں پر ڈالی پھر کنیز کی حالت دیکھ کر بولا۔

"اس کو پانی پلاؤ"

مینا اس کے لیے گلاس میں پانی لے آئی جو اس نے ایک ہی سانس میں پی لیا۔

"ٹیک اٹ ایزی بی بی!" اس نے اس طرح کہا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو اور وہ خوامخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ پھر بولا۔

"آج کا منظر تم سب کو دکھانے کا میرا مقصد یہی تھا کہ آپ سب اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ تم کہیں بھی کچھ بھی گڑبڑ کرو گے میری آنکھیں اسے دیکھ لیں گی۔ میری یہ دو آنکھیں جو ہر دم میرے ساتھ رہتی ہیں اور انہیں میں سوتے میں بھی کھلی رکھتا ہوں۔ کیونکہ بہت سی دوسری آنکھیں ہر وقت تمہاری نگرانی کر رہی ہوتی ہیں۔ میں کیونکہ تمہارے کام کا معاوضہ دینے میں بھی کوئی کوتاہی نہیں کرتا اس لیے میں بھی یہی چاہوں گا کہ کوئی مجھے بھول کر ڈبل کراس کرنے کی غلطی نہ کرے اور اگر کی.....!" اس نے ایک گہری سانس لے کر چند لمحے توقف کیا پھر بولا۔

"تو سزا اس سے زیادہ بھی بھیانک ہو سکتی ہے۔" پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"تم اپنے بارے میں کیا کہتے ہو تمہاری ٹریننگ کمپلیٹ ہو گئی میں تمہارے بارے میں مسٹر لی چاؤ سے معلوم کرتا رہتا ہوں انہوں نے بتایا ہے کہ تم نے اپنی ٹریننگ مکمل کر لی ہے۔ کیا خیال ہے اگر تم ذہنی طور پر تیار ہو تو ایک چھوٹا سا ٹیسٹ ہو جائے۔"

"ضرور سر! میں تیار ہوں۔ اچھا ہے اس ٹیسٹ سے مجھے بھی اپنے بارے میں معلوم ہو جائے گا کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔" میں نے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے ابھی دلبر اور گلزار فارغ ہو کر آ جائیں تو ہم تمہیں بھی دیکھ لیں گے۔" اس نے کہا پھر بولا۔

"تم لوگ چاہو تو باہر لان میں جا کر تازہ ہوا سے اپنے آپ کو فریش کر لو میں تمہیں بلوا لوں گا۔"

اسے شاید راجہ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہوں گی۔ اس لیے اس نے ہمیں باہر جانے کے لیے کہا تو ہم سب اٹھ کر باہر لان میں آ گئے۔

"شمروز کیا واقعی تم باس کے سامنے ٹیسٹ کے لیے تیار ہو تم گلزار اور دلبر کو نہیں جانتے بڑے زبردست اور غضب کے فائٹر ہیں۔" جعفر نے باہر آتے ہی مجھ سے کہا۔

"اگر وہ ماہر ہیں تو میں بھی گزشتہ ڈھائی ماہ سے گھاس نہیں کھود رہا تھا کچھ تو مجھے بھی اپنی صلاحیتوں کے بارے میں علم ہو۔" میں نے بے خوفی سے کہا۔

"سوچ لو یار بے عزتی مت کروا دینا۔" وہ بولا۔

"اللہ مالک ہے۔" میں نے کہا۔

کنیز ابھی تک خاموش بیٹھی تھی اس کے چہرے کی رنگت زرد ہو رہی تھی میں ٹہلتا ہوا اس کے نزدیک چلا گیا اور اس کا ہاتھ تھام کر اس کی ہتھیلی کی پشت سہلانے لگا میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تسلی دی کہ فی الحال ہم زبانی گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔

"قزلباش ان کتوں سے بھی بڑا ظالم درندہ ہے۔" اس نے ایک جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

"پلیز خاموش رہو۔" میں نے سرگوشی میں کہا پھر ہم لان میں ٹہلنے لگے ہم دو دو کی ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ جعفر اور کلیم ساتھ تھے اور آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے جابر اور مینا ساتھ تھے وہ کبھی آپس میں ایک بات کر لیتے پھر خاموش ہو جاتے اور میں کنیز کے ساتھ تھا۔ وہ خاموش تھی بس اپنے اندر کے خوف پر قابو پانے کے لیے کبھی کسی پودے کی ٹہنی توڑ دیتی اور اس سے پتے علیحدہ کرنے لگتی اچانک ہی جب وہ گلاب کے پودے کی پتی توڑنے کی کوشش کر رہی تھی تب ہی ایک کانٹا اس کی انگلی میں پیوست ہو گیا اس کے منہ سے ایک "سی" کی آواز نکلی۔

"کیا ہوا؟" میں نے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھام لیا۔ تو وہ حیرت زدہ نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے فوراً ہی اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور تب ہی میری نگاہ دور کھڑی مینا پر پڑی وہ ہماری جانب ہی دیکھ رہی تھی۔ مجھ سے نگاہیں ملیں تو وہ ٹہلنے کے انداز میں چلتی ہوئی ہمارے نزدیک آ گئی اور طنزیہ مسکراہٹ سے بولی۔

"کیا بات ہے کنیز کی بڑی ناز برداری ہو رہی ہے۔"

"ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ دراصل اس سارے منظر سے یہ بہت خوف زدہ ہو گئی تھی۔ میں تو بس اسے ریلیکس کر رہا تھا۔" میں خوامخواہ ہی صفائی پیش کی۔

"شاید یہ اس لیے ہوا ہو کہ یہ باس کی سنگ دلی سے اچھی طرح واقف ہے کیونکہ اس کے ساتھ بھی تو.....!" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کنیز کی جانب دیکھنے لگی۔ کنیز نے اپنا رخ دوسری جانب پھیر لیا اس کی آنکھیں پھر ڈبڈبا گئیں۔

"شاید اس نے تمہیں اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔" اس نے کہا پھر کنیز کو مخاطب کیا۔ "کیوں کنیز.....!"

"بھئی میں نے تو یہ سب دیکھا ہے مگر میں تو نارمل ہوں اگر کوئی برائی کرے گا تو اس کی سزا تو اسے ملے گی ہی۔ تم خود ہی سوچو ایک سلطان کی غداری کی وجہ سے نہ صرف باس کو نقصان پہنچا بلکہ ہم سب کی زندگیاں بھی خطرے میں پڑ گئی تھیں اچھا ہوا خس کم جہاں پاک.....!"

مینا نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے پر مار کر جھاڑتے ہوئے کہا اور میں حیرانی سے اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

ہمیں یہاں ٹہلتے ہوئے آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا تب ہی جابر کے موبائل پر کال آئی اس نے نمبر دیکھا اور فوراً فون ریسیو کر لیا۔

"او کے باس وی آر کم اِنگ.....!" اس نے کہا پھر ہم سب سے کہا کہ باس نے ہمیں اندر بلایا ہے تو ہم سب اندر چلے گئے۔

ٹیبل پر چائے اور دوسرے لوازمات سجے رکھے تھے باس نے ہم سب سے کہا کہ "آپ لوگ چائے وغیرہ پی کر فارغ ہو جائیں۔ گلزار اور دلبر بھی آنے والے ہیں۔ پھر ہم شموز اور دلبر کے درمیان ہونے والا دوستانہ مقابلہ دیکھیں گے۔"

سب نے صرف چائے پر ہی اکتفا کیا۔ شاید سب ہی کے دل بوجھل سے ہو رہے تھے۔ اس لیے کسی نے کسی بھی کھانے کی شے کو ہاتھ نہیں لگایا البتہ باس اور راجہ نے اپنی پلیٹوں پر تھوڑا بہت سامان ڈال لیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔

"تم لوگ تیار ہو تو ہو جائے مقابلہ.....!" باس نے باری باری ہم لوگوں کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ تو ہم سب کے منہ سے ایک ساتھ "جی" نکل گیا۔

"دلبر تم ذرا شمروز کا ٹیسٹ لو گے پہلے.....!" اس نے دلبر کو مخاطب کیا۔

"ایز یو وش باس!" اس نے سر کو خم دیتے ہوئے کہا اور ہم سب اٹھ کر باہر لان میں آ گئے۔ میں نے جینز کی پینٹ اور ٹی شرٹ کے اوپر لیدر کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں جو گرز تھے ایسا ہی لباس دلبر نے بھی پہنا ہوا تھا۔

لان میں باس اور راجہ اور دوسرے ساتھیوں کے لیے کرسیاں بچھا دیں گئی تھیں۔ وہ سب ان کرسیوں پر بیٹھ گئے میں نے اپنی جیکٹ اتار کر ایک خالی کرسی پر رکھ دی۔

میرے ساتھی جعفر کلیم جابر کنیز اور مینا کے ساتھ ساتھ راجہ کے چہروں پر دبا دبا سا جوش دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن باس کے چہرے پر اس وقت گمبھیر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہیں کسی ایک نکتے پر مرکوز تھیں اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

میں نے اس مقابلے کے ذریعے یہ ثابت کرنا تھا کہ میرے سامنے کتنا ہی بڑا سورما کیوں نہ آ جائے میں اسے بناء کسی ہتھیار کے اسے زیر کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہوں۔ میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ چاہے دلبر سے مقابلہ کرتے ہوئے میرے ہاتھوں اس کی جان ہی چلی جائے تو مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

ہم آمنے سامنے کھڑے ہوئے اور ایک دوسرے کو نگاہوں ہی نگاہوں میں تول رہے تھے۔ ہماری نگاہیں باس کی جانب اٹھیں کیونکہ ہمیں مقابلہ شروع کرنے کے لیے اس کی اجازت چاہیے تھی۔

باس کی جانب نگاہ اٹھی تو میں نے اسے اپنی جانب متوجہ پایا میں نے اور دلبر نے سر کے اشارے سے اس سے اجازت طلب کی تو اس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ کا اشارہ کر دیا گویا ہم مقابلہ شروع کر سکتے ہیں۔ وہاں موجود ساتھیوں نے تالیاں بجا کر ہماری حوصلہ افزائی کی۔

میرے جاپانی استاد نے مجھے جو جو داؤ پیچ سکھائے تھے جو جو ہدایات دی تھیں وہ سب میرے ذہن میں ازبر تھیں۔

دلبر نے میری جانب طنزیہ نگاہوں سے دیکھا پھر ہونٹ سکیڑتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ شاید مجھے حملہ کرنے کے لیے اکسا رہا تھا اور دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر اور ٹانگیں چوڑی کر کے کھڑا تھا۔ میں نے ایک لمحہ کی غفلت کا فائدہ اٹھایا اور تیزی کے ساتھ آگے اچھل کر اس کی ٹانگوں پر ایک زور دار ٹھوکر ماری۔ میرے اس غیر متوقع اور اچانک حملے سے دلبر کے منہ سے ایک اضطراری چیخ نکل گئی۔

میں نے اس پر بھی بس نہیں کیا۔ دلبر لڑکھڑا کر جیسے ہی چند قدم پیچھے ہٹا میں نے تیزی سے اس کے اوپر سے چھلانگ لگائی اور اس کی پشت پر آ گیا۔ دلبر چیتے کی سی پھرتی کے ساتھ میری جانب گھوم گیا اور اس نے ایک زوردار پنچ میرے منہ پر مارا۔

میں چکرا کر تھوڑا نیچے جھکا اور جھکے جھکے ہی اس کی پھیلی ہوئی ٹانگوں کے درمیان سے نکل کر اس کی پشت پر پہنچ گیا اور اگلے ہی لمحے میں نے بڑی سفاکی سے اس کے کولہوں کے درمیان کی ہڈی پر ایک اور زوردار ٹھوکر ماری۔

دلبر ناچ کر رہ گیا۔ اس نے سنبھلنا چاہا لیکن میری مسلسل تیسری ٹھوکر نے اسے لان کی گھاس پر منہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مارنے پر مجبور کردیا۔ چوتھی اور آخری ٹھوکر نے اس کے جبڑے پر ماری اس کے منہ سے خون کا فوارہ نکل گیا۔ میں اس پر مسلسل حملے کررہا تھا۔

دلبر نے تیزی کے ساتھ میری ٹانگ پکڑ لی اور اسے بے دردی کے ساتھ موڑ دیا۔ مگر میرے استاد نے مجھے اس قسم کے حملوں سے بچاؤ کے داؤ بھی سکھائے ہوئے تھے۔ میں ٹانگ کے ساتھ ساتھ خود بھی تیزی سے پورا کا پورا گھوم گیا نتیجتاً دلبر کو میری ایک دو ٹھوکریں اور برداشت کرنی پڑیں۔ دلبر نہیں ہارا تھا۔ کسی نہ کسی طرح وہ فرش سے اٹھا تو میں نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اسے پوری طرح بے بس کردیا۔ دلبر اپنے حلق سے آواز تک نہ نکال سکا۔

چند لمحوں کے بعد دلبر نے اپنا ہاتھ پیچھے سے لاکر میرے سر کے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا اور اپنا پاؤں موڑ کر میرے گھٹنے پر ٹھوکر مارنے کی کوشش کی۔ یہ داؤ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے۔ جب آپ کی گردن مخالف کے شکنجے میں ہو۔

کیونکہ میں اس داؤ سے واقف تھا۔ اس لیے دلبر کی جوابی کارروائی سے بھی واقف تھا۔ اس لیے جیسے ہی اس نے اپنا گھٹنا موڑا میں اپنے آپ کو صاف بچا گیا۔ کچھ لمحے ہی باقی تھے کہ میں پوری طرح پوزیشن میں آ گیا کہ دلبر کی گردن اپنے ہاتھوں سے مروڑ کر اس کا چہرہ دوسری جانب گھما دیا دلبر نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ گویا اس نے میرے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے باس نے بھی ہاتھ اٹھا کر زوردار آواز میں کہا۔

"اسٹاپ" تو میں نے دلبر کی گردن چھوڑ دی۔

دلبر لڑکھڑاتا ہوا چند قدم آگے بڑھا اور اپنی گردن زور زور سے مسلنے لگا پھر اس نے اپنے سر کو دو تین جھٹکے دیے اپنی ٹانگوں کو جھٹکا اور میری جانب پلٹا اس نے دوستانہ انداز میں ہاتھ ملانے کے لیے بڑھایا تو میں نے اس ہاتھ تھام لیا۔ دلبر کا سانس پھول رہا تھا۔ جب کہ میرے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ مجھے خود پر یقین نہیں آرہا تھا کہ میں نے اتنی آسانی سے دلبر جیسے سانڈ پر منٹوں میں قابو پالیا۔

"یار! اگر میں ہاتھ اوپر اٹھا کر اپنی ہار نہ مانتا تو میری گردن ہی توڑ ڈالتے.....!" اس نے اپنے بھدے اور موٹے ہونٹوں کو مسکرانے کی کوشش میں پھیلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں! میں ایسا تو نہیں کرتا البتہ جیسا میں چاہتا تھا تم نے ویسا ہی کیا۔ آئی ایم سوری اگر تمہیں چوٹ لگی ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اٹس اوکے!" دلبر نے کہا اور ہم دونوں باس کی جانب مڑ کے سینے پر ہاتھ رکھ کر قدرے جھک گئے۔

اور پھر جیسے سب لوگ ہوش میں آ گئے اور تالیاں بجانے لگے سب سے زیادہ پُرجوش انداز میں کنیز تالیاں بجا رہی تھی اس کے چہرے کی خوشی دیدنی تھی۔

باس اپنی جگہ سے تالی بجاتے بجاتے کھڑے ہو گئے اور میرے قریب آ گئے اور میرے کندھے کو مضبوطی سے تھام کر پُرمسرت لہجے میں کہا۔

"ویل ڈن شمروز..... تم نے ثابت کردیا ہے کہ تم ناقابل شکست ہو تم نے دلبر جیسے ماہر فائٹر پر اتنی جلدی قابو پالیا۔ تمہارا اسٹمنا اور تمہاری پھرتی قابل دید ہے۔ میں تم سے واقعی متاثر ہوا ہوں۔ آج سے تم میرے قریبی ساتھیوں میں شامل ہو۔"

"تھینک یو باس! یہ سب آپ کی مہربانیوں کا نتیجہ ہے آپ ہی کی نظر کرم سے میں آج اس قابل ہو سکا ہوں۔" میں نے انکساری سے کہا۔

"ہم نے تو صرف تمہارا ہاتھ تھاما ہے باقی ساری محنت اور کمال تو تمہارا اپنا ہی ہے۔" باس نے میرے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

پھر سب نے آگے بڑھ کر مجھے یہ مقابلہ جیتنے کی اور اپنے آپ کو ان لوگوں کا اصلی ساتھی کی اہلیت ثابت کرنے پر مبارک باد دی

دلبر خاصا زخمی ہو گیا تھا اس کے مقابلے میں مجھے کم تکلیف اٹھانی پڑی تھی دلبر کے ایک مکے سے جو اس نے میرے جبڑے پر مارا تھا اندر سے میرا گال پھٹ گیا اور منہ سے خون نکل آیا تھا۔

"چلو تم لوگ اپنے اپنے زخموں پر دوا وغیرہ لگا لو۔" باس نے میرا ہاتھ تھام کر اندر کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے پتا ہے کہ مجھے کیا دوا لینی ہے یہاں سے جاتے ہوئے کسی میڈیکل اسٹور سے لے لوں گا۔" میں نے کہا۔

"ہاں تمہارے جبڑے کے پاس ذرا سی سوجن آ گئی ہے۔" باس نے بغور میرے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"سب لوگ مجھے دیکھ رہے ہیں جب کہ دلبر مجھ سے زیادہ زخمی ہے میں اسے دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں دلبر کی جانب متوجہ ہوا اور پھر اسے کچھ دوائیں لکھ کردے دیں۔ میں نے اپنے لیے بھی دوا لکھی باس نے دوا کا پرچہ میرے ہاتھ سے لے کر گلزار کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"فوراً یہ دوائیں منگوالو۔" گلزار نے پرچہ لیا اور سر کو ہلکا سا خم دے کر اوکے کہہ کر چلا گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد گلزار میری مطلوبہ دوائیں لے کر آ گیا۔ میں نے دوا خود بھی استعمال کی اور دلبر کو بھی دی۔ دوائیں کھا کر دلبر باس کی اجازت سے وہاں سے چلا گیا۔ وہ کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا میں نے اسے پین کلر اور سکون آور دوائیں بھی دی تھیں۔ جس کے استعمال سے نیند آنا لازمی تھا۔

غزل

کون کہتا ہے کہ موت آئے گی تو میں مر جاؤں گا
میں تو پیار ہوں وفا کے سینے میں اتر جاؤں گا
یہ دل تو کیا یہ جان بھی کوئی چیز نہیں
مر کر بھی میں حق محبت ادا کر جاؤں گا
میں پھیلاؤں گا پیغام محبت کا جہاں تک پھیلے
محبت کو دے کر خون اپنا میں، خود کو امر کر جاؤں گا
خوشیاں ہوں ہر جگہ اور غم کہیں نہ ملیں
زندگی کا یہ رخ میں سب پر عیاں کر جاؤں گا
محبت ہے مقدس، کوئی اس کی عصمت سے نہ کھیلے
تقدیس محبت میں، میں ہر حد سے گزر جاؤں گا
ملی جو مجھے کبھی مجسم صورت میں محبت کی دیوی
گروں گا سجدے میں اور کفر کر جاؤں گا
محبت کے سفر میں ہو گی جب مجھ سے کوئی خطا
سزا کے طور پر دوں گا خود کو اذیت اور خود پہ ہی ستم کر جاؤں گا
میں ہوں وفا کے گہرے سمندر کا تنہا ساحل
اور درد کی ہر لہر پر میں صبر کر جاؤں گا

(سہیل عمران ساحل، کہروڑ پکا)

پھر باس اور راجہ کے درمیان کوئی بات چیت ہوئی۔ راجہ نے اٹھ کر ہم سب سے ہاتھ ملایا اور وہ بھی رخصت ہو گیا اس کے جانے کے بعد باس نے میری جانب توجہ دی اور بولا۔

"شمروز! آج تم پوری طرح ایک ڈاکٹر شاہ زمان سے تبدیل ہو کر شمروز کے روپ میں آ گئے ہو میں نے تمہیں اپنے ساتھ شامل کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے لیکن.....!" وہ چند لمحوں کے لیے رکا پھر اس نے وہاں موجود تمام لوگوں کے چہروں کا جائزہ لیا اور ایک گہری سانس لی سب لوگ خاموشی سے باس کی جانب دیکھ رہے تھے کہ اس "لیکن" کے پیچھے کیا چھپا ہے۔

"تمہیں ہمارے ساتھ اپنی وفاداری کو ثابت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنا ہوگا؟'' یہ کہہ کر وہ پھر رک گیا اور غور سے میرے چہرے کی جانب دیکھنے لگا' ان کی تیز نگاہیں مجھے کسی برچھی کی مانند اپنے اندر اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

''میں کس طرح اپنی وفاداری ثابت کرسکتا ہوں باس؟'' میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''ہوں.....!'' اس نے پُرسوچ انداز میں ہنکاری بھری اور اپنی جگہ سے اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے نزدیک آ کر کھڑا ہوگیا تو میں بھی کھڑا ہوگیا۔ باقی سب لوگ اپنی اپنی جگہ خاموشی سے بیٹھے رہے۔

''اونہیں بھئی..... تم بیٹھو!'' اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر زور دیتے ہوئے مجھے دوبارہ بٹھادیا۔ اس کا لہجہ نرم تھا مگر نہ جانے کیوں مجھے اس کے نرم لہجے میں بھی بہت کچھ محسوس ہو رہا تھا۔

''میں تمہیں ایک بندے کا ایڈریس دے رہا ہوں' تمہیں اسے قتل کرنا ہے اور اس کام کے لیے تمہارے پاس صرف ایک دن ہے.....!'' اس کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔

''قتل.....!'' میرے خیر زدہ لبوں سے نکلا۔

''ہاں قتل!'' اس نے اس طرح کہا گویا اس نے مجھ سے کہا ہو ''جاؤ اپنے ہاتھ دھو کر آجاؤ۔''

''تمہیں تو بڑے بڑے لوگوں کو مارنا ہے ناں..... اور ان کو قتل کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو جب وہ تمہارے سامنے ہوں اور تمہیں انہیں اگلے جہاں پہنچانا ہو تو تمہارے ہاتھ کانپ جائیں' کیوں کہ اس سے پہلے تم نے کبھی ایسا کام بھی نہیں کیا ہوگا ناں.....! تو جسٹ ریلیکس' تمہیں دو چار بندوں کو لڑھکا کر اپنا ہاتھ بھی صاف اور رواں کرلینا چاہیے۔'' اپنی بات مکمل کرکے وہ ایک شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ میری جانب دیکھنے لگا' لیکن میں بالکل خاموش تھا' میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تو وہ وہاں بیٹھے دوسرے ساتھیوں کی جانب مڑا اور بولا۔ ''کیا خیال ہے تم سب کا..... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔'' اس نے جواب طلب نگاہوں سے ان سب کی جانب دیکھا' تو سب سے پہلے جابر بولا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں باس..... آپ ہمیشہ دانش مندانہ فیصلے کرتے ہیں۔ بالکل ایسا ہی ہوگا کہ اچانک اگر شموز کے دشمن اس کے سامنے آ گئے تو یہ کچھ نہیں کرسکے گا۔''

''ویسے بھی یہ ایک ڈاکٹر تھا اور ڈاکٹر کے ہاتھ تو ہمیشہ زندگی دیتے ہیں' لیتے نہیں۔ آج یہ شموز بنا ہے تو اسے پوری طرح بننا ہوگا۔''

جابر خاموش ہوا تو باس نے باری باری سب کی رائے لی اور چاہے مردہ دلی سے ہی' سب نے اس کی بات کی حمایت کی۔

''ٹھیک ہے باس میں تیار ہوں۔ آپ مجھے اس شخص کا ایڈریس اور تصویر دے دیں۔'' میں نے خود اعتمادی سے کہا' میں جابر اور باس کا طعنہ سن کر تپ گیا تھا' ویسے بھی میں پٹھان دماغ تھا' فوراً گرم ہوجاتا تھا۔

''گڈ!'' باس نے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور واپس جا کر اپنی نشست سنبھال لی' میری نگاہ کنیز کی جانب اٹھی' ان نگاہوں میں بے چارگی تھی ایک التجا تھی۔ جیسے وہ مجھے ایسا کرنے سے روکنا چاہ رہی ہو۔

(ان شاءاللہ باقی آئندہ ماہ)

زرگزیدہ

جناب عمران احمد!
السّلام علیکم'
ایک نئی تفتیشی کہانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ یہ کہانی ایک ایسے ناخلف بیٹے کی ہے جس کی آنکھوں پر دولت نے پٹی باندھ دی تھی اور وہ اچھے برے کی تمیز کھو چکا تھا اس کا خیال تھا کہ دولت اس کے سارے عیبوں اور جرائم پر پردہ ڈال دے گی۔ مگر وہ یہ حقیقت فراموش کر بیٹھا تھا کہ قانون کو اگر کسی ایماندار اہلکار کے پیر مل جائیں تو وہ پاتال تک ملزم کا تعاقب کرتا ہے۔
امید ہے قارئین اس سچ بیانی کو ضرور پسند کریں گے۔

والسّلام
ریاض بٹ
حسن ابدال

صبح سے مطلع اَبر آلود تھا۔ اس علاقے میں سردیوں میں سخت سردی پڑتی تھی اور خون رگوں میں جمتا محسوس ہوتا تھا۔

میرے لیے ایک بات باعث اطمینان تھی کہ میری سفارش پر سلطان محمود کو بھی اس نئے تھانے میں ٹرانسفر کردیا گیا تھا۔ ہمیں اس تھانے میں آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔

باقی عملے میں ایک اے ایس آئی رانا تنویر تین حوالدار' ایک ہیڈ کانسٹیبل دس سپاہی اور ایک محرر زاہد بزمی بھی تھا۔ اس نے اپنا تخلص بزمی رکھا ہوا تھا اور یہ بندہ شعر بھی کہتا تھا۔

بہر حال اتنی نفری سے ہی مجھے تھانہ چلانا تھا بلکہ دوڑانا تھا۔

اچانک بارش شروع ہوگئی ایک سپاہی نے کوئلوں والی انگیٹھی جلا کر میرے پاس رکھ دی۔ سلطان محمود کے علاوہ باقی سارا عملہ فی الحال میرے لیے نیا ہی تھا۔

اب ذرا آپ کو تھانے کے محلِ وقوع سے آگاہ کردوں۔ ہمارے تھانے کی حدود میں چھ گاؤں ایک قصبہ اور شہر کا تھوڑا سا یہ حصہ آتا تھا جہاں پر ہمارا تھانہ تھا۔

دوپہر تک بارش رک گئی۔ میں لنچ کر چکا تھا اور اب اے ایس آئی کے ساتھ کافی کا دُور چل رہا تھا جیسا کہ آپ کے علم میں ہے میں چائے کا عادی ہوں۔ لیکن اس علاقے میں کافی کے بغیر گزارا مشکل تھا۔

اچانک محرر زاہد اندر داخل ہوا اور مجھے سلوٹ کر کے گویا ہوا۔

''سر! گاؤں کے چھوٹے ملک صاحب آپ سے ملنے کے خواہش مند ہیں۔ ان کے ساتھ دو باڈی گارڈ بھی ہیں۔''

''دیکھو زاہد! گارڈوں کو باہر ہی روکو اور چھوٹے ملک صاحب کو ادھر بھیج دو۔ ذرا دیکھیں تو سہی اس ٹھنڈے ٹھار موسم میں اس کو ہمارے ساتھ کون سا کام پڑ گیا ہے؟''

چند لمحوں بعد چھوٹے ملک صاحب ہمارے سامنے تھے۔ کافی خوب صورت اور مضبوط کاٹھی کا جوان تھا۔ قد چھ فٹ سے ذرا ہی کم ہوگا۔ گرم ٹوپی اور گرم واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔

ہم نے اسے عزت سے بٹھایا اور کافی کا ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کپ اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ چہرے سے پریشان لگتا تھا۔

کافی پینے کے دوران اس نے ہمیں بتایا کہ بڑے ملک صاحب لاپتا ہیں پھر ہمارے سوال و جواب سے جو کہانی سامنے آئی وہ کچھ یوں تھی کہ بڑے ملک صاحب اپنی بڑی بیٹی سے ملنے گئے تھے۔ یہ تین دن پہلے کی بات تھی۔ پھر واپس نہیں آئے۔

بیٹی ایک قریبی گاؤں میں بیاہی ہوئی تھی۔ ان کے ساتھ ان کا باڈی گارڈ بھی تھا۔

چھوٹا ملک جیپ پر آیا تھا۔ ہم نے اسے رخصت کر دیا اور کہا کہ ہم شام کو آئیں گے گاڑی پر دس منٹ کا رستہ تھا۔

موسم کا کوئی اعتبار نہیں تھا یہ بارشوں کا موسم تھا۔

میں اور سلطان محمود شام سے پہلے ہی وہاں جا پہنچے۔

جب اسے پتا چلا کہ ہم آئے ہیں تو دوڑا دوڑا آیا اور ہمیں ایک سجی سجائی بیٹھک میں لے گیا۔ ہم نے اس سے جو کچھ پوچھنا تھا' وہ پوچھ لیا تھا اور اب اس کی ماں سے پوچھ گچھ کرنی تھی۔ وہ اپنی ماں کو لینے چلا گیا۔

لیکن اس کی ماں کے آنے سے پہلے ایک ملازم بڑی سی ٹرالی دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ جب اس نے ٹرالی کا سامان بڑی سی میز (جو ہمارے سامنے تھی) پر سجایا تو ہمارے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ کم از کم چار بندوں کے لیے سامان تھا۔

خشک میوہ جات خاص طور پر بہت زیادہ تھی۔ اخروٹ کی گری' پستے' چھلے ہوئے چلغوزے' مونگ پھلی اور پتا نہیں کیا کچھ تھا۔ ساتھ سوجی کا حلوہ اور گرم گرم دودھ تھا۔

ملازم نے کہا۔ ''چھوٹے ملک صاحب نے کہا ہے کہ ان کی امی ابھی آ رہی ہیں۔ آپ ان سے شوق کریں۔'' وہ چلا گیا اور ہم واقعی نعمتِ خداوندی سے انصاف کرنے لگے۔

سلطان محمود نے کہا۔ ''سر! بہت تکلفانہ دعوت ہے۔ میرا مطلب ہے۔''

''بالکل سلطان محمود میں تو کسی تکلف کے لیے منع کرنے لگا تھا۔ مگر اس نے موقع نہیں دیا۔''

تقریباً سس منٹ بعد ایک اڑتالیس سالہ خاتون اندر داخل ہوئیں۔

ہم کھڑے ہو گئے۔ اس لیے نہیں کہ وہ ملکانی تھی۔ بلکہ ان کی عمر کا احترام کرتے ہوئے انہوں نے سر کی خفیف سی جنبش سے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی صوفے پر بیٹھ گئیں۔ ان کی آنکھیں متورم تھیں۔ شاید رونے کی وجہ سے' ان کو صدمہ تو ہونا تھا۔

ہم نے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے ان کا غم بھلانے کی کوشش کی لیکن وہ تو بات بات پہ رونے لگ جاتی تھیں اور التجا بھرے لہجے میں کہتی تھیں خدارا ملک صاحب کو ڈھونڈ لاؤ۔

''دیکھیں جی! یہ ہمارا فرض بھی ہے اور ڈیوٹی بھی مگر آپ ذرا کچھ اشارہ تو دیں۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔

''کس قسم کا اشارہ تھانیدار صاحب.....؟'' اس نے آنسو بھری آنکھوں سے ہمیں دیکھا۔

''ان کی دشمنی کے متعلق' کسی کے ساتھ ان کی دشمنی تو نہیں تھی۔''

''دیکھیں تھانے دار صاحب! میں اگر ان کی تعریف کروں گی' ان کو اچھا کہوں گی تو آپ یقین نہیں کریں گے۔ آپ گاؤں والوں سے پوچھیں۔ ساتھ گاؤں سے پتا کریں۔ وہ تو غریبوں کے لیے اَن داتا ہیں۔ کسی کے ساتھ دشمنی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' آخر میں ملکانی کی آواز پھر بھرا گئی۔

بہر حال ہم ملک صاحب کے متعلق اچھا تاثر لے کر وہاں سے نکلے۔ شکر ہے ابھی دوبارہ بارش شروع نہیں ہوئی تھی۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا لازمی ہے کہ ملک اور اس کا باڈی گارڈ گھوڑوں پر گئے تھے۔ ان کے ساتھ گھوڑے بھی لاپتا ہی تھے۔ بڑے ملک صاحب زیادہ تر گھوڑے کی سواری پسند کرتے تھے۔

ہم نے گاؤں میں محسوس کیا کہ جیسے پورا گاؤں سوگ میں ہے۔ یہ کوئی بہت زیادہ بڑا گاؤں نہیں تھا۔ تقریباً سو کے قریب گھر ہوں گے۔ میں نے اور سلطان محمود نے کچھ معزز لوگوں سے ملک صاحب کے متعلق پوچھا سب نے یہی کہا کہ ''وہ تو ہیرا ہیں بہت سے غریبوں کے چولہے ان کے دم قدم سے جل رہے ہیں۔ کتنی ہی غریب لڑکیاں ان کی مدد کی وجہ سے سہاگنیں بنیں۔''

اتنے اچھے انسان کو کس نے غائب کر دیا ہے۔ یہی کچھ سوچتے ہوئے ہم واپس تھانے میں پہنچ گئے۔

جس گاؤں میں ملک صاحب کی بیٹی بیاہی ہوئی تھی۔ اس گاؤں اور ملک صاحب کے گاؤں کے درمیان ایک گھنا سا جنگل بھی آتا تھا۔ چھوٹے ملک نے ہر جگہ دیکھ لیا تھا۔ اس کی بہن نے کہا تھا کہ ''ابو ایک رات ہمارے پاس رہے تھے اور صبح صبح ناشتہ کر کے چلے گئے تھے۔'' ایک بات اس نے یہ بتائی تھی کہ ''انہوں نے تقریباً دس ہزار روپیہ بڑے ملک صاحب کو دیا تھا۔ یہ روپے انہوں نے شہر کے بنک میں جمع کروانے کے لیے دیے تھے۔''

یہ اس دُور کے لحاظ سے خاصی تگڑی رقم تھی۔ آج کے حساب سے دو لاکھ سمجھ لیں۔

دوسری صبح میں نے اے ایس آئی رانا تنویر اور سلطان محمود کو ایک خاص مشن پر بھیجا اور خود تھانے کے دوسرے کام نمٹانے میں لگ گیا۔

رانا تنویر کو اس تھانے میں لگ بھگ ایک سال ہو گیا تھا۔ اس کی زبانی پتا چلا تھا کہ آس پاس کے علاقے میں ڈاکوؤں کا کوئی گروہ نہیں تھا۔ البتہ جنگل میں شیر اور چیتوں کو دیکھا گیا تھا۔ مگر ابھی تک آدم خوری کا کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا۔

بڑے ملک کے ساتھ اس کا باڈی گارڈ بھی لاپتا تھا اور دو گھوڑے بھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ راہزنوں نے ملک کو لوٹ لیا ہو اور گھوڑے بھی لے گئے ہوں۔

لیکن ملک اور باڈی گارڈ کو تو واپس آ جانا چاہیے تھا۔

شام تک رانا تنویر اور سلطان محمود واپس آ گئے۔

انہوں نے جنگل کا کونا کونا چھان مارا تھا لیکن کوئی بھی سراغ نہیں ملا۔ نہ ہی گھوڑوں اور لاپتا افراد کا کوئی پتا چلا۔

عجیب معاملہ تھا۔

وہ ملک کی بیٹی سے بھی مل آئے تھے اس نے ان باتوں کی تصدیق کی تھی جو چھوٹے ملک نے ہمیں بتائی تھیں۔

سلطان محمود کو میں نے کہا کہ ''صبح ملک کے گاؤں جا کر اندر کے حالات معلوم کرے۔ یعنی ملک کے گھریلو حالات۔'' وہ ایسی معلومات حاصل کرنے کا ماہر تھا۔ یہ بات بھی آپ کے علم میں ہے کہ اس میں ایک جاسوس کے جراثیم بھی موجود تھے۔

مگر دوسری صبح مجھے بھی اس کے ساتھ جانا پڑا۔ دراصل ہوا یوں کہ چھوٹے ملک نے اطلاع بھجوائی کہ گھوڑے واپس آ گئے ہیں۔ آج بارش نہیں ہوئی تھی۔ البتہ مطلع ابھی بھی اَبر آلود تھا۔ ہم اس جیپ میں روانہ ہوئے جس پر ملازم آیا تھا۔

چھوٹا ملک ہمیں دیکھ کر استقبال کے لیے آگے بڑھا اور ہمیں بیٹھک میں لے گیا۔ جس میں ہم پہلے بیٹھے تھے۔ وہ ہمیں بٹھا کر جانے لگا تو میں نے اس کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ارادہ بھانپ کر اسے کہا۔

"کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ پچھلی بار بھی تم نے زیادہ تکلف کی تھی۔ ہم یہاں دعوتیں اڑانے نہیں آئے۔"

"تھانے دار صاحب! اس میں تکلف والی کون سی بات ہے۔ یہ تو میرا فرض ہے آپ اتنی سردی میں آئے ہیں۔"

"بھئی ہمیں اپنا فرض نبھانے دو اور ہمیں گھوڑوں کے پاس لے چلو۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

وہ ہمیں اصطبل میں لے گیا۔ وہاں چار گھوڑے تھے۔ اس نے دو گھوڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ وہ گھوڑے ہیں جن پر ابا جان اور.....!" اس کی آواز بھرا گئی۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔

دونوں گھوڑے کچھ مضطرب سے تھے۔ میں نے ایک فیصلہ کیا۔

"یہ دو گھوڑے ہم تھانے لے جائیں گے۔" میں نے چھوٹے ملک کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ حیران نگاہوں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ پھر گویا ہوا۔

"ان کو آپ کس لیے لے جائیں گے تھانے دار صاحب!"

"سوال جواب نہ کرو۔ ان کو تھانے پہنچانے کا بندوبست کرو۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

بہرطور ہمارے ساتھ گھوڑے بھی تھانے پہنچ گئے۔

میں نے تھانے کا انتظام اے ایس آئی کے سپرد کیا۔ ایک حوالدار اور چار سپاہیوں کو ساتھ لیا اور ہم جنگل کی طرف روانہ ہوگئے۔ ہم جیپ میں سوار ہوگئے۔ (یہ سرکاری جیپ تھی) اور گھوڑوں کو جیپ کے پیچھے باندھ دیا۔ میں نے ڈرائیور کو ہدایت کردی تھی کہ اسپیڈ اتنی ہی رکھے کہ گھوڑے بھی باآسانی پیچھے پیچھے آتے رہیں۔ ہم سب مسلح تھے ایک سپاہی کے پاس شکاری بندوق بھی تھی۔

جب ہم جنگل کے وسط میں پہنچے تو گھوڑوں نے رسیاں تڑوانے کی تگ ودو شروع کردی۔

میں نے جیپ رکوادی۔

پھر ڈرائیور کے علاوہ سب کو نیچے اترنے کا حکم دیا۔

گھوڑوں کو کھول دیا گیا۔ دو سپاہیوں نے ان کی لگامیں تھام لیں۔ میں نے ان کو آگے چلنے کا اشارہ کیا۔

گھوڑے آہستہ آہستہ ایک سمت چلنے لگے۔ ہم ان کے پیچھے تھے۔ تقریباً دو سو گز آگے جا کر گھوڑے رک گئے۔ اب وہ عجیب آوازیں نکالنے لگے اور زور زور سے زمین پر پاؤں مارنے لگے۔ ان کے سموں سے وہاں کھڑا بارش کا پانی اڑنے لگا ہم کھدائی کا سامان ساتھ لائے تھے۔ میری چھٹی حس نے گھوڑوں کی حالت دیکھ کر مجھے خبردار کردیا تھا کہ یہ بے زبان ہمیں کوئی نہ کوئی سراغ ضرور ڈھونڈ دیں گے۔

میں نے سپاہیوں سے کہا انہیں مضبوطی سے سامنے درختوں کے ساتھ باندھ دو۔

جہاں پر گھوڑے زور زور سے پاؤں مار رہے تھے۔ میں نے وہاں پر کھدائی شروع کروادی۔

پھر میری توقع کے عین مطابق وہاں سے دو لاشیں برآمد ہوئیں۔ لاشوں کی حالت زیادہ خراب نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ موسم سرد تھا اور بارش بھی ہوچکی تھی۔ دونوں کو سر میں گولیاں مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ میرے ساتھ جو سپاہی تھے انہوں نے ملک اور اس کے باڈی گارڈ کی حیثیت سے ان لاشوں کو شناخت کرلیا۔ وہ ان کو جانتے تھے اب ہمارا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔

تھانے واپس پہنچ کر میں نے چھوٹے ملک کو

بلوا بھیجا۔

وہ جلد ہی پہنچ گیا۔

لاشوں کو دیکھ کر اس کے آنسو نکل آئے۔

وہ میرے پاس آیا۔ (کیونکہ اس وقت میں بھی لاشوں کے پاس ہی موجود تھا)۔

"تھانے دار صاحب! یہ آپ کو کہاں سے ملیں؟"

میں نے مختصراً اسے ساری بات بتائی اور کہا۔

"اب تم گھوڑوں کو لے جاسکتے ہو۔"

"اور لاشیں؟" اس نے لاشوں کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ پوسٹ مارٹم کے لیے جائیں گی پوسٹ مارٹم کے بعد تمہیں مل جائیں گی۔" میں نے جواب دیا۔

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ پھر اپنا ارادہ ملتوی کردیا۔ وہ گھوڑے لے کر چلا گیا اور میں لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجنے کا بندوبست کرنے لگا۔

اب ہمیں ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرنا تھا۔

شام کے سائے ہر طرف پھیل رہے تھے۔ اے ایس آئی رانا تنویر اپنا کام کر رہا تھا۔ اس نے ایک کانسٹیبل کی سربراہی میں ایک ٹیم روانہ کردی تھی۔ جو علاقے کے جرائم پیشہ افراد کو پکڑنے گئی تھی۔

ایک گھنٹے بعد وہ آٹھ بندوں کو پکڑ کر لے آئے۔ سارے شکل سے ہی چھٹے ہوئے بدمعاش لگتے تھے۔

میں آرام کرنے چلا گیا۔ مجھے امید تھی صبح تک ان "بندوں" کے کس بل نکل جائیں گے۔

صبح جب میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو تھانے پر ایک عجیب سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جیسے کسی طوفان کے گزر جانے کے بعد چھاتا ہے۔

پتا یہ چلا کہ رات بھر آٹھ بندوں کی مہمان نوازی ہوتی رہی تھی۔ رانا میرے آنے سے ایک گھنٹہ پہلے ہی گھر گیا تھا اور دو گھنٹے بعد آنے کا کہہ گیا تھا۔

اس تھانے میں سپاہی دلاور اور ہیڈ کانسٹیبل نواز چھترول کے ماہر مانے جاتے تھے۔ انہوں نے مجھے آ کر رپورٹ دی کہ آٹھ بندوں میں سے کسی نے بھی کسی بڑے جرم کی قبولیت نہیں کی صرف چھوٹی موٹی وارداتوں کا اقرار کیا۔

ہم ابھی شک کی بناء پر یہ سب کچھ کر رہے تھے۔

یہاں بھی مخبری کا نظام مؤثر تھا اور ہم نے اس مشینری کو متحرک کردیا تھا۔ چھوٹی موٹی وارداتیں کرنے والے بھی ہمارے مخبر بنے ہوئے تھے۔ ہم نے سب کو چھوڑ دیا اور ملک اور اس کے باڈی گارڈ کے قتل کے متعلق سن گن لینے کے لیے کہہ دیا۔

دوپہر کے قریب لاشیں اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹیں آ گئیں کافی دیر سے چھوٹا ملک اپنے ملازموں کے ساتھ آ بیٹھا تھا۔

وہ لاشیں لے کر چلے گئے اور میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹیں دیکھنے لگا۔

رپورٹس میں لکھا تھا کہ دونوں کو قریب سے گولیاں ماری گئی تھیں۔

تقریباً تین فٹ کے فاصلے سے۔ باڈی گارڈ کے سر میں دو سوراخ تھے جب کہ بڑے ملک کے سر میں تین گولیاں۔ دونوں کے سروں میں سے آر پار ہوگئی تھیں۔ اتنے قریب سے فائر کرنے کا یہی نتیجہ ہوسکتا تھا۔ وقت دن گیارہ بجے کا لکھا تھا اور دن وہی تھا۔ جس دن صبح دونوں گاؤں سے واپس روانہ ہوئے تھے۔

اے ایس آئی میرے کمرے میں آ گیا اور ہم دونوں اس دوہرے قتل کے متعلق بات چیت کرنے لگے۔

"سر! بڑے ملک صاحب واقعی اپنے گاؤں کے اَن داتا تھے۔ مجھے تو یہ راہزنوں کی ہی واردات لگتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔" اے ایس آئی نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔
میں تو اس لعنت سے دور ہی تھا لیکن اے ایس آئی کے متعلق مجھے پتا چلا تھا کہ بے تحاشا سگریٹ پیتا ہے۔
"اس علاقے کے جرائم پیشہ اور سٹہ باز بدمعاشوں کو تم کھنگال چکے ہو اور تمہارے خیال کے مطابق ارد گرد ڈاکوؤں کا کوئی گروہ بھی نہیں ہے اور نہ راہزنوں کا کوئی گروہ سرگرم عمل ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "پھر یہ راہزن کہاں سے آ گئے؟"
"مجھے ایک اور شک ہو رہا ہے سر؟" اس نے سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں ڈالتے ہوئے کہا۔
"وہ کیا بھئی!" میں نے کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔
"میرے خیال میں راہزن ملک کی بیٹی کے گاؤں سے ہی ان کے پیچھے لگ گئے تھے۔" اس نے دور کی کوڑی لاتے ہوئے کہا۔ "اور سر.....!" اس نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ پیشہ ور راہزن ہوں۔"
"یہ ناممکن تو نہیں ہے۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
"اچھا ذرا یہ تو بتاؤ کہ یہ ملک کرتا کیا تھا؟"
"سر! شہر میں اس کے چار کارخانے ہیں بہت امیر آدمی تھا لیکن غرور اس میں ذرا بھی نہیں تھا۔"
ہم اسی قسم کی باتیں کرتے رہے اور کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ اس سے اگلے دن ایک افسوس ناک واقعہ ہمارا منتظر تھا۔ پتا یہ چلا کہ ملک کے گاؤں کی ایک لڑکی نے کنویں میں کود کر خودکشی کر لی تھی۔ چاہے کوئی بندہ اپنی جان خود لے یا اسے قتل کیا جائے دونوں صورتوں میں اطلاع ہمارے پاس ضرور آتی ہے اور بعض اوقات خودکشی بھی تفتیش کرنے پر قتل ثابت ہو جاتی ہے۔
میں نے ایک کانسٹیبل اور ایک سپاہی کو ساتھ لیا اور ملک کے گاؤں پہنچ گیا۔
لاش کو کنویں سے نکال لیا گیا تھا اور کنویں کے پاس ہی ایک چارپائی پر لاش پڑی تھی جس کو ایک سفید چادر سے ڈھانپا ہوا تھا۔ وہاں درجن بھر افراد جمع تھے وہ سارے مرد تھے عورتیں ذرا دور تھیں لاش کی شناخت ہو گئی تھی۔ لڑکی کا نام حبیبہ تھا۔
کانسٹیبل نے لوگوں کو پیچھے ہٹایا۔
میں نے چادر ہٹا کر معائنہ شروع کر دیا یہ ایک نوجوان لڑکی کی لاش تھی۔ عمر اٹھارہ سال کے قریب رہی ہو گی۔
زندگی میں وہ خوب صورت رہی ہو گی لیکن اس وقت موت کی زردی نے اس کے حسن کو گہنا دیا تھا۔
لاش کا پیٹ پھول گیا تھا۔ لاش جس طرح دریافت ہوئی اس کا احوال یہ ہے کہ یہ کنواں گاؤں کے وسط میں تھا اور یہاں سے عورتیں پانی بھرتی تھیں۔ قریب چار گھر تھے یہاں کی عورتیں صبح سویرے یہاں سے پانی بھرتی تھیں۔
ابھی سورج نے مشرق سے منہ دکھایا ہی تھا کہ قریبی گھر کی ایک عورت گھڑے لے کر پانی بھرنے کنویں پر آ گئی۔
جونہی عورت نے ڈول کنویں میں ڈالا۔ ڈول کسی چیز سے ٹکرایا۔
یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ کنویں کے اوپر ایک لکڑی کا تختہ رکھا رہتا تھا۔ جو اس کی حفاظت کے لیے تھا۔ یعنی کوئی چیز اس کے اندر نہ گر جائے۔
اس نے دیکھا کہ تختہ ہٹا ہوا تھا۔ یہ خلافِ معمول تھا۔
آج اس کے خاوند نے ذرا جلدی شہر جانا تھا۔ اس لیے اس نے اس خلاف معمول بات پر زیادہ توجہ

نہیں دی۔ کبھی کبھی انسان ایسا کر جاتا ہے اور غیر معمولی بات پر بھی دھیان نہیں دیتا۔
عورت ڈول نکال لیا ظاہر ہے وہ ابھی خالی ہی تھا۔
ڈول کو وہیں چھوڑ کر اس نے گھر کی طرف دوڑ لگا دی اور جا کر اپنے خاوند کو ساری بات بتائی۔
اس نے اپنے تینوں پڑوسیوں کا دروازہ کھٹکھٹایا۔
مختصراً یہ کہ لاش کو نکال لیا گیا۔ جی ہاں لڑکی اس وقت لاش میں تبدیل ہو چکی تھی۔ انہوں نے کنویں میں جھانک کر یہ اندازہ تو لگا ہی لیا تھا کہ کوئی کنویں میں گرا ہوا ہے۔ لڑکی کی لاش کو چارپائی پر ڈال کر ہمیں اطلاع دی گئی اور ساتھ ہی ایک آدمی کو لڑکی کے گھر کی طرف دوڑایا گیا۔
لڑکی کا گھر کنویں سے ذرا دور تھا ہمارے پہنچنے سے پہلے لڑکی کی ماں آ چکی تھی۔ بیٹی کی لاش دیکھ کر وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اسے اٹھا کر قریبی گھر میں لے جایا گیا تھا اور اس وقت ایک ڈاکٹر اس کا علاج کر رہا تھا۔
فی الحال اس سے بات چیت ممکن نہیں تھی۔ ہم نے کاغذی کارروائی مکمل کر کے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی۔
ابتدائی تفتیش سے یہ بھی پتا چلا تھا کہ لڑکی کا باپ ملک کے کارخانے میں کام کرتا ہے۔ حبیبہ ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ باپ کام پر جا چکا تھا اور کئی گھنٹے بعد اس کی واپسی ہوئی تھی۔ اب ہمارا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ کانسٹیبل ہوشیار قسم کا پولیس اہلکار تھا اس کو میں نے لاش کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ میں اور سپاہی واپس تھانے آ گئے۔ میں نے پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر کے لیے ایک رقعہ لکھ کر دیا تھا کہ شام سے پہلے پوسٹ مارٹم ہو جانا چاہیے۔
لاش کی حالت پہلے ہی خراب تھی۔
بہر حال شام تک لاش پوسٹ مارٹم کے ساتھ واپس آ گئی۔ لاش لینے کے لیے لڑکی کا باپ دو پڑوسیوں کے ساتھ آیا تھا۔ اس کی حالت بہت بری تھی۔ وہ لاش لے کر چلے گئے۔
جوان اکلوتی بیٹی کا اس طرح مر جانا ویسے بھی والدین کے لیے بہت زیادہ دکھ کا باعث ہوتا ہے۔
جب تک تفتیش سے ثابت نہیں ہو جاتا کہ لڑکی نے واقعی خودکشی کی ہے اس وقت تک میں اسے خودکشی نہیں لکھ سکتا تھا۔
لڑکی کو کنویں میں کودتے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ صرف اندازہ لگا لیا گیا تھا کہ لڑکی نے خودکشی کی ہے۔
میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ پڑھنے لگا۔
رپورٹ میں لکھا تھا کہ لڑکی پانی میں گرنے سے ہلاک ہوئی تھی۔ پانی پیٹ کے اندر چلا گیا تھا اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ لڑکی دو ماہ کی حاملہ تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ لڑکی کے کسی کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے۔ کیونکہ مجھے بتایا گیا تھا کہ لڑکی کنواری ہے۔
یہ خودکشی کی ایک معقول وجہ تھی۔
دوسری صبح میں ابھی اپنے دفتر میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔
کافی دیر موسلا دھار بارش ہوتی رہی۔ سردی مزید بڑھ گئی۔ میں نے سلطان محمود کے ذمے ایک کام لگایا تھا۔
جس وقت وہ میرے کمرے میں داخل ہوا بارش رک چکی تھی۔
"کہو بھئی کیا خبریں ہیں؟"
"سر جس بندے کے متعلق آپ نے مجھے معلومات حاصل کرنے کے لیے کہا ہے اس کے متعلق گاؤں میں کوئی کھل کر بات نہیں کر رہا لیکن ان کے رویے سے لگ رہا ہے کہ بات کچھ ہے ضرور۔"
"اچھا تم اپنی کوشش جاری رکھو۔" میں نے ہاتھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے اشارے سے اسے جانے کے لیے کہا۔

اس کے نکلتے ہی اے ایس آئی اندر داخل ہوا۔ رانا تنویر جب میرے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا تو میں نے استفسار کیا۔

"رانا صاحب! مخبروں کی طرف سے کیا رپورٹیں ہیں؟"

"سر! ایک امید افزا خبر ہے۔"

"وہ کیا رانا صاحب!" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"جنگل سے کچھ فاصلے پر ایک ڈیرا ہے۔ وہاں کچھ بندے دیکھے گئے ہیں۔ شاید وہ وہیں رہتے ہیں۔"

"یہ پتا چلا کہ وہ کون ہیں اور وہاں اس ویرانے میں کیا کر رہے ہیں؟"

"مجھے تو سر وہ کوئی جوئے کا اڈہ لگتا ہے رات کو وہاں اور بھی لوگ جاتے ہیں۔" اس نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔

"اوہ ویری سیڈ۔"

"سر! کیا مطلب؟" رانا نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

"یہ سب کچھ اگر صحیح ہے تو اسے ہماری نااہلی کہا جائے گا کہ سب کچھ ہماری ناک کے نیچے ہو رہا ہے اور ہم آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"سر! اس طرف تو پہلے کبھی دھیان نہیں گیا۔ اب.....!" اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر ختم ہوتے ہوئے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل کر بجھا دیا۔

"اب کیا کرنے کا ارادہ ہے۔"

"سر! اگر آپ کی اجازت ہو تو آج وہاں چھاپہ مارا جائے؟" اس نے ایک اور سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"اس کام کو کل رات پر رکھو۔ آج ہم نے ابھی ملک کے گاؤں جانا ہے۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔"

آدھے گھنٹے بعد ہم سادہ کپڑوں میں ملک کے گاؤں میں پہنچ گئے۔ اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ ہمیں یہ بھی اطلاع مل چکی تھیں کہ لاش کو دفنایا جا چکا ہے۔

ہماری منزل حبیبہ (مرحوم) کا گھر تھی۔ وہاں کافی لوگ افسوس کے لیے آئے ہوئے تھے۔ جنہیں ساتھ والے گھر میں بٹھایا گیا تھا۔ حبیبہ کے باپ نے ہمیں اندر کمرے میں بٹھایا اور انگیٹھی جلا کر لے آیا وہ چائے پانی کا بندوبست بھی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے منع کر دیا۔

وہ اندر باہر سے ٹوٹا پھوٹا لگتا تھا۔ اس کا رنگ گورا اور بال سفید ہو گئے تھے۔

ہم نے افسوس کا اظہار کیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اسے بولنے پر آمادہ کیا۔

"دیکھو بزرگو! ہم آپ کو تکلیف دے رہے ہیں۔ ہم نے کاغذوں کا پیٹ بھرنا ہوتا ہے۔ ہم کسی حادثے کو خودکشی اس وقت تک نہیں لکھتے جب تک ہمیں یقین نہ ہو جائے کہ مرنے والے یا والی نے واقعی خودکشی کی ہے۔ اس لیے چند سوالوں کے جواب ہمیں چاہئیں۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"پھر ہم آپ کی بیوی سے بھی کچھ باتیں پوچھیں گے۔"

"تھانے دار صاحب! میری بیوی کی حالت بہت خراب ہے۔ اس وقت وہ سکون آور انجکشن کے زیر اثر ہے۔ آپ بے شک اندر چل کر اس کی حالت دیکھ لیں۔" حبیبہ کے باپ نے دکھی لہجے میں کہا۔

"ہمیں حالات کا ادراک ہے۔ آپ ہی ہماری کچھ مدد کر دیں۔" میں نے بدستور لہجہ نرم رکھتے

ہوئے کہا۔

"میں۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"کیا بات ہے حوصلہ رکھیں۔ یہ صدمہ تو آپ کو برداشت کرنا ہی ہوگا۔ اگر آپ نے بھی ہمت ہار دی تو آپ کی بیوی کو کون حوصلہ دے گا۔"

"تھانے دار صاحب! کچھ ایسی باتیں ہیں جو میں اپنی زبان سے بتا نہیں سکتا۔ میں حبیبہ کی سہیلی رانی کو آپ کے پاس بھیج دیتا ہوں۔ وہ ساری باتیں آپ کو بتا دے گی۔"

"ٹھیک ہے آپ اس کو بھیج دیں۔"

کچھ دیر بعد ایک نوجوان لڑکی اندر داخل ہوئی رنگ اس کا گندمی تھا۔ آنکھیں چھوٹی اور ماتھا چوڑا تھا۔ وہ بھی بہت زیادہ غم زدہ لگتی تھی پھر.....!

رانی نے ہمیں سب کچھ بتا دیا۔ میں نے اور رانا نے گھما پھرا کر اس سے ہر بات اگلوالی۔ اس کہانی کا ذکر آگے آئے گا۔

باتیں واقعی ایسی تھیں کہ کوئی باپ اپنی زبان سے کہہ نہیں سکتا تھا۔ رانی کو ہم نے رخصت کر دیا اور ہم حبیبہ کے باپ کو تسلی دلاسہ دے کر وہاں سے واپس تھانے آ گئے۔

اس وقت رات کے بارہ بج گئے تھے۔

میں نے اسی وقت رانا کو چھ مسلح اہلکار دے کر چھاپے کے لیے بھیج دیا۔ اب دیر کرنا ہمارے لیے مشکلات کا باعث بن سکتا تھا۔ اس جنگل میں درندوں سے مدبھیڑ ہونے کا بھی خطرہ تھا۔ نفری میں دو سپاہیوں کے پاس شکاری بندوقیں بھی تھیں اور وہ ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت سے مالا مال تھے میں نے سپاہیوں کو بیرک میں تھوڑی دیر آرام کرنے کا فیصلہ کیا۔ چھاپہ مار ٹیم کی واپسی صبح کی اذانوں تک متوقع تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں بے خبر سو گیا۔ پتا نہیں کتنے گھنٹے میں سویا ہوں گا۔ ایک سپاہی نے مجھے آ کر جگا دیا۔ اس کو میں نے کہہ دیا تھا کہ جونہی چھاپہ مار ٹیم واپس آئے مجھے جگا دیا جائے۔

چھاپہ کامیاب رہا تھا۔ وہاں ایک بڑے کمرے میں جوا ہو رہا تھا۔ ان میں کچھ جواری رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

گرفتار ہونے والوں میں سات مرد اور ایک عورت تھی۔

مردوں میں چھوٹے ملک صاحب بھی تھے۔ ان کو ایک کمرے سے عورت کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے گرفتار کیا گیا تھا۔

چھوٹے ملک صاحب نشے میں دھت تھے اور عورت نے بھی پی رکھی تھی۔ یہ ایک کال گرل تھی۔

ہم نے جب سب کو تفتیش کی تو بڑے ملک صاحب اور ان کے باڈی گارڈ کے قتل کا معمہ بھی حل ہو گیا۔

سات مردوں میں چار مرد چھوٹے ملک کے گرگے تھے اور ڈیرا بھی چھوٹے ملک کا تھا۔ جوا گرگے کرواتے تھے۔ چھوٹا ملک ہفتے میں ایک دن وہاں رنگ رلیاں منانے جاتا تھا۔

جیسا کہ ذکر آ چکا ہے کہ بڑے ملک صاحب بہت اچھے اور غریب پرور انسان تھے انہوں نے گاؤں کے کافی مردوں کو اپنے کارخانوں میں روزگار دیا ہوا تھا۔

چھوٹا ملک ان کے بالکل الٹ تھا۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ غریبوں اور مزدوروں کو دبا کر رکھا جائے۔ ورنہ یہ سر پر چڑھ جاتے ہیں۔ اس کو بڑے ملک کا مزدوروں اور غریبوں کے ساتھ میل جول ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔

پھر وہ دن آیا جب حبیبہ کا باپ بیمار پڑ گیا۔ وہ کئی دن کام پر نہ جا سکا۔ چھوٹے ملک نے حبیبہ کو دیکھا ہوا تھا اور اس پر اپنے دانت تیز کر رہا تھا۔ حبیبہ کے باپ کو دیکھنے کے بہانے وہ اس کے گھر جا پہنچا۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ چھوٹا ملک ایک خوبرو جوان ہے اس کے بعد وہ اکثر ان کے گھر جانے لگا۔

رفتہ رفتہ حبیبہ چھوٹے ملک کے حسن اور لچھے دار باتوں میں آ کر اس کے جال میں پھنس گئی۔ لوگ بڑے ملک کی بہت عزت کرتے تھے۔ اس لیے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ چھوٹا ملک عورتوں کا شکاری ہے۔ حبیبہ نے اپنے دل کا حال اپنی سہیلی رانی کو بتایا ہوا تھا پھر.....!

ایک دن وہ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس دن حبیبہ گھر میں اکیلی تھی۔ چھوٹے ملک نے بہلا پھسلا کر اور سبز باغ دکھا کر حبیبہ کی عزت تار تار کر دی۔ جب طوفان گزر گیا تو چھوٹے ملک نے اسے کہا۔

"اب اپنا منہ بند رکھنا اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔"

حبیبہ اس کے قدموں میں گر گئی اور کہا۔ "تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ مجھ سے شادی کرو گے۔"

"یہ بعد کی باتیں ہیں۔" چھوٹا ملک تو یہ کہہ کر چلا گیا۔

لیکن حبیبہ کی دنیا اندھیر کر گیا۔ وہ پریشان رہنے لگی۔ چھوٹے ملک نے پلٹ کر اس کی خبر نہیں لی۔

جب ایک ماہ بعد حبیبہ کو اپنے اندر تبدیلی محسوس ہوئی تو اس نے رو رو کر رانی کو یہ بات بھی بتا دی۔ پہلے اس نے یہ بات رانی سے بھی چھپائی ہوئی تھی۔ وہ بہانے سے حبیبہ کو ایک لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ جس نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ حبیبہ حاملہ ہو چکی ہے۔

رانی نے حبیبہ کی ماں کو سب کچھ بتا دیا۔ کیونکہ اب

بات چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ماں نے سر پیٹ لیا اور شاید زندگی میں پہلی بار اس نے حبیبہ کو بے تحاشا پیٹ ڈالا۔ رانی نے بڑی مشکل سے اسے چھڑایا اور حبیبہ کی ماں کو سمجھایا کہ اس طرح اور زیادہ بے عزتی ہو گی۔ اس مسئلے کا کوئی حل سوچنا چاہیے۔

بات حبیبہ کے باپ تک بھی جا پہنچی اس نے بڑے ملک سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

جب بڑے ملک کو ساری بات کا پتا چلا تو اس نے حبیبہ کے باپ کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا اور کہا۔

"میں حبیبہ کو اپنی بہو بنا کر یہ داغ دھو دوں گا۔"

حبیبہ کا باپ بڑے ملک کو دعائیں دیتا ہوا وہاں سے آ گیا اور اپنی بیوی کو ساری بات بتائی۔ اس سے ان کی ڈھارس بندھ گئی۔ لیکن دل کے نہاں خانوں میں اب بھی خوف اور وسوسے انگڑائیاں لے رہے تھے۔

اِدھر جب بڑے ملک نے اپنے بیٹے کو برا بھلا کہنے کے بعد اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ چپ سا ہو گیا اور خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔

پھر اس نے ایک خوفناک منصوبہ بنایا۔ جس دن بیٹی سے مل کر بڑے ملک کو واپس آنا تھا۔ وہ اپنے چاروں گرگوں کے ساتھ جنگل میں ایک جگہ جا کر چھپ گیا۔

پھر ایک بیٹے نے اپنے باپ کے خون سے ہاتھ رنگ لیے۔ ان سب نے اپنے چہرے کالی چادروں میں چھپائے ہوئے تھے۔ جب بڑا ملک اور اس کا باڈی گارڈ نظر آئے تو یہ اوٹ سے نکل کر نظر گئے اور اسلحے کے زور پر انہیں گھوڑوں سے نیچے اترنے کے لیے کہا۔ پھر دونوں کی جامع تلاشی لے کر ان کی جیبوں سے سب کچھ نکال لیا گیا۔ دونوں کو گولیاں مار کر ان کی لاشوں کو دفن کر دیا گیا اور گھوڑوں کو ڈیرے پر لا کر باندھ دیا۔ جن کو بعد میں اسکیم کے مطابق چھوٹا ملک گھر لے گیا اور جنہوں نے بعد میں لاشیں دریافت کرنے کا "کارنامہ" سرانجام دے ڈالا۔

چھوٹے ملک کے ذہن میں یہ تھا کہ ہم اسے رہزنی کی واردات سمجھیں گے لیکن میرے ذہن میں یہ بات شروع سے کھٹک رہی تھی کہ گھوڑے چار دن کے بعد کیوں واپس آئے تھے؟

ہم نے سب مجرموں کا چالان مکمل کر کے ان کو سپرد عدالت کر دیا۔ اب دو باتیں رہ جاتی ہیں۔ ایک بات تو یہ ہے کہ میں نے سلطان محمود کو چھوٹے ملک کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے کہا تھا۔ حبیبہ والی بات بڑے ملک نے زیادہ پھیلنے نہیں دی تھی۔ اس لیے جن چند بندوں کو پتا بھی تھا انہوں نے اپنا منہ بند کر لیا تھا۔ ویسے بھی چھوٹا ملک کافی محتاط تھا۔ لہٰذا جنگل والے ڈیرے پر جاتا تھا۔

اب بات رہ جاتی ہے حبیبہ کی اس نے واقعی خود کشی کی تھی۔ بقول رانی کہ اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ بڑے ملک کے قتل کے بعد تو وہ بالکل مایوس ہو گئی تھی۔

یہ بات ہمیں معلوم نہ ہو سکی تھی کہ حبیبہ کنویں تک کیسے پہنچی تھی۔ ویسے پوسٹ مارٹم میں اس کے مرنے کا وقت رات تین بجے سے چار بجے لکھا تھا۔

قارئین! ایسا بھی ہوتا ہے کبھی کبھی کسی انسان کی بہت زیادہ اچھائی اس کے لیے موت کا سامان بن جاتی ہے۔ نیکی اور بدی کی یہ جنگ جاری ہے اور جاری رہے گی۔

خدا بزرگ و برتر ہمیں صراطِ مستقیم پر چلنے کی ہدایت عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عشق نامراد

محترم مدیر عمران قریشی!

السلام علیکم'

زندگی دھوپ چھائوں کا نام ہے۔ جو لوگ اعتماد اور حقیقت پسندی کے ساتھ زندگی کا فیصلہ کرتے ہیں۔ زندگی اور حالات بھی انہیں سے وفا کرتے ہیں اور جو جذبات کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے حقائق کو نظر انداز کردیتے ہیں تو قدم قدم پرخسار ان کا استقبال کرتے ہیں۔ یہ کہانی ایک ایسے شخص کی ہے جب اسے افسوس اور پچھتاوا ہوا تو سب کچھ اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

والسلام

عثمان خالق

لندن' یو کے

ایک زوردار تمانچہ لگانے کے بعد وہ چیخیں۔ "دفع ہوجاؤ اپنے کمرے میں۔" زیفی نے سر جھکایا اور چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ باقی سب بھی نظریں چرائے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

آمنہ بیگم آنکھوں میں آنسو لیے لڑکھڑاتے ہوئے اپنے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئیں اور بے اختیار ان کے منہ سے یہ لفظ نکلے۔ "یہ آپ نے اچھا نہیں کیا فاروق بھائی۔ آپ نے میرے بیٹے کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔"

آنکھیں بند کیے کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگائے وہ خود پر قابو پانے کی ناکام کوشش کررہی تھیں۔ "شاید اس میں ساری غلطی میری ہی ہے' نہ میں اتنا بڑا قدم اٹھاتی نہ آج یہ سب ہوتا۔ شاید میری ہی غلطی تھی۔"

☆......●......☆

گھر روشنیوں سے چمک رہا تھا۔ اعظم صاحب اور صفیہ بیگم بہت خوش تھے' خوش کیوں نہ ہوتے آخر ان کے بیٹے اور بیٹی کی شادی جو تھی فاروق کی آج برات تھی اور آمنہ کی مہندی۔

"صفیہ بیگم آج تو تمہاری دلی تمنا پوری ہوگئی۔ بہو جو گھر میں آگئی۔"

"ہاں اعظم' پر مجھے خوشی کے ساتھ غم بھی ہے کہ کل میری بیٹی مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی۔"

"ارے بیٹیاں تو ہوتی ہی پرائی ہیں۔ ایک نہ ایک دن انہیں اپنے گھر جانا ہی پڑتا ہے۔"

"پر اعظم مجھے آمنہ کی بہت فکر ہے کہیں وہ کوئی غلط قدم نہ اٹھا لے......!"

"چپ......!" انہوں نے صفیہ کے منہ پر انگلی رکھی۔

"بس چپ' سب ٹھیک ہوجائے گا' پر......!"

"کہا نا چپ۔" صفیہ کے چہرے پر مایوسی چھا گئی خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆......●......☆

"آمنہ' آمنہ ہوش میں آؤ' سارہ نے اسے جھنجوڑا تھا۔ "اپنا نہیں تو کم از کم اپنے ماں باپ کی عزت کا ہی خیال کرلو کیا عزت رہ جائے گی۔ تمہارے ماں باپ کو جب پتا چلے گا کہ ان کی بیٹی گھر سے بھاگ گئی......!"

"پلیز آمنہ کچھ تو خیال کرو۔"

"خیال کروں؟" وہ چیخی۔ "انہیں میرا خیال نہیں آیا کتنی منتیں کیں میں نے کہ ابا علی کے ساتھ ہی میری زندگی کی خوشی ہے پر انہوں نے میری ایک نہ سنی اور عثمان سے میری شادی طے کردی۔"

"پر آمنہ وہ تمہارے ماں باپ ہیں وہ تمہارا بھلا ہی سوچیں گے۔"

"سارہ پلیز میں فیصلہ کرچکی ہوں۔"

سارہ نے ایک لمبی آہ بھری۔ "ٹھیک ہے جو تمہارے دل میں آئے وہ کرو۔ پر پلیز آخری بار پھر سوچ لو یہ نہ ہو ساری عمر کا پچھتاوا تمہارا نصیب بن جائے۔" سارہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

☆......●......☆

"صفیہ آمنہ کو لاؤ بھی رسم شروع کریں۔"

"جی اچھا۔" صفیہ بیگم ساڑی سنبھالتے ہوئے آمنہ کے کمرے کی طرف بڑھیں۔

"آمنہ' آمنہ......!" کمرے میں چھائی خاموشی سے ان کا دل گھبرایا۔ کمرے کو خالی دیکھ کر ان کا دل ڈوبنے لگا۔ "یا اللہ خیر۔" اچانک ان کی نظر مہندی کے پیلے جوڑے اور اس پر رکھے خط پر پڑی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ جیسے سب کچھ سمجھ آ گیا ہو۔ کانپتے ہاتھوں سے خط اٹھایا۔

"پیارے اماں ابا' دنیا کے ہر والدین یہی سوچتے ہیں کہ وہ جو بھی فیصلہ اپنی اولاد کے لیے کرتے ہیں وہ ہمیشہ ٹھیک ہی ہوتا ہے۔ وہ اپنی مرضی اپنی اولاد پر تھوپ دیتے ہیں۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ زندگی انہوں نے نہیں بلکہ ان کے بچوں نے گزارنا ہوتی ہے اور کسی اور کی مرضی سے زندگی گزارنے کا حوصلہ مجھ میں نہیں۔ میری شادی سے تین زندگیاں متاثر ہوں گی۔ میری' علی اور عثمان کی ہم میں سے کوئی بھی خوش نہیں رہ پائے گا۔ اس لیے میں یہ گھر چھوڑ کر جارہی ہوں۔ علی کے ساتھ۔ آپ سب بھابی کی آمد کی خوشی میں اتنے مگن ہیں کہ جب تک آپ کو یہ خط ملے گا میں بہت دور جاچکی ہوں گی جلد لوٹ آؤں گی پلیز مجھے معاف کردینا آپ کی آمنہ۔"

صفیہ بیگم پر تو جیسے بجلی گر پڑی۔ "کیا کردیا تم نے آمنہ جیتے جی ہی مار ڈالا' کیا جواب دوں گی میں سب کو۔" کتنی دیر تک یہی سوچیں ان کے گرد گھومتی رہیں۔

بڑی ہمت کرکے وہ باہر آئیں پہلی نظر اسٹیج پر بیٹھے فاروق پر گئی۔ کتنا خوش تھا وہ' دوسری نظر اعظم پر گئی۔ پھر قدم دھیرے دھیرے ان کی طرف بڑھنے لگے۔

الفاظ نے جیسے ساتھ چھوڑ دیا ہو۔ "سنیے ذرا بات کرنی تھی آپ سے۔" دبے ہوئے لہجے نے اعظم کو شش و پنج میں ڈال دیا۔

"کیا بات ہے؟"

"ذرا میرے ساتھ اندر چلیں۔ وہ آمنہ آپ سے ملنے کی ضد کررہی ہے۔" مہمانوں کے سامنے اس سے اچھا بہانہ کوئی سمجھ نہیں آرہا تھا۔

کمرے میں خاموشی اور خط اعظم کے ہاتھ میں تھا۔ ٹانگوں میں جیسے جان نہیں تھی کھڑا رہنے کی لڑکھڑا کر بیڈ پر بیٹھے۔

"اعظم آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" صفیہ کے ہوش ساتھ چھوڑ رہے تھے۔

"اعظم' اعظم......!"

"فاروق کو بلاؤ۔"

"آپ ٹھیک ہیں نا۔"

"میں نے کہا فاروق کو بلاؤ۔"

صفیہ باہر کو بھاگیں۔ بھاگتے بھاگتے ایک دھماکا ہوا۔ بجلی کی طرح وہ پلٹیں۔ ان کی چیخوں نے گھر بھر میں ہلچل مچادی سب بھاگتے ہوئے آن پہنچے۔ فاروق کی نظر باپ کی خون میں لت پت لاش پر پڑی ماں کی چیخوں کا اسے ہوش نہ رہا باپ کی طرف لپکا پر بہت دیر ہوچکی تھی۔ ان کے ایک ہاتھ میں پستول اور دوسرے میں آمنہ کا لکھا خط اب بھی موجود تھا۔ فاروق نے ان کی مٹھی سے وہ کاغذ کا ٹکڑا نکالا۔ آمنہ کا لکھا ایک ایک لفظ کانٹوں کی طرح چبھ رہا تھا۔ غصہ اور نفرت اس کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چہرے پر امڈ آئی تھی۔ کیسا خوشیوں سے بھرا گھر ماتم کدہ بن گیا تھا۔

☆.....●.....☆

''علی ہم کب چلیں گے اماں ابا سے معافی مانگنے۔'' وہ علی سے پچھلے تین دن سے یہ سوال پوچھ رہی تھی۔ علی جان کے بھی انجان سا بن جاتا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا یہ سب اتنا آسان نہیں تھا۔ جتنا وہ سمجھ رہی تھی۔ آج کل میں چلتے ہیں وہ نظریں چراتے ہوئے بولا۔

''علی میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ پتا نہیں کیا ہوا ہوگا میرے بعد وہاں۔ اماں ابا نے کیسے سنبھالا ہوگا سب کو ان پر پتا نہیں کیا بیتی ہوگی میں گھر فون کروں کیا؟'' علی نے کچھ سوچا پھر ہاں میں سر ہلا دیا۔

☆.....●.....☆

آج اعظم کا چالیسواں تھا۔ گھر پھر سے مہمانوں سے بھرا تھا۔ پر اس دفعہ وہ ان کی خوشیاں نہیں غم بانٹنے آئے تھے۔ فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ ثمن نے فون اٹھایا۔

''ہیلو.....!'' دوسری طرف سے بھابی کے پکارے جانے پر اسے ایک شاک لگا تھا۔

''آمنہ!'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''تم تم..... تمہیں پتا ہے تم نے کیا کیا آمنہ!''

''کس کا فون ہے؟'' صفیہ بیگم کی آواز سے وہ چونکی۔

''وہ امی وہ..... آمنہ..... کا.....!''

''کیا آمنہ.....؟'' انہوں نے فون چھین لیا۔

''جنم جلی باپ کو کھا گئی تجھے سکون نہیں ملا اب ہمارے پیچھے کیوں پڑی ہے ماں اور بھائی بچے ہیں انہیں بھی مار ڈال۔''

آمنہ کے تو ہوش ہی اڑ گئے۔

''امی کیا ہوا ابا کو.....؟''

''کیا ہوا'' ان کے منہ سے جیسے آگ نکل رہی ہو۔ مار ڈالا تیری وجہ سے انہوں نے خود کو۔ آمنہ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

''خبردار آئندہ یہاں فون کیا تو جان لے لوں گی تیری۔''

فون کو غصے میں پٹخ دیا۔ ''کوئی اس کا نام نہیں لے گا آج کے بعد مر گئی وہ ہمارے لیے۔'' چیخ چیخ کر رونے لگیں۔

''ثمن اماں کو اندر لے جاؤ۔'' فاروق سے ماں کی حالت دیکھی نہ گئی۔ پر وہ بے بس تھا۔ کچھ کر نہیں سکتا تھا۔

☆.....●.....☆

''علی، علی.....!'' وہ روتے روتے چیخ رہی تھی۔ علی بھاگتا ہوا آیا۔

''آمنہ کیا ہوا؟''

''علی ابا نے خودکشی کر لی۔'' علی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

''کیا؟''

''ہاں علی سب میری وجہ سے ہوا ہے۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

''علی، علی پلیز مجھے گھر لے چلو۔ مجھے اماں کے پاس جانا ہے۔ علی پلیز مجھے لے چلو نہیں تو میں مر جاؤں گی۔''

علی چپ تھا۔ علی کو بھی لگا کہ شاید وقت آ گیا ہے سب کا سامنا کرنے کا۔

''ٹھیک ہے آمنہ صبح ہم واپس چلیں گے۔''

☆.....●.....☆

''ڈاکٹر، ڈاکٹر.....!'' نرس بھاگتی ہوئی عثمان کے کمرے میں داخل ہوئی۔ ''ڈاکٹر صاحب ایمرجنسی ہے ایکسیڈنٹ کیس ہے جلدی چلیں۔'' عثمان جلدی سے کمرے سے باہر نکلا نرس کے ساتھ چلتے ہوئے وہ

ایمرجنسی روم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ نرس تفصیل بتا رہی تھی۔ ''ڈاکٹر صاحب ایک لڑکا لڑکی تھے کار میں بہت برا ایکسیڈنٹ ہوا لڑکا تو موقع پر ہی مر گیا لڑکی کی حالت بھی نازک ہے۔ عثمان ایمرجنسی روم میں داخل ہوا جہاں ڈاکٹر فوزیہ پہلے سے موجود تھیں۔ عثمان آگے بڑھا اور لڑکی کا چہرہ دیکھتے ہی اس کے ہوش اڑ گئے۔

سر کرسی سے ٹکائے آنکھیں بند کیے وہ اس دن کو یاد کر رہا تھا۔ جب اس نے پہلی مرتبہ آمنہ کو دیکھا تھا اور دیکھتے ہی اسے وہ بہت پسند آئی تھی۔ وہ اس کے ابا کے دوست کی بیٹی تھی۔ ابا ہر وقت اس کے حسن کی تعریفوں کے پل باندھا کرتے تھے اور جب اس نے اسے دیکھا تو ابا کی ایک ایک بات سچی لگی۔ عثمان کی رضامندی سے رشتہ طے ہوا تھا۔ وہ کتنا بے صبر ہو گیا تھا کہ کب آمنہ کو وہ اپنی دلہن کے روپ میں دیکھے گا پر جب اس کے خوابوں کو تعبیر ملنے والی تھی تو اس کا ایک ایک خواب کانچ کی طرح ٹوٹا تھا۔ کتنا رویا تھا اکیلے میں وہ اس دن اتنا شاید ہی کبھی رویا ہو۔

''ڈاکٹر صاحب!'' وہ نرس کی آواز پر چونکا۔ ''وہ اس لڑکی کو ہوش آ گیا ہے اور وہ بار بار اپنے شوہر کا پوچھ رہی ہے۔ پلیز آپ جلدی آیئے۔''

''تم چلو میں آتا ہوں۔'' وہ اس کمرے کی طرف بڑھا آمنہ کی آواز اس کے کانوں تک صاف سنائی دے رہی تھی جو کہ ایک ہی سوال پوچھ رہی تھی کہ علی کہاں ہے؟ عثمان پر نظر پڑتے ہی وہ چونکی۔

''عثمان! تم؟'' پر اس وقت اسے عثمان کی موجودگی سے زیادہ علی کی غیر موجودگی تکلیف دے رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا وہ خود ہی بول پڑی۔

''عثمان! علی کہاں ہے؟ کوئی مجھے کچھ نہیں بتا رہا تم تو ڈاکٹر ہو تمہیں تو پتا ہوگا پلیز بتاؤ۔ علی کہاں ہے؟''

''آمنہ! علی..... وہ علی!''

''کہاں ہے علی پلیز بتاؤ مجھے۔'' وہ پھر سے بول پڑی۔

''علی..... علی اب اس دنیا میں نہیں رہا۔''

''چٹاخ!'' ایک زوردار تمانچہ اس نے عثمان کے گال پر رسید کیا۔ ''شرم نہیں آتی تمہیں اس طرح کہتے ہوئے۔'' وہ اپنے ہوش کھو رہی تھی۔ ''علی کہاں ہے اس کو بلاؤ۔'' وہ چیخ رہی تھی۔

''آمنہ ہوش میں آؤ۔'' عثمان نے اسے جھنجوڑا تھا۔ ''علی اب اس دنیا میں نہیں ہے۔''

''نہیں علی نہیں مر سکتا۔ وہ مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' وہ بازو چھڑا کر باہر کمروں میں پھرنے لگی۔

''علی کہاں ہو تم؟ علی.....!'' عثمان سے اس کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ اس کے پیچھے بھاگا اس کا بازو پکڑا۔ وہ چیخی۔ ''چھوڑ دو مجھے علی کے پاس جانا ہے۔''

''بس آمنہ ہوش میں آؤ علی سے ملنا ہے نا آؤ میں تمہیں دکھاؤں۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑے اسے اس کمرے میں لے گیا جہاں علی کی ڈیڈ باڈی رکھی تھی۔ اس نے علی کے منہ سے چادر ہٹائی۔ ''یہ دیکھو۔'' آمنہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ایک روبوٹ کی طرح چلتی ہوئی وہ آگے بڑھی علی کو چھو کر دیکھا تو جیسے اس کے جسم میں کرنٹ لگا۔ دوبارہ چھونے کی ہمت نہ رہی۔

''علی.....!'' وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ ''علی اٹھو پلیز مجھے چھوڑ کے مت جاؤ۔ میں مر جاؤں گی تمہارے بغیر۔ علی!'' وہ روتے روتے بے ہوش ہو گئی۔ عثمان نے اسے بامشکل تھاما۔

☆.....●.....☆

''فاروق بھائی پلیز اسے گھر لے جائیں اس وقت اسے آپ کی بہت ضرورت ہے۔'' عثمان کے بہت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سمجھانے پر فاروق مان گیا۔ آمنہ کو گھر آئے آج مہینہ ہوگیا تھا۔ فاروق تو اس کے سامنے آنا بھی پسند نہ کرتا تھا۔ اسے آمنہ سے نفرت ہوگئی تھی اور آمنہ خود بھی فاروق بھائی سے نظر ملانے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔ بلکہ گھر کے کسی بھی فرد سے وہ بات نہ کرتی اماں ممتا کی ماری نے آمنہ کو پھر سے اپنا لیا تھا۔ آمنہ کی طبیعت بہت خراب تھی تو عثمان اسے دیکھنے آیا تھا۔ وہ صدیوں کی مریض لگ رہی تھی۔ ''آپ کچھ کھاتی پیتی نہیں ہیں؟ کتنی کمزور ہوگئی ہیں۔'' وہ اس کو باتوں میں انوالو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''مجھے کچھ نہیں چاہیے بس موت کے سوا۔'' ''ایسی باتیں نہیں کرتے ابھی تو آپ کو علی کے لیے جینا ہے کل کو اس کی اولاد کے لیے۔ اچھا آپ گھر سے باہر کیوں نہیں جاتیں۔ ثمن بھابی آپ کی شکایت کر رہی تھیں۔'' عثمان نے بات بدلنے کی کوشش کی پر وہاں خاموشی ہی تھی۔

اس ایک مہینے میں عثمان ہفتے میں دو بار اس سے ملنے آتا رہا۔ عثمان کی یہی کوشش تھی کہ وہ آمنہ کو پھر سے زندگی کی طرف لے آئے۔

''عثمان آپ جانتے ہیں میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا وہ میرے کیے کی سزا تھی۔ میں نے کتنے دل توڑے۔ آپ کا' اماں کا' ابا کا' بھائی بھابی سب کا کسی کی بددعا لگ گئی مجھے۔'' وہ پھر سے رونے لگی۔

''ایسے مت بولو جو ہوتا ہے خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تم نے وہ کیا جو تمہیں ٹھیک لگا۔ میں تمہاری جگہ ہوتا تو شاید میں بھی یہی کرتا۔'' عثمان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''اچھا اب میں چلتا ہوں۔ ہوسکا تو کل آؤں گا۔'' اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

''عثمان!'' آمنہ نے اسے آواز دی۔ اس نے پلٹ کر حیرانی سے دیکھا۔

''جی؟''

''عثمان آپ اب مت آیا کریں میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ اب مجھے ڈاکٹر کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ اپنا قیمتی وقت برباد مت کیا کریں یہاں آ کر۔'' عثمان کو اس کے الفاظ نہ جانے کیوں چبھ سے رہے تھے۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا اور پھر کچھ کہے بغیر وہاں سے نکل گیا۔

ثمن دیکھو کتنا اچھا لڑکا ہے نا ہماری آمنہ کا کتنا خیال رکھتا ہے اماں اور بھابی سبزی کاٹ رہی تھیں۔ بس اللہ کرے کہ میری آمنہ کا گھر بس جائے۔''

''ہاں اماں عثمان بھائی بہت اچھے ہیں۔ آمنہ کا رشتہ پھر سے جڑ جائے تو کیا ہی اچھا ہو۔''

''بس دعا کرو کہ کچھ ایسا ہی ہوجائے۔''

☆.....●.....☆

''زیفی پلیز دروازہ کھول یار!' اذان کب سے دروازہ بجا رہا تھا۔ ''زیفی..... زیفی!'' زیفی نے دروازہ کھول ہی دیا۔

''شکر ہے تم نے دروازہ کھول دیا ورنہ میں توڑ دیتا۔'' زیفی ابھی بھی بہت غصے میں تھا کچھ نہ بولا اذان اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''زیفی میری طرف دیکھو اور میری بات توجہ سے سنو۔ تم جانتے ہو نا کہ ماموں کا سلوک ہم سے کیسا ہے تو پھر تم کیوں اس بات کو مان نہیں لیتے کہ جو تم چاہتے ہو ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ اماں نے تمہیں کتنا سمجھایا پر تم سمجھتے ہی نہیں۔''

''نہیں سمجھنا مجھے کچھ۔'' اس کی آواز میں شدت تھی۔ ''میں مر جاؤں گا یا ان کو مار ڈالوں گا اور یہ تم کان کھول کر سن لو۔'' وہ چیختا ہوا باہر نکل گیا۔ اذان ابھی بھی شاک میں تھا اور وہ جانتا تھا کہ زیفی اپنی ضد کا کتنا پکا ہے۔

''امی میں زیفی سے ہی شادی کروں گی ابا کو بتا دیں اگر میرے ساتھ کسی نے زبردستی کی تو میں سب کے سامنے شادی سے انکار کر دوں گی۔'' ثمن نے کھینچ کر تھپڑ زارا کے منہ پر مارا۔

''خبردار جو ایسی بات آئندہ کبھی کی تو تمہارے ابا کو پتا چلا تو شادی تو دور تمہاری جان لے لیں گے سمجھی۔'' زارا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ثمن نے اسے گلے سے لگا لیا۔

''میری بچی صبر کر میں انہیں منانے کی کوشش کروں گی تو بس مجھ پر بھروسا رکھ سب ٹھیک ہوجائے گا۔

ثمن فاروق کی آواز سنتے ہی چوکنا ہوئی۔

''اے سن زارا باپ کے سامنے ایسی الٹی سیدھی باتیں مت کرنا میں باہر جاتی ہوں تو ان کے سامنے مت آنا۔'' وہ اسے سمجھا کر چلی گئیں۔ زارا نے اپنا منہ تکیے میں دے دیا اور پھر سے رونا شروع کر دیا۔

''جی آپ نے بلایا۔''

''ہاں' بیٹھو ذرا۔ وہ کل جمال بھائی اور بھابی آئیں گے زارا کو منگنی کی انگوٹھی پہنانے اور ایک ہفتے بعد شادی کی رسم ادا کریں گے۔'' ثمن جانتی تھی کہ کچھ ایسا ہی ہوگا۔

''وہ میں کہہ رہی تھی کہ اگر زیفی سے.....!''

''تم جانتی ہو کہ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا تو پھر بار بار وہی بات دہرانے کا کیا فائدہ؟''

''پر اگر زارا نہ مانی تو؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ غصے میں آ گیا۔

''اگر زارا نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو میں بھول جاؤں گا کہ وہ میری بیٹی ہے جان لے لوں گا اس کی۔ سمجھ میں آئی۔ اسے بھی سمجھا دینا۔''

☆.....●.....☆

آمنہ کافی دن ہوگئے عثمان یہاں نہیں آیا۔'' ثمن کپڑے الماری میں رکھتے ہوئے آمنہ سے پوچھ رہی تھی۔

''مجھے کیا پتا ان کی اپنی زندگی ہے' مصروف ہوگا اور ویسے بھی کیا کرے گا یہاں آ کر۔'' اس کا لہجہ عجیب تھا۔ ثمن کا ہاتھ رک گیا۔

''آمنہ ایک بات کہوں؟''

''ہاں کہو۔''

''تم عثمان سے شادی کرلو۔'' آمنہ نے نظر اٹھا کر ثمن کو دیکھا۔

''بھابی میں کسی کی زندگی خراب نہیں کرنا چاہتی۔ میں عثمان کو کبھی وہ محبت وہ پیار نہیں دے سکوں گی جس کا وہ حق دار ہے اور ویسے بھی میں اپنے حصے کی محبت کر چکی۔ جو ایک بار ہی ہوتی ہے بار بار نہیں۔''

''تو کیا تم ساری زندگی ایسے ہی گزارو گی؟''

''نہیں میرا علی میرے ساتھ ہے ہر وقت سائے کی طرح' میری زندگی کے لیے اس کی یادیں ہی کافی ہیں۔''

☆.....●.....☆

آمنہ کاش تمہیں پتا ہوتا کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔ ہم دونوں کے نام ایک ساتھ کتنے اچھے لگتے ہیں نا۔ آمنہ عثمان۔ پر شاید یہ نام کبھی جڑ نہیں پائیں گے۔ عثمان اپنی ڈائری میں اپنے دل کی ہر بات لکھتا تھا۔ وہی اس کے دل کی کتاب تھی جسے پڑھنے والی پڑھنا نہیں چاہتی تھی۔ عثمان کے فون کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔

''ہیلو کون؟'' اور آواز نے اسے حیران کر دیا۔ دوسری طرف آمنہ تھی۔

''عثمان میں آمنہ' وہ امی کی طبیعت خراب ہے کیا آپ آسکتے ہیں۔'' ایک دفعہ پھر سے مایوسی کا ش تم کچھ اور کہنے کے لیے فون کرتیں اس نے دل میں سوچا۔

''اوکے میں آتا ہوں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انہیں ریسٹ کی ضرورت ہے اور یہ دوائیاں بھی منگوا
ں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
''پلیز آپ چائے پی کر جایئے گا۔'' آمنہ نے زور
یتے ہوئے کہا۔ اس نے آمنہ کی طرف کھا جانے والی
طروں سے دیکھا۔
''مجھے چائے اچھی نہیں لگتی۔'' اور وہ چلا گیا۔ آمنہ
یرانی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہ گئی۔
آمنہ کو بار بار عثمان کا وہ رویہ یاد آ رہا تھا۔ آج اس
نے مجھے اتنا اگنور کیوں کیا؟ کیا اُسے مجھ سے نفرت
ہے؟ نہیں ایسا نہیں اسے تو مجھ سے بہت محبت تھی۔ پھر
ایسا رویہ کیوں؟ پر میں کیوں اس کے بارے میں اتنا
سوچ رہی ہوں۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ میرے دل و
ماغ پر کیوں چھایا ہوا ہے؟ کیا مجھے بھی اس سے محبت
ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہے میں اس سے کیسے محبت کر سکتی
ہوں افوہ میرا دماغ کیوں الجھ رہا ہے؟ اس کا موبائل
بجنے لگا اسکرین پر عثمان کا نام دکھائی دے رہا تھا۔ وہ
شش و پنج میں تھی۔
''ہیلو۔''
''آمنہ مجھے آج تم سے کچھ کہنا ہے تمہیں پتا ہے میں
نے تمہیں پہلی بار دیکھتے ہی اپنے دل میں بسا لیا تھا۔ تم
کیسری رنگ کا لباس پہنے ہوئے کتنی پیاری لگ رہی
تھیں۔ میرا بس چلتا تو اسی وقت تمہیں اپنی دلہن بنا لیتا پر
میری قسمت نے مجھے ہمیشہ دھوکا دیا آمنہ۔ بچپن سے
لے کر آج تک میں نے جو چاہا وہ مجھے مل کر بھی نا ملا۔ تم
بھی تو مجھے مل کر بھی نا ملیں۔ میں کتنا خوش تھا۔ کتنے
ارمانوں سے دلہا بنا تھا میں۔ میرا کیا قصور تھا آمنہ! کیا
قصور تھا میرا؟ تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا'
کیوں؟'' آمنہ میں کچھ بولنے کی ہمت نہ تھی۔ وہ چپ
چاپ سنتی رہی ''تم کیا جواب دو گی تم تو پتھر دل ہو کسی
کے احساسات تمہیں سمجھ نہیں آئیں گے۔ جاؤ سو جاؤ۔''
فون کٹ گیا۔ آمنہ سے نا جانے وہ کیا کیا کہہ گیا جس کی
آمنہ کو توقع نہ تھی۔ فون ابھی بھی آمنہ کے کان کے ساتھ
ہی لگا تھا۔ آمنہ سے اس کی باتیں ہضم نہیں ہو رہی
تھیں۔

☆.....●.....☆

''ارے نفرت ہے مجھے اس سے۔'' فاروق چلا رہا
تھا۔
''پر وہ آپ کی بہن ہے۔'' ثمن اسے سمجھانے کی
ناکام کوشش کر رہی تھی۔
''بہن میری بہن اسی دن مر گئی جس دن اس نے
اس گھر سے قدم باہر رکھا تھا۔ اس کی وجہ سے میرے
باپ نے خود کو مار ڈالا۔ میں کبھی نہیں بھول سکتا یہ اس گھر
میں کیسے برداشت کر رہا ہوں یہ میں جانتا ہوں سمجھ
آئی۔'' آمنہ نے فاروق کی ساری باتیں سن لی تھیں اس
کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے روتے روتے وہ اپنے
کمرے میں بھاگ گئی۔ اس کا فون پھر سے بجنے لگا
روتے روتے اس نے فون اٹھایا۔
''ہیلو ہیلو۔''
''آمنہ میں عثمان وہ مجھے سوری بولنا تھا۔ کل میں
نے پتا نہیں آپ کو کیا کیا بول دیا۔''
''نہیں عثمان۔'' وہ روتے روتے بولی سوری تو مجھے
کہنا چاہیے کتنی زندگیاں برباد کر دیں میں نے۔''
''آمنہ آپ مجھ سے شادی کریں گی؟'' سوال اتنی
جلدی تھا کہ جواب نا بن پایا۔ آمنہ چپ ہو گئی۔ عثمان
نے اس کی خاموشی کو محسوس کر لیا تھا۔ ''آپ مجھے کل
جواب دے دیجیے گا۔ میں جانتا ہوں آپ اس وقت کسی
کنڈیشن میں ہیں۔ مجھے آپ کے جواب کا انتظار رہے
گا۔ میں فون رکھتا ہوں۔'' اس نے فون بند کر دیا اور
آمنہ کی نیند پھر سے اڑ گئی۔
عثمان آمنہ کا نمبر لگا رہا تھا پر آمنہ فون نہیں اٹھا رہی

تھی۔ ''بیٹا کسے فون ملا رہے ہو۔''
''وہ امی آمنہ کو۔''
''آمنہ کو؟'' ماں نے بڑی حیرت سے پوچھا۔
''امی مجھے آمنہ سے شادی کرنی ہے۔'' عثمان نے
ہمت کر کے ماں کے سامنے اپنے دل کی بات رکھ دی۔
''کیا؟ عثمان تم پاگل تو نہیں ہو گئے؟'' اتنے میں
نوکرانی آن پہنچی۔
''صاحب جی آپ کا فون ہے۔'' عثمان نے اس کی
بات اَن سنی کر دی۔
''امی پلیز میں آمنہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''
''تمہارا دماغ خراب ہے؟ تم اس لڑکی سے شادی
کرنا چاہتے ہو۔ جس نے تمہارا تماشا بنا کر رکھ دیا تھا۔
گھر سے بھاگ گئی تھی وہ اپنے عاشق کے ساتھ' کیا پتا
کل کو کس کے ساتھ بھاگ جائے۔''
''امی پلیز۔'' ماں کی باتیں اسے چبھ رہی تھیں۔
''نا بیٹا نا میرے جیتے جی ایسا ممکن نہیں میں نے
تمہارا رشتہ پکا کر دیا ہے۔ اب تم اپنی شادی کی تیاریاں
کرو اور سب بھول جاؤ۔'' وہ کہتے ہوئے کمرے سے
نکل گئیں۔ عثمان بے بس کھڑا رہ گیا۔
آمنہ اپنے کمرے میں بیٹھی روئے جا رہی تھی۔
عثمان کا فون پھر سے آنے لگا۔
''ہیلو ہیلو آمنہ کیسی ہیں آپ؟''
''میں ٹھیک ہوں آپ کیسے ہیں؟''
''میں بھی ٹھیک ہوں۔'' ایک لمبی خاموشی کے بعد
آمنہ نے بات شروع کی۔
''عثمان مجھے پتا ہے آپ میری بات کو سمجھیں گے
اور میری مجبوری بھی میں آپ کو وہ خوشی کبھی نہیں دے
سکوں گی جس کے آپ حق دار ہیں۔ میرا اور آپ کا کوئی
میچ نہیں اور آپ کو مجھ سے ہزار گنا زیادہ اچھی لڑکی مل
جائے گی۔ آپ میرے لیے اپنی لائف برباد مت
کریں۔ میں آپ کو کبھی خوشی نہیں دے سکتی۔ میری
زندگی میں نے علی کے نام کر دی ہے اور اسی کے نام سے
ہی گزار دوں گی۔ امید ہے کہ آپ مجھے غلط نہیں سمجھیں
گے۔'' پھر سے ایک لمبی خاموشی پلیز آپ آئندہ اس
بارے میں کوئی سوال مت پوچھیے گا۔ اب میں فون رکھتی
ہوں۔ آمنہ نے جھٹ سے فون کاٹ دیا اور پھر سے
پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کیسے بتاتی عثمان کو کہ جب
اس نے عثمان کی مس کالز دیکھیں تو کال بیک کیا پر عثمان
کا نمبر بند تھا پھر سوچا اس وقت علی گھر پے ہی ہو گا گھر کا
نمبر ملایا تو نوکرانی جب عثمان کو بلانے گئی تو عثمان اور اس
کی ماں کے درمیان ہونے والی ساری باتیں اس نے
سن لیں تھیں۔ ایک دفعہ پھر آمنہ کو اپنی قسمت پر افسوس
ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی محبت دوبارہ کھو دی تھی اور آج
اسے پتا چلا گیا کہ محبت پھر سے بھی ہوتی ہے۔
عثمان کی شادی اس کی ماں کی مرضی سے ہو گئی۔ اللہ
نے آمنہ کو دو جڑواں بیٹے دیئے جن کے نام اذان علی اور
زیان علی رکھا۔ اذان کوزی اور زیان کوزلیفی کے نام سے
پکارتی۔ فاروق کی بیٹی کا نام زارا رکھا گیا۔ آمنہ نے
ساری عمر شادی نا کرنے کا فیصلہ کر لیا فاروق کی نفرت
آمنہ کے لیے ویسی ہی تھی۔ وقت گزرتا رہا اور یوں بیس
سال گزر گئے۔

☆.....●.....☆

''تو آج ہم آپ کو بتائیں گے کہ بالوں کی کٹنگ
کیسے کی جاتی ہے۔'' زارا نے محلے بھر کے بچوں کو جمع کر
رکھا تھا اور ان میں سے ایک لڑکی کے بالوں پر قینچی چلنے
والی تھی۔ ''تو قینچی کو یوں پکڑیئے اور یوں بالوں کے
قریب لائیے۔
''آپا! ابا.....!'' چھوٹے نومی نے زارا کو خبر دی زارا
کے ہاتھ کا نے قینچی چل پڑی ایک بڑا سا کٹ اس لڑکی
کے بالوں کو لگا سب بچوں کے منہ سے ہا کی آواز ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساتھ نکلی۔ زارا کا دل زور سے دھڑکا۔

"ہائے اللہ یہ میں نے کیا کردیا۔ یہ نیا فیشن ہے چلو تم سب اب اپنے اپنے گھروں کو جاؤ۔" اس نے سب بچوں کو بھگا دیا۔ خود دوپٹا سر پر رکھا اور نومی کے ساتھ کمرے کی طرف بھاگی۔

"السلام علیکم ابا۔"

"وعلیکم السلام کیا ہو رہا تھا۔"

"وہ کچھ نہیں پیپر کی تیاری کر رہی تھی۔"

"شاباش، شاباش دیکھا میری بیٹی کتنی لائق ہے اور وہ دونوں بھائی توبہ.....!"

"ابا میں جاؤں پیپر تیار کرنا ہے۔"

"ہاں ہاں جاؤ۔"

"نومی خبردار جو آپا کو ڈسٹرب کیا تو۔"

"جی ابا۔" نومی نے بھی سر ہلا دیا زارا جلدی جلدی اپنے کمرے میں بھاگی۔ "شکر ہے جان بچ گئی۔"

"ابھی بچی کہاں وہ دیکھو آپا ذرا۔" کھڑکی سے باہر دیکھتے ہی زارا کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ جس لڑکی کے بالوں کو اس نے کٹ لگایا تھا اس کی ماں اس کا ہاتھ پکڑے گھر میں موجود تھی۔

"کہاں گئی آپ کی بیٹی۔ بھائی صاحب دیکھیں میری بیٹی کے بالوں کا کیا حشر کیا اس نے۔" ابا حیران ہوئے۔

"نہیں، نہیں جی آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہماری زارا تو اپنا پیپر تیار کر رہی ہے۔"

"بھائی صاحب غلط فہمی آپ کو ہوئی ہے ابھی ابھی تو یہ حال اس نے کیا ہے۔" زارا کا دل کانپنے لگا فاروق نے زارا کو آواز دی۔ "مر گئے آج تو۔" زارا ڈرتے ڈرتے سامنے آئی۔

"زارا جو میں نے سنا وہ سچ ہے کیا؟" زارا کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ نظریں نیچے جھک گئیں۔ فاروق کو غصہ تو بہت آیا پر قابو پالیا اور اس عورت سے معافی مانگی اور پھر جو زارا کی کلاس ہوئی وہ تو پوچھیے ہی مت۔

زیفی کا ہنس ہنس کر برا حال تھا۔ نومی بڑے فخر سے زارا کے کارنامے سنا رہا تھا۔

"نومی کے بچے اب چپ ہو جاؤ۔ ورنہ چھوڑوں گی نہیں زی بھیا۔ دیکھیں نا کیسے زیفی مجھ پر ہنس رہا ہے۔" زی اپنی کتابوں میں مصروف تھا بھائی تم دونوں کا آپس کا مسئلہ ہے ہر وقت ایک دوجے کی ٹانگ کھینچتے رہتے ہو۔ مجھے تو دور ہی رکھو۔"

"او کے میں چلی۔" وہ غصے سے اٹھی زیفی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"اجی کدھر چلے ہمیں چھوڑ کر۔" وہ غصے سے مڑی۔

"وہاں جہاں آپ نا ہوں۔"

"ہائے جہاں جہاں آپ وہاں وہاں ہم ہر جگہ ساتھ ساتھ۔"

"او اچھا۔" وہ سارا غصہ بھول گئی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ چہرے پر شرارتی سی مسکان۔

"اہم اہم۔" دونوں زی کے کھانسنے پر چونکے۔

"تم دونوں شاید بھول گئے کہ اس کمرے میں اور بھی کوئی موجود ہے۔" زارا شرمندہ ہوگئی ہاتھ چھڑا کر بھاگ گئی۔

"زی تم بھی نا۔" زیفی بھی ہنسا۔

زی، زیفی اور آمنہ گھر کے اوپری حصے میں رہتے تھے جب کہ باقی نیچے۔ زیفی اور زارا دونوں بچپن سے ہی ایک دوسرے کے ساتھ ہی رہے اور بڑے ہوتے ہوتے ان کا پیار بھی بڑھتا گیا۔ دونوں لڑتے بھی رہتے اور ساتھ بھی رہتے۔ فاروق کو زی، زیفی اور آمنہ سے آج بھی اتنی ہی نفرت تھی جتنی کہ کل اور زیفی سے تو خصوصی طور پر کیونکہ اس کی شکل کافی حد تک علی سے ملتی تھی۔

زیفی غصے کا بہت تیز تھا ذرا سی بات بھی برداشت

نہیں کرتا تھا۔ روز کسی نا کسی سے جھگڑے چلتے ہی رہتے۔ آمنہ اور زی اس کو سمجھاتے رہتے پر وہ کسی کی کب سنتا بس اپنی ہی کرتا تھا۔

"امی میری شرٹ تھی یہاں استری کے لیے آج مجھے کالج جانا تھا۔ پارٹی ہے میری دیر ہو رہی ہے۔" زیفی اپنی شرٹ ڈھونڈ رہا تھا۔

"ارے بیٹا وہ تو زارا استری کے لیے لے گئی۔"

"زارا لے گئی۔"

"اوشٹ.....!" وہ نیچے بھاگا پر تب تک کام ہو چکا تھا۔ زارا شرٹ کے بڑے سے سوراخ سے اسے ہنستے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ وہ بھاگا اسے دیکھ کر زارا نے بھی راہ فرار اختیار کیا۔

"آج نہیں چھوڑوں گا تمہیں میں نے منع کیا تھا نا میری شرٹ کو ہاتھ مت لگانا۔"

"اور میں نے بھی تمہیں پارٹی پے جانے سے منع کیا تھا نا۔ وہاں وہ چڑیل جو آئی ہوگی اسی لیے بن سنور کر جانا تھا نا تمہیں۔" زارا گارڈن کی طرف بھاگ رہی تھی اور زیفی اس کے پیچھے۔

"ہاں تمہیں جلن ہو رہی تھی نا اس سے اسی لیے تم نے میری نئی شرٹ جلا دی۔ آج تم گئی۔" زارا اندر بھاگ گئی۔ زیفی بھی پیچھے بھاگا گارڈن سے گزرتے ہوئے باہر کے گیٹ کے قریب پہنچا ہی تھا کہ فاروق سے زوردار ٹکر ہوگئی۔ فاروق ابھی ابھی گھر میں داخل ہوا تھا۔ کھینچ کر تھپڑ زیفی کے گال پر دے مارا۔ "اندھے ہو کیا دیکھ کر نہیں چلتے نکمے، کوئی تمیز نہیں سکھائی تمہاری ماں نے تمہیں۔" فاروق شروع ہوگیا۔ زیفی سے غصہ ضبط نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اپنی مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ زیفی پھٹ پڑتا زی وہاں آن پہنچا۔

"سوری ماموں.....!"

"ارے جاؤ، سوری ماموں لے جاؤ اسے یہاں سے۔" فاروق آگے بڑھ گیا۔ زیفی پیچھے لپکا پر زی نے اسے کنٹرول کر لیا اور اسے اوپر لے گیا۔

"آئی ایم سوری زیفی میری وجہ سے تمہیں ابا سے ڈانٹ پڑی۔" زارا زیفی سے معافی مانگ رہی تھی۔

"پلیز ابا کی باتوں کا برا مت ماننا۔ وہ دل کے بہت اچھے ہیں۔" زیفی چپ چاپ اس کی باتیں سنتا رہا۔

"آج کل وہ غصے میں رہتے ہیں تم دیکھنا ہماری شادی پر کیسے تمہیں گلے لگائیں گے۔" وہ مسکرا دیا۔

"زارا ہماری شادی ہوگی نا؟"

"ہاں زیفی ضرور ہوگی اور بہت دھوم دھام سے ہوگی بچی۔"

"زارا اگر مجھے تم نا ملیں تو میں مر جاؤں گا۔"

"اللہ نہ کرے زیفی تم ایسی باتیں مت کیا کرو پلیز۔" وہ پریشان ہوگئی۔

"زارا میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا تم ساری زندگی میرے ساتھ رہو گی نا۔"

"ہاں زیفی ساری عمر وعدہ پکا وعدہ۔" مسکان دونوں کے چہرے پر آئی۔

ماں کی گود میں سر رکھے وہ لیٹا ہوا تھا آمنہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

"امی!"

"ہاں میری جان۔"

"امی، وہ میری اور زارا کی شادی کی بات کریں نا۔" آمنہ کا ہاتھ رک گیا۔

"زیفی کوئی اور لڑکی دیکھ لو بیٹا میں پہلے بھی تمہیں سمجھا چکی ہوں۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"امی پلیز میں بھی آپ کو کئی دفعہ بتا چکا ہوں کہ مجھے بس زارا سے ہی شادی کرنی ہے۔ امی میں اس کے بغیر نہیں رہ پاؤں گا اور نہ وہ میرے بغیر۔ پلیز امی آپ بات کریں ماموں سے پلیز میری خاطر پلیز۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''میری جان تم دونوں کی خاطر تو میں سب کچھ کر سکتی ہوں چلو ٹھیک ہے میں بات کرتی ہوں۔''

''کیا باتیں ہو رہی ہیں۔'' زی بھی آن پہنچا۔

''بھیا میری شادی کی باتیں ہو رہی ہیں۔''

''لو جی ہم سے پوچھا بھی نہیں کہ ہماری بھی شادی کی عمر ہو گئی ہے۔ کوئی ہمارے ہاتھ بھی پیلے کرا دو۔''

''ارے بے شرموں شرم کرو اپنی شادی کی باتیں خود کرتے ہو تم دونوں کو شرم نہیں آتی۔'' آمنہ نے ہلکا سا تھپڑ لگایا۔

''ارے امی اس زمانے کیا شرمانا اب تو دلہنیں خود کہتی ہیں کب ڈولی لے کر آؤ گے۔'' زی نے فلمی انداز اپنایا۔ ایک قہقہہ کمرے میں گونجا۔

''بھیا مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔'' آمنہ بڑی ہمت کر کے فاروق سے بات کرنے گئی۔

''کہو۔'' جواب بہت مختصر ملا۔

''وہ بھیا میں زارا کا ہاتھ زیفی کے لیے مانگنے آئی ہوں۔'' فاروق نے غصے کے عالم میں آمنہ کو دیکھا۔

''کیا کہا تم نے' زارا کا ہاتھ؟ تم نے یہ بات سوچ بھی کیسے لی' تمہیں میری ہی بیٹی نظر آئی اپنے اس آوارہ بیٹے کے لیے جسے میں دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا اور تم رشتہ لے آئیں۔ فاروق کی آواز بلند ہونے لگی زیفی اور زی تک بھی فاروق کی آواز جانے لگی۔ ''بھائی! وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔''

''ارے چپ ہو جاؤ۔ پسند کرتے ہیں یہ ساری تمہاری غلطی ہے تمہیں نے اپنی نکمی اولاد کو ایسا بنا دیا ہے جیسی کہ تم خود ہو۔'' آمنہ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

زیفی سے نا رہا گیا اور زی کے لاکھ منع کرنے پر بھی وہ نہ رکا اور فاروق کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''خبردار جو میری ماں کو کچھ کہا آپ نے۔ بچپن سے لے کر آج تک میں نے آپ کا ہر الزام برداشت کیا ہے پر آج نہیں۔''

''زیفی چپ ہو جاؤ۔''

''نہیں امی آج مجھے بولنے دیں۔''

''ارے بولو کیا بولنا ہے تمہیں میں بھی تو سنوں۔ تم کیا بولو گے میں بولتا ہوں نفرت ہے مجھے تم سے تمہاری ماں سے تمہارے باپ سے سوچنا بھی مت کہ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دوں گا میں نے اپنی بیٹی کا رشتہ طے کر دیا ہے دفع ہو جاؤ اب یہاں سے۔'' زی نے بڑی مشکل سے زیفی کو قابو میں کیا اور ماں کے کمرے میں لے آیا۔ آمنہ پر فاروق کی باتیں بجلی کی طرح گریں۔ لاچار قدموں سے وہ سیڑھیاں چڑھتی اپنے کمرے میں پہنچی آگے زیفی غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔

''وہ ہوتے کون ہے ایسی باتیں کرنے والے میں انہیں چھوڑوں گا نہیں اور زارا کی شادی مجھ سے ہو گی۔ صرف مجھ سے سب گھر والے پھر سے جمع ہو گئے۔ امی میں انہیں نہیں چھوڑوں گا۔''

''تڑاخ۔'' ایک زور دار تمانچہ لگانے کے بعد وہ چیخی۔ ''دفع ہو جاؤ اپنے کمرے میں۔'' زیفی نے ایک نظر ماں کو دیکھا پھر سر جھکایا اور چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا گیا باقی سب بھی نظریں چرائے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

آمنہ بیگم آنکھوں میں آنسو لیے لڑکھڑاتے ہوئے اپنے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئی اور بے اختیار ان کے منہ سے یہ ہی الفاظ نکلے۔ ''فاروق بھائی آپ نے میرے بیٹے کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔'' آنکھیں بند کیے ٹیک لگائے وہ خود پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔

''شاید اس میں ساری غلطی میری ہی ہے نا میں اتنا بڑا قدم اٹھاتی نا آج یہ سب ہوتا۔ شاید میری ہی غلطی

ہے۔''

☆.....●.....☆

اگلے دن جمال بھائی اپنے بیٹے کے لیے زارا کے ہاتھ میں انگوٹھی پہنانے آن پہنچے۔ زیفی گھر پر نہیں تھا۔ زارا نے ماں باپ کی عزت رکھ لی اور چپ چاپ منگنی کی انگوٹھی اپنے ہاتھ میں سجا لی۔ آمنہ اور زی مہمانوں کی طرح شامل ہوئے۔

''زارا تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتی۔'' وہ چیخ رہا تھا۔

''زیفی پلیز سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں مجبور ہوں۔''

''مجبور ہو؟ تم نے میرے بارے میں سوچا میرا کیا ہو گا زارا میں مر جاؤں گا۔''

''زیفی تم اپنے آپ کو سمجھا لو میری شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم بھی.....!''

''شٹ اپ زارا کان کھول کر سن لو میں تم سے ہی شادی کروں گا ورنہ میں مر جاؤں گا۔ سنا تم نے۔''

''زیفی اب میں اپنے ماں باپ کی بات نہیں ٹال سکتی پلیز تم سمجھنے کی کوشش کرو اور سب بھول جاؤ۔'' زارا نے دل پر پتھر رکھ لیا تھا۔ نا جانے یہ سب کہنے کو اس میں اتنی ہمت کہاں سے آئی۔ زیفی اس کی طرف حیرت سے تکنے لگا۔ جیسے اس پر کسی نے بجلی گرا دی ہو۔ زارا وہاں سے چلی گئی۔ زیفی کا خون کھولنے لگا۔

''زیفی دروازہ کھول یار.....!'' زی کب سے دروازہ بجا رہا تھا پر زیفی کی طرف سے کوئی جواب نا پا کر اب اسے پریشانی سی ہونے لگی۔ اس نے دروازہ اور زور سے بجایا پر کوئی جواب نا پا کر اس نے دروازے کو توڑنے کا فیصلہ کیا۔ جب دروازہ ٹوٹا تو زی کے ہوش اڑ گئے۔ زیفی بیڈ پر پڑا تھا۔ اس کے منہ سے جھاگ چھوٹ رہی تھی۔ اس نے زہر کھا لیا تھا۔ زی بجلی کی تیزی سے اس کے پاس پہنچا اتنے میں آمنہ بھی آن پہنچی زیفی کی حالت دیکھ کر اس نے چیخنا شروع کر دیا۔ سارا گھر جمع ہو گیا۔ زارا پر بجلی گر پڑی وہ دروازے کے پاس بت بنی کھڑی رہی۔ فاروق کو بھی ایک دھچکا لگا۔

پورا گھر اسپتال میں موجود تھا۔

''عثمان پلیز میرے بیٹے کو بچا لو پلیز۔ میں مر جاؤں گی۔''

''پلیز۔'' آمنہ روئے جا رہی تھی۔ ''آمنہ پلیز حوصلہ کرو۔ ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔''

''آپ کو کیا ملا میرا بیٹا مجھ سے چھین کر اگر اسے کچھ ہوا تو میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ مانا کہ مجھ سے غلطی ہوئی جس کی سزا میں آج تک بھگت رہی ہوں۔ مجھے معافی ملنی چاہیے تھی۔ بہت سزا کاٹی میں نے آج اس غلطی کی سزا پھر سے مجھے ملی میرا بیٹا زندگی اور موت سے لڑ رہا ہے۔'' آمنہ روئے جا رہی تھی۔ فاروق شرمندگی سے زمین میں گڑے جا رہا تھا۔ شاید اس کو اپنے کیے کا پچھتاوا تھا۔ اتنے میں عثمان آپریشن تھیٹر سے باہر آیا۔ آمنہ پاگلوں کی طرح اس کی طرف بھاگی۔

''میرا بیٹا کیسا ہے؟ وہ ٹھیک تو ہے نا؟ تم کچھ بولتے کیوں نہیں؟''

''آمنہ..... زیفی..... زیفی اب اس دنیا..... میں نہیں رہا۔''

آمنہ پر تو جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ فاروق کے پاس افسوس اور پچھتاوے کے سوا کچھ نہ تھا۔ زارا کی چیخیں اسپتال میں گونج رہی تھیں اور زی کی تو کسی نے جیسے جان ہی نکال لی ہو۔

○

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بزمِ سخن

روبین احمد

علی ممتاز.....لاہور

خوشبو سے ہواؤں سے بھی ملتے نہیں کچھ لوگ
موسم کی اداؤں سے بھی ملتے نہیں کچھ لوگ
مل جائیں تو جیون کو سجا دیتے ہیں لیکن
بچھڑیں تو دُعاؤں سے بھی ملتے نہیں کچھ لوگ

انیق الرحمن.....کراچی

محبتوں کو میری یوں نہ آزماؤ تم
دیکھو اس طرح تو نہ مجھے ستاؤ تم
کرو پیار مجھے کچھ اس طرح سے
کہ! ہر طرف مجھے نظر آؤ تم

فرقان علی.....رحیم یار خان

نئے برس کی ساری صبحیں روشن رکھنا
نئے برس کی ساری شامیں روشن رکھنا
نئے برس میں اِک پل بھی نہ آئے جدائی
نئے برس میں شاد تو دل کا گلشن رکھنا

بشریٰ فہیم.....کھلابٹ ٹاؤن شپ

آ جا کہ ابھی ضبط کا موسم نہیں گزرا
آ جا کہ ابھی برف پہاڑوں پہ جمی ہے
خوشبوں کے جزیروں سے ستاروں کی حدوں تک
اس شہر میں سب کچھ ہے بس اک تیری کمی ہے

ساجد آرائیں.....معظم شاہ چنیوٹ

خدا سے کیا شکوہ مقدر میں کچھ نہ تھا
ہوئے جو غوطہ زن تو سمندر میں کچھ نہ تھا
دور سے دیکھا تو سبھی تھے لعل و گوہر!
پرکھا جو دوستوں کو تو اکثر میں کچھ نہ تھا

عروسہ عمران.....جھڈو

زمیں کے ذائقے چکھنے کا دَور جاتا رہا
دیئے منڈیر پہ رکھنے کا دَور جاتا رہا
رفاقتوں کے لیے فرصتیں نہیں ملتیں
محبتوں کو پرکھنے کا دَور جاتا رہا

امبر ریحان.....گوجرانوالہ

ہمیشہ اوج پر دیکھا مقدر ان ادیبوں کا
جو ابن الوقت ہوتے ہیں ہَوا کے ساتھ چلتے ہیں
بہر صورت مسائل کو تو حل کرنا ہی پڑتا ہے
مسائل ایسے سائل ہیں کہاں ٹالے سے ٹلتے ہیں

اقصیٰ.....گوجرانوالہ

سوچا نہیں اچھا برا دیکھا سنا کچھ بھی نہیں
مانگا خدا سے رات دن تیرے سوا کچھ بھی نہیں
سوچا تجھے، دیکھا تجھے، چاہا تجھے، پوجا تجھے
میری خطا میری وفا، تیری خطا کچھ بھی نہیں

جاوید.....ٹنڈو جان محمد

جب نئے سال کی تاریخوں سے پردہ اٹھایا
دکھ کی ہر پرت پہ اپنا ہی نام پایا
اس لیے بھی ٹوٹ کے بکھرنا تھا، سو بکھر گئے
شہر میں کسی کو ہم مزاج نہ پایا

تہمینہ.....ڈگری

میں نے مانا کہ تقدیر کا لکھا ہے اٹل
میرا ایمان ہے دعاؤں میں اثر ہوتا ہے
اس کو مانگوں گی خدا سے میں جنوں کی حد تک
عشق جب حد سے گزرتا ہے امر ہوتا ہے

عبدالحق.....کراچی

لبوں پہ گیت تو آنکھوں میں خواب رکھتے تھے
کبھی کتابوں میں ہم بھی گلاب رکھتے تھے
کبھی کسی کا جو ہوتا تھا انتظار ہمیں
بڑا ہی شام و سحر کا حساب رکھتے تھے

کنول آفتاب.....لاہور

ہم وہ نہیں جو تمہیں غم میں چھوڑ دیں گے
ہم وہ نہیں جو تم سے حسین ناتا توڑ دیں گے
ہم وہ ہیں اگر تمہاری سانس بھی ٹوٹ جائے
تو تمہیں اپنی سانس سے جوڑ دیں گے

سجاد اختر.....موڑ ایمن آباد

خدا کرے تیری آنکھیں ہمیشہ ہنستی رہیں
دیارِ وقت سے تو شاداں گزرتی رہے
میں مانگتا ہوں تیری زندگی قیامت تک
ہَوا کی طرح سے تو جاوداں گزرتی رہے

مظہر علی.....نواں کوٹ

منزلیں ان کا حق ہوتی ہیں طلب ہو جن کو
بے طلب لوگ تو منزل سے گزر جایا کرتے ہیں
جن کی آنکھوں میں آنسو دیکھو زندہ سمجھو
پانی جب مرتا ہے تو دریا بھی اتر جایا کرتے ہیں

سلمان.....کراچی

اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں پڑھا ہے تم کو
اپنے خوابوں کے جزیروں پہ کھڑا دیکھا ہے
کچھ کو منزل پہ بھی جا کر نہیں ملتی منزل
ہم نے قسمت کو مقدر سے لڑا دیکھا ہے

فراز.....لاہور

رکا ہوا ہے میری آنکھ میں وہ اک لمحہ
بچھڑتے وقت کسی کو میرا صدا دینا
جو کر رہے ہو محبت تو یہ دھیان رہے
بہت کٹھن ہے کسی کی یاد کو بھلا دینا

عثمان.....حویلی بہادر شاہ

وہ ہر چند رسوائی سے ڈرتا ہوگا
چھپ چھپ کے سہی مجھے یاد تو کرتا ہوگا
جب کوئی ذکر میرے پیار کا کرتا ہوگا
کتنے حیلوں سے وہ ہر بار مکرتا ہوگا

دلدار حسین.....کوٹ چھٹہ

کیا زمانہ تھا ہم روز ملا کرتے تھے
رات بھر چاند کے ہمراہ پھرا کرتے تھے
دیکھ کر جو ہمیں چپ چاپ گزر جاتا ہے
کبھی اس شخص سے ہم پیار کیا کرتے تھے

نوشاد علی.....کھبالٹ کالونی

ایک ایسا دوست بنایا جائے
جس کے آنسوؤں کو پلکوں میں چھپایا جائے
رہے اس کا میرا رشتہ کچھ ایسا
وہ رہے اداس تو ہم سے بھی نہ مسکرایا جائے

بشیر احمد آرائیں.....کوٹ غلام محمد

زندگی خواب ہونے کو ہے
اک دل ویران ہونے کو ہے
امید کا آخری دیا بھی اب بجھ جانے کو ہے
رات اپنی تاریکی کے ساتھ ہونے کو ہے

انیل.....گلگت

اب تیرا ذکر بھی شاید ہی غزل میں آئے
اور تو اور ہوئے درد کے عنوان جاناں
ہم کہ روٹھی ہوئی رت کو بھی منا لیتے تھے
ہم نے دیکھا ہی نہ تھا موسم ہجراں جاناں

دلشاد.....بہاولنگر

جس طرف نظر کروں اسی کا پرتو ہے
وہ میرے دھیان کے سب راستوں میں رہتا ہے
بچھڑ کر اس سے پریشان بہت ہوں میں بھی
سنا ہے وہ بھی بڑی الجھنوں میں رہتا ہے

عرفان محبوب.....جتوئی

باندھ لیں ہاتھ بہ سینے پہ سجا لیں تم کو
جی میں آتا ہے کہ تعویذ بنا لیں تم کو
پھر تمہیں روز سنواریں تمہیں بڑھتا دیکھیں
کیوں نہ آنگن میں چنبیلی سا لگا لیں تم کو

ندا شفیق.....مومبر آزاد کشمیر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تجھے خبر ہے تجھے سوچنے کی خاطر ہم
بہت سے کام مقدر پہ ٹال رکھتے ہیں
تمہارے بعد یہ عادت سی ہوگئی اپنی
بکھرے سوکھے پتے سنبھال رکھتے ہیں
نازش کنول......کوٹ چھٹہ

سارے وعدوں کو بھلا سکتی ہوں لیکن چھوڑو
میں تمہیں چھوڑ کر جاسکتی ہوں لیکن چھوڑو
تم جو ہر موڑ پر کہہ دیتے ہو اللہ حافظ
فیصلہ میں بھی سنا سکتی ہوں لیکن چھوڑو
عینی......چناری آزاد کشمیر

جدا ہوکر مجھ سے اور تو کچھ نہ سہی
آنکھوں کو انتظار دے گیا وہ شخص
لوٹ کے میں پھر سے آؤں گا تیرے گلشن میں
کچھ اس طرح کا اعتبار دے گیا وہ شخص
روشن آراء......نارتھ کراچی

آج تنہا ہی کسی ہمدم دیریں کی طرح
کرنے آئی ہے مری ساقی گری شام ڈھلے
منتظر بیٹھے ہیں ہم دونوں کہ مہتاب ابھرے
اور تیرا عکس جھلکنے لگے ہر سائے تلے
نسیمہ......جھڈو سندھ

یہ بے خودی یہ لبوں کی ہنسی مبارک ہو
تمہیں یہ سالگرہ کی خوشی مبارک ہو
کبھی نہ آئے کوئی غم تمہارے قریب
خلوص و پیار بھری یہ دوستی مبارک ہو
ثمرین......چناب نگر

حسیں رتوں کے مہکتے گلاب وہ لمحے
غلافِ چشم میں اب تک سنبھال رکھے ہیں
تمہیں دکھائیں تو کیسے وہ ہجر کے موسم
جو اپنے خون جگر سے اُجال رکھے ہیں
صائمہ......فیصل آباد

بچھڑنے والے تجھے دیکھ دیکھ سوچتا ہوں
تو پھر ملے گا تو کتنا بدل چکا ہوگا
ناہید......سیالکوٹ

چاہت ہے کسی کی چاہت کو پانے کی
چاہت ہے چاہت کو آزمانے کی
وہ چاہے ہمیں چاہے یا نہ چاہے
پر چاہت ہے ان کی چاہت میں مٹ جانے کی
نسیم عباس......کراچی

ٹوٹ کر چاہا جسے وہ لوٹ کر آیا نہیں
میرے دل کو اس کے سوا اور کوئی بھایا نہیں
پیار کی سودا گری میں ہم برابر ہی رہے!
اس نے کچھ کھویا نہیں اور میں نے کچھ پایا نہیں
مہک انصاری......راولپنڈی

تجھے علم ہے اے طبیب جاں، تیرا پیار میری حیات ہے
میں مریض ہو تیرے قرب کا، مجھے دور جا کے دوا نہ دے
یہاں سب اندھیر پرست ہیں، یہاں روشنی کی مجال کیا
یہ چراغ پھر بھی چراغ ہے کوئی آتے جاتے بجھا نہ دے
فیصل حمید شہزادہ.........کمالیہ

پیار کے گاہک ایسے دیکھے ہاتھ ان کے بک جانا پڑا
جنسِ وفا کم یاب سہی، پر ایسی تو نایاب نہیں
محمد سلیم پھلواری.........کمالیہ

پیمانۂ بخار سے جانچا تھا دل کا سوز
چھونے بھی ہم نہ پائے کہ پارہ اُبل پڑا

■

خوشبوسخن

سیما بنت عاصم

حمد

عظمت والا میرا خدا ہے
بے مثل واحد اور یکتا ہے
چاند ستاروں کی کرنوں سے
رات کے روشن اس نے کیا ہے
اس کی رحمت سب پر یکساں
شاہ وگدا، چھوٹا یا بڑا ہے
اس نے یہ دنیا ہے بنائی
خلق کو اس نے پیدا کیا ہے
شہہ رگ سے نزدیک ہمارے
ہر دم ہر اک کی سنتا ہے
اس کی ناؤ کبھی نہ ڈوبی
جس کو اس نے تھام لیا ہے
اس کی عنایت حد سے زیادہ
حد سے زیادہ اس کی عطا ہے
اس کی بخشش کا ہے سہارا
عاطر سرتاپا خطا ہے
(عبداللہ عاطر......بلال کالونی)

لو ایک سال اور بیت گیا......!

میرے جیون کا
تمہاری یادوں کی سنگت کا
لو ایک اور سال بیت گیا!
کچھ خوشیاں دے کر
کچھ آنسو دے کر
یہ ٹل گیا!
کیا سنائیں کہ کیا گزری
اس گزرتے سال میں
بس!
تیری یادوں کی پرچھائیں میں
لب خاموش، چشم خشک تھی
ہاں!
بارشیں بہت برسیں
مگر دل پر
اتنی کہ دریا بہہ گئے
اس جدائی میں بھی میسّر تھیں
ہمیں قربتیں کتنی!
دسمبر کی وہ یخ راتیں
نہ پوچھو کیسے گزریں
عشق کیا تم سے ہم نے کچھ اس طرح
نہ ہمارے دل پہ آنچ آئی
نہ جنوں کا رنگ پھیکا پڑا
ہونٹ پیاسے تھے مگر
گفتگو میں رس تھا
بھیس بدل کر ہی مجھے سیراب کر جاؤ
کبھی بادل بن کر، کبھی گھٹا بن کے
اس زیست میں تمہاری محبت کی طلب رہے گی
بہت لمبی رات چاہیے
ہماری طویل کہانی سنانے کے لیے
شہناز بانو......کراچی

غزل

جب دیکھنا ہی ہے تو نئے زاویے سے دیکھ
میں روشنی ہوں مجھ کو ذرا آئینے سے دیکھ
شاید تری سمجھ میں نہ آؤں بعد میں
مجھ کو مرے وجود کے اس مرحلے سے دیکھ
اے میرے گھر کے طاق میں رکھے ہوئے چراغ!
میں ٹوٹنے لگا ہوں مجھے حوصلے سے دیکھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یا اتنا پاس آ کہ مری روح میں اتر
یا پھر خدا کے واسطے کچھ فاصلے سے دیکھ
میں بت بنا کھڑا ہوں وہیں تھل کی ریت پر
اے شاہ زادی مجھ کو ذرا قافلے سے دیکھ
اس تشنگی کو اب کوئی صحرا بجھائے گا
دریا ہٹا دے آج میرے راستے سے دیکھ
میں آدمی ہوں کوئی فرشتہ نہیں میاں
تو مجھ کو میری ذات کے اس مرتبے سے دیکھ
میثم علی آغا......سیالکوٹ

کاکا مُنا

یوں تو اس کے مقدر کا تیل ہوگیا
کاکا منا جو میٹرک میں فیل ہوگیا
علت پڑھائی سے کاکے کی چھٹی ہوگئی
اس اذیت سے بچا تو صحت اچھی ہوگئی
نہ بن سکے گا کاکا منا اب سپاہی
بھرتی کے لیے میٹرک کی شرط آئی
والدین چاہتے تھے کہ کاکا دُبئی جائے
پر اب کہاں سے وہ بھلا میٹرک کی سند لائے
عمرہ کرنے جو وہ سعودی عرب پہنچ گیا
پکڑا گیا رستے میں گھر پہنچ گیا
مرغی خانہ کھولا اور مرغ فروش ہوگیا
مرغی خانے کی بد بو سے بے ہوش ہوگیا
ہوش میں آیا مُنا تو پُر جوش تھا
بیچ کر مرغی خانہ وہ اب سبزی فروش تھا
کاروبار کی بات اس کے دھیان بیٹھ گئی
جس پہ بیٹھا کاکا وہ دکان بیٹھ گئی
عبدالرحمن ساغر......آزاد کشمیر

غزل

عظمتوں کا نشان باقی ہے
راہ میں اک چٹان باقی ہے
تیری چاہت نے جو دیا مجھ کو
زخم کا وہ نشان باقی ہے
جب تلک آتا نہیں کوئی پتھر
آئینوں کی دکان باقی ہے
بے سبب تو نہیں یہ خاموشی
میرے منہ میں زبان باقی ہے
پھول مُرجھا گئے جمال مگر
ان کی زلفوں کی شان باقی ہے
سمیع جمال......کراچی

غزل

دھوپ کڑی تھی اور سر پہ کوئی سایہ نہ تھا
رہ گزر تھی ویران، میرے سوا کوئی دوسرا نہ تھا
ہَوا کے تیز جھونکوں نے جلا کے رکھ دیا میرا نشیمن
میری طرح سے کوئی غم میں بھی مبتلا نہ تھا
ہمدرد کوئی بھی نہیں انوکھا ہے زمانے کا چلن
میں کس پہ ناز کروں جب وہ میرا ہی نہ تھا
بند آنکھوں میں پھر تصور تھا کسی نازنین کا
کھلی جب آنکھ تو کوئی خواب ہی دیکھا نہ تھا
جاوید ہر کوئی جی رہا ہے یہاں مطلب کے لیے
زندگی ہے افسردہ سی کوئی چراغ جلا نہ تھا
محمد اسلم جاوید......فیصل آباد

نیا سال

ترے ہجر کا سفر
کتنا کٹھن ہے جاناں!
کبھی سوچا تم نے!
مری ہر شام اداس رہتی ہے کیوں؟
شبوں کی نکہت خواب
جانے کہاں کھو چکی
کب آنا ہے تجھے اس بستی میں
جہاں تیرے خیالوں کا

بسیرا ہے
وہ رنجشیں، وہ نفرتیں
اب بھول بھی جاؤ
سنو تم لوٹ آؤ جاناں!
کہ
نیا سال آ گیا ہے
عبدالحکیم ساجد......منچن آباد

ماں کے نام

شام جنت کی لگی وہ
جو تیرے پیار میں گزری
سکون سارے جہاں کا
تیرے دامن میں ملتا ہے
تیرے آنگن میں ملتا ہے
نظر بھر کے جو دیکھے تُو
گناہ میرے اُترتے ہیں
تھکن ساری ڈھلتی ہے
اور غم زمانے کے
پل بھر میں اُڑ جاتے ہیں
وہ سرما کی یخ بستہ راتیں
اور گرمیوں کی تپتی دھوپ
مجھے سینے سے لگا کے
جو تم نے ماہ و سال گزارے ہیں
میں اپنا سارا جیون بھی
تیرے قدموں میں رکھ کے
تیری خدمت میں گزار دوں
تو تیری اک رات کی
قیمت چکا سکتا نہیں
جو میرے لیے تو نے
اذیت میں گزاری تھی
میری جنت
او پیاری ماں
پشیماں ہوں میں
اب تک تیری خاطر
آخر کیا کر پایا ہوں؟
عبدالمالک کیف......منجر پور

غزل

مجھے بھی محبت ہوجائے گی کبھی سوچا تک نہیں
پاگل دیوانہ بنا دے گی کبھی سوچا تک نہیں
یہ محبت آنکھوں سے پھر دھڑکن میں اتر جائے گی
اور پھر روح تک جائے گی کبھی سوچا تک نہیں
تمہارے ساتھ جو وقت گزرا اے جانِ غزل
جدا ہو کر تم سے کہاں جاؤں گا کبھی سوچا تک نہیں
تمہیں پانے کے لیے اپنا سب کچھ کھو دیا
اک پل میں بچھڑ جاؤ گے کبھی سوچا تک نہیں
تم دل میں اب اس طرح بس گئے ہو مجاہد
تم سے دور جانے کا اب بھی سوچا تک نہیں
مجاہد ناز عباسی......بجن پور

غزل

مجھے لگا کہ میرے جیسے تھے
شہر کے لوگ مگر کیسے تھے
خاموشیوں کے اس جنگل میں
چار سو اداسی کے بسیرے تھے
کئے، کیسے اور کیا کہتا
وہ غیر نہیں اپنوں جیسے تھے
گھر سے چلا تھا خواب سجائے
ٹوٹ گئے اس کے سب سپنے تھے
وہ گھر سے چلا تھا جب میرے
جانے اس کے حالات کیسے تھے
وسیم اختر......راولپنڈی

غزل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایسے نہ اپنی زلف کی زنجیر کر مجھے
میں آسماں کا چاند ہوں، تسخیر کر مجھے
مدت سے خستہ حال ہیں دیوار و در میرے
گرتا ہوا مکان ہوں تعمیر کر مجھے
ویسے تو اس سے وصل کا امکان تک نہیں
مولا! تو اس کے ہاتھ کی تقدیر کر مجھے
شاید کہ تیری آنکھ کے سب رت جگوں میں ہوں
ممکن اگر ہو خواب کی تعبیر کر مجھے
تو شاعری کے سارے ہنر جانتا تو ہے
میں حرف حرف زخم ہوں تحریر کر مجھے
کوئی اجنبی نہیں تو میری آنکھ میں اتر
میں عکس ہوں تیرا تصویر کر مجھے
آکاش تیرے پیار کے قابل نہیں رہا
گر ہو سکے تو درد کی جاگیر کر مجھے
حسین خان بلوچ.....سرگودھا

غزل

تشنگی بڑھ گئی اور ان سے ملاقات کے بعد
سکوں ملے گا کہاں ایسے حالات کے بعد
چہرہ ہے کیوں اترا ہوا، لہجہ ہے کیوں اُکھڑا ہوا
بجھ گیا ہے دل بھی کچھ ایسے سوالات کے بعد
اک تری ذات کی خاطر کتنوں سے تھا واسطہ رکھا
ہم کو یہ معلوم ہوا دوستوں کے احسانات کے بعد
دل یوں بے چین سا ہے کوچۂ جسم و جاں میں اب
گھٹن سی پھیل گئی ہو جیسے گھنی برسات کے بعد
سنا ہے گنگناتی صبا کو بے خودی میں جب بھی
کھویا رہتا ہے من دیر تک ایسے لمحات کے بعد
اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے خود کو پالیا ہم نے عین
روشنی سی پھیل گئی جیسے سیاہ رات کے بعد
عصمت اقبال عین.....منگلا کینٹ

محبت کم نہیں ہوتیں
محبت کم نہیں ہوتی
چاہت کم نہیں ہوتی
بچھڑ جانے سے پہلے
شاید تم نے سوچا تھا
کہ جذبے سو ہی جاتے ہیں
چاہت کھو ہی جاتی ہے
محبت کم ہو ہی جاتی ہے
کبھی فرصت ملے تو آنا
میں تم کو یہ دکھاؤں گی
میں تم کو یہ بتاؤں گی
ہجر، دوری، فراق اور کرب کے رنگ
اس جذبے کو
کچھ اور رنگین کر دیتے ہیں
ریحانہ سعیدہ.....لاہور

غزل

سوچو ذرا جو مجھ کو غموں کی جان ہوں میں
دیکھو ذرا جو مجھ کو تو زخموں کا نشان ہوں میں
جو چل نہ سکے کسی بھی سمت میں
بے راہ مایوسیوں کا وہ طوفان ہوں میں
کبھی رو کر نہیں کرتے بیاں فسانۂ دل
بکھری زلفیں بتا دیتی ہیں کتنا پریشان ہوں میں
زخموں سے چور ہو کر، اپنوں سے دور ہو کر
سمجھو جو مجھے تو عزائم کا جوان ہوں میں
جو پتھر دلوں کو بھی موم بنا دے حیدر
غمِ محبت کا وہ بیاں ہوں میں
عرفان حیدر.....منچن آباد

ذوقِ آگہی

عفان احمد

جمعہ سے غفلت

طارق بن شہاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”جمعہ کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنا ہر مسلمان پر لازم اور واجب ہے۔ اس سے چار قسم کے آدمی مستثنیٰ ہیں۔ ایک غلام جو بے چارہ کسی کا مملوک ہو، دوسرے عورت، تیسرے لڑکا جو ابھی بالغ نہ ہوا ہو، چوتھے بیمار۔“ (سنن ابی داؤد)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں سے روایت ہے کہ ہم نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) برسرِ منبر فرما رہے تھے۔ ”جمعہ چھوڑنے والے لوگ یا تو اپنی اس حرکت سے باز آجائیں یا یہ ہوگا کہ ان کے اس گناہ کی سزا میں اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا، پھر وہ غافلوں ہی میں سے ہو جائیں گے (اور اصلاح کی توفیق سے محروم کر دیئے جائیں گے)

(صحیح مسلم)

مرسلہ: انجم نذیر.....پشاور

جذبۂ سعی

کہتے ہیں کہ جب نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو زندہ جلانے کے لیے ایک خوف ناک آگ کا آلاؤ روشن کیا تو چشمِ فلک نے دیکھا کہ ایک ننھا ابابیل چونچ میں دو قطرے پانی کے دبائے بڑے اضطرار کے عالم میں آگ کی طرف اڑا جا رہا ہے۔ کسی نے پوچھا، میاں اتنی بے تابی کے ساتھ کہاں کا ارادہ ہے۔ بولا، نمرود کی آگ بجھانے جا رہا ہوں۔ کہا، اے ناسمجھ پرندے، کیا پانی کے یہ چند قطرے جو تیری چونچ میں ہیں، نمرود کی آگ سرد کر دیں گے؟ ننھا ابابیل بولا، مجھے معلوم ہے کہ میری یہ کمزور سعی اس سلسلے میں کچھ بھی کام نہ دے گی لیکن ایک اور بات جو مجھے معلوم ہے وہ یہ ہے کہ جب نمرود کی آگ بجھانے والوں کی فہرست بنائی جائے گی تو اس میں میرا نام بھی ضرور شامل ہوگا۔

مرسلہ: افتخار احمد.....ملتان

جب وہ.....!

چلے جاتے ہیں تو ان کی بہت یاد آتی ہے.....آم
جاتی ہے تو بہت رونا آتا ہے.....لائٹ
آتی ہے تو بہت سکون ملتا ہے.....نیند
آتے ہیں تو غصہ آتا ہے.....بن بلائے مہمان
ملتوی ہونے پر خوشی ہوتی ہے.....امتحان
آتی ہے تو بہت لطف آتا ہے.....بارش
گھر میں آئے تو روٹھے کھڑے ہو جاتے ہیں.....چور
آتا ہے تو جھٹکا لگتا ہے.....بجٹ

ابنِ مقبول جاوید احمد صدیقی.....راولپنڈی

عورت کا کردار

عورت ایک عظیم ہستی ہے۔ جو اپنے کردار کے حوالے سے تقسیم کا شکار ہے، مگر ہمارے معاشرے میں عورت کو وہ مقام حاصل نہیں ہے جس کی عورت حق دار ہے۔ عورت چاہے ماں ہو، بیوی ہو، بہن ہو یا بیٹی ہو ہر لحاظ سے عظمت کی بلندیوں پر فائز ہے۔ مگر ہمارے معاشرے میں اس کی حیثیت ایک زر خرید غلام سے زیادہ نہیں ہے۔ کبھی عورت رسم و رواج کے نام پر قربان کر دی جاتی ہے اور کبھی خاندانی جھگڑوں کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ کبھی اس کے پاؤں میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گھنگھرو باندھ کر اس کو بازارِ حسن میں پہنچایا جاتا ہے تو کبھی اس کو بازار میں نیلام کیا جاتا ہے۔ کبھی خاندانوں پر عورت قربان ہو جاتی ہے تو کبھی ماں باپ کی عزت کو بچاتے بچاتے قربان ہو جاتی ہے۔ کبھی بھائیوں کی قربانی بن جاتی ہے اور کہیں بیٹی بن کر ماں باپ کے رواجوں پر قربان ہو جاتی ہے اور جو قربان ہونے سے ڈرتی ہے تو اسے زندہ جلایا جاتا ہے۔ یا پھر انسانیت کے دعوے دار اس کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں۔ جو عورت ظالم سماج کے سامنے ڈٹ جاتی ہے اس کو دنیا کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ ناانصافی کی اس دنیا میں عورت اپنے فیصلے خود نہیں کر سکتی بلکہ اس کی زندگی کے فیصلے ایسے لوگ کرتے ہیں جن کو اس کا حق حاصل نہیں ہوتا۔

آج کل بعض قسم کے دشمنانِ اسلام مسلمان عورتوں کو یہ کہہ کر بہکاتے ہیں کہ اسلام نے عورتوں کو پردے میں رکھ کر بے عزتی کی ہے۔ اس لیے عورتوں کو پردے سے باہر نکل کر ہر میدان میں مردوں کے دوش بدوش کھڑے ہونا چاہیے؟ مگر پیاری بہنو خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ ان مردوں کا یہ پروپیگنڈہ اتنا گندا اور گھناؤنا اور دھوکا ہے کہ شاید شیطان کو بھی نہ سوجھا ہوگا۔

عورت خدا کی تخلیق کی ہوئی نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ عورت دنیا کی آبادکاری اور دین داری میں مردوں کے برابر کی شریک ہے۔ عورت مرد کے سکون، روح کی راحت، ذہن کا اطمینان اور بدن کا چین ہے۔ عورت دنیا کے خوبصورت چہرہ کی ایک آنکھ ہے۔ عورت آدم و حضرت حوا علیہ السلام کے سوا تمام انسانوں کی ماں ہے۔ اس لیے وہ سب کے لیے قابل احترام ہے۔ عورت کا وجود انسانی تمدن کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اگر عورت نہ ہوتی تو مردوں کی زندگی جنگلی جانوروں سے بدتر ہوتی۔

عورت بچپن میں بھائی بہنوں سے محبت کرتی ہے۔ شادی کے بعد شوہر سے محبت کرتی ہے۔ ماں بن کر اپنی اولاد سے محبت کرتی ہے اس لیے عورت دنیا میں پیار و محبت کا تاج محل ہے۔

مجاہد ناز عباسی.....سجن پور

دخل اندازی

دو شخص آپس میں لڑ رہے تھے۔ ایک بولا۔

"میں تمہارے چونتیس دانت توڑ دوں گا۔"

پاس بیٹھے ہوئے شخص نے حیرت سے کہا۔

"لیکن دانت تو بتیس ہوتے ہیں۔"

اس نے کہا۔ "مجھے معلوم تھا کہ تم بیچ میں ضرور بولو گے اس لیے میں نے دو دانت تمہارے بھی شامل کر لیے تھے۔"

پروفیسر واجد نگینوی.....کراچی

نہلے پہ دہلا

بیوی: میں تمہارے انتظار میں دو گھنٹے سے جاگ رہی ہوں۔

شوہر: اور میں تمہارے سونے کے انتظار میں تین گھنٹے سے باہر کھڑا ہوں۔

ریاض بٹ.....حسن ابدال

عجیب دُعا

حجاج بن یوسف، خلفائے بنو اُمیہ کا انتہائی ظالم گورنر تھا۔ اُس نے ایک لاکھ انسانوں کو اپنی تلوار سے قتل کیا اور جو لوگ اُس کے حکم سے قتل کیے گئے اُنھیں تو کوئی گن ہی نہیں سکا۔ مگر یہی حجاج بن یوسف جب بیمار طان کی بیماری میں مرنے لگا تو اس کی زبان پر یہ دُعا تھی۔ "اے اللہ تیرے بندے، بندیاں میرے بارے میں کہتے ہیں کہ تو مجھے معاف نہیں کرے گا مگر مجھے تجھ سے اُمید ہے کہ تو مجھے معاف فرما دے گا۔ مجھے معاف فرما دے۔"

جب حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ سے لوگوں نے حجاج کی اس دُعا کا ذکر کیا تو آپ رحمتہ اللہ علیہ نے تعجب سے فرمایا۔

"کیا واقعی حجاج نے یہ دُعا مانگی تھی؟"

لوگوں نے کہا، جی ہاں، اس نے یہ دُعا مانگی تھی تو آپ (رحمتہ اللہ علیہ) نے فرمایا۔

"ہو سکتا ہے اللہ اس کو بخش دے۔"

(بکھرے موتی جلد: ۲. صفحہ: ۶۲)

مرسلہ: نورالدین.....کراچی

نیکی کی ہدایت

کسی دوسرے شخص کو کسی نیک کام پر آمادہ کرنا بھی بہت ثواب کا کام ہے۔ اگر ایک شخص کی کوشش سے کوئی دوسرا شخص کسی نیک کام پر تیار ہو جائے تو اس نیک کام کا جتنا ثواب کرنے والے کو ملے گا اُتنا ہی ثواب اُس شخص کو بھی ملے گا جس نے اس نیک کام میں اُس کی رہنمائی کی ہے۔

لہٰذا جب کسی شخص کو کوئی اچھی بات بتانے یا کسی نیکی کا مشورہ دینے کا موقع ملے تو اس سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ البتہ اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ اس کام کے لیے ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے سننے والے کی رُسوائی یا دل آزاری نہ ہو۔ مجمع میں روک ٹوک نہ کی جائے اور انداز متکبرانہ اور حقارت آمیز نہ ہو بلکہ تنہائی میں ایسے نرم لہجے کے ساتھ بات کی جائے جس میں دِل سوزی اور دردمندی اور خیر خواہی نمایاں ہو۔ اس کے لیے ایسے وقت کا انتخاب کیا جائے جس میں سننے والے کا ذہن مشوّش نہ ہو۔ غرض حکمت اور خیر خواہی کا لحاظ رکھنا انتہائی ضروری ہے۔

مرسلہ: محمد حذیفہ.....پاپوش نگر، کراچی

عجیب جواب

چار رکعت فرض یا سنت مؤکدہ نماز میں جب دوسری رکعت پر بیٹھتے ہیں تو صرف التحیات پڑھی جاتی ہے، درود شریف نہیں پڑھا جاتا، امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص غلطی سے دوسری رکعت کے قعدہ میں التحیات کے بعد اللھم صلی علیٰ محمد پڑھ لے تو اس پر سجدہ سہو واجب ہو جاتا ہے، اس کے متعلق امام صاحب کا ایک واقعہ منقول ہے اور وہ یہ کہ ایک مرتبہ امام صاحب نے خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا۔ "جو شخص مجھ پر درود پڑھے تو اس پر سجدہ سہو کو کیسے واجب کہتے ہو؟" امام صاحب نے جواب دیا۔ "اس لیے کہ اس نے آپ پر درود بھول کر پڑھا ہے۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امام صاحب کے اس جواب کو پسند فرمایا۔

(ماخوذ البحر الرائق صفحہ: ۱۰۵. جلد: ۲)

مرسلہ: زبیر اختر.....کراچی

جنت میں داخلے کا سبب

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ جنت میں داخلے کا زیادہ تر سبب کیا ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ نے فرمایا خوفِ خدا اور حسنِ خلق! اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کون سی چیز زیادہ تر جہنم میں داخلے کا موجب ہوگی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "منہ اور شرم گاہ۔"

(ترمذی)

مرسلہ: زین الدین.....کراچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خطروں کا کھلاڑی

اے حمید

محترم اے حمید کا نام نئے افق کے قارئین کے لیے نیا نہیں۔ وہ نئے افق' نیا رخ اور آنچل کے لیے متعدد سلسلے وار ناول' افسانے اور سفر نامے لکھ چکے ہیں۔ ان کے لکھنے کا ایک منفرد انداز ہے۔ وہ جب لکھتے ہیں تو لفظ بولتے ہیں۔ جب قاری انہیں پڑھنا شروع کرتا ہے تو خود بخود اس ماحول میں پہنچ جاتا ہے بلکہ خود اس کہانی کا کردار بن جاتا ہے۔ منظر کشی میں اے حمید کا کوئی ثانی نہیں۔ جب وہ بارش کے بارے میں لکھتے ہیں تو پڑھنے والے کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ واقعی کمرے سے باہر بوندیں برس رہی ہیں۔ جب وہ خوش بو کا تذکرہ کرتے ہیں تو قاری خود کو اس خوش بو کے ہالے میں محسوس کرتا ہے۔ زیر نظر تحریر ماضی کے ہرما حال کے میان مار کا سفر نامہ ہے۔ آج اے حمید ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی تحریریں انہیں ہمیشہ قارئین کے دلوں میں زندہ رکھیں گی۔ آئیے خطروں کا کھلاڑی پڑھیے بلکہ محسوس کیجیے۔

ایک ایسا سفر نامہ جو آپ کو دن میں خواب دیکھنے پر مجبور کر دے گا

"اوئے منڈیا! آ گے چلا جا آ گے۔"

لاری کا ایک چھوٹا سا دروازہ آ گے بھی تھا۔ اس طرف ایک لڑکے کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ میں جلدی سے لاری میں داخل ہو گیا۔ آوازیں لگانے والے آدمی نے زور سے لاری کی دیوار پر ہاتھ مار کر کہا۔

"چلو استاد جی۔"

اور لاری جی ٹی روڈ پر آ کر ریل کے بڑے پل پر چڑھنے لگی۔ کلینر لاری کے اندر کھڑا ان مسافروں کے ٹکٹ کاٹ رہا تھا جو جلدی میں سوار کروا لیے گئے تھے اور جنہوں نے ٹکٹ نہیں خریدا تھا۔ کلینر نے میرے قریب آ کر پوچھا۔

"کہاں جاؤ گے؟"

میں نے کہا۔

"لاہور۔"

پتا نہیں اس نے چھ آنے کہا کہ آٹھ آنے نکالو کہا۔ میں نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کے سامنے کر دیا تو وہ بولا۔

"لاہور چل کے پیسے دے دینا۔"

اس زمانے میں سو روپے کا نوٹ بہت بڑا نوٹ سمجھا جاتا تھا۔ اس کی مالیت میرے خیال میں کم از کم چار ہزار روپے کے برابر تھی۔ یہ سو روپے بمبئی میں مجھ سے ختم نہیں ہو رہے تھے حالانکہ میں روز کے تین فلم شو دیکھتا تھا اور کیونڈر کے سگریٹ پیتا تھا جو اس زمانے میں بڑے مہنگے سمجھے جاتے تھے۔

لاری لاہور پہنچ کر لاہوری دروازے کے باہر ٹھہر گئی۔ جہاں آج کل سیالکوٹ جانے والی ویگنوں کا اڈا ہے۔ اس وقت نندہ بس سروس کا اڈہ اسی جگہ ہوا کرتا تھا۔ اڈے پر مجھ سے سو روپے کا نوٹ لے کر مجھے چھ یا سات آنے کا ٹکٹ دے دیا گیا اور باقی سو روپے کا سارے کا سارا چینج دیا گیا جو میں نے اپنے کوٹ کے اندر والی جیب میں ڈال لیا۔ اس بھان یا چینج میں چاندی کے روپے روپے کے سکے بھی تھے اور اٹھنیاں چونیاں بھی تھیں۔

بڑا اچھا زمانہ تھا۔ نہ کسی نے میری جیب کاٹی'

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہ دھوکا دے کر مجھ سے روپے چھینے۔ میری عمر کوئی زیادہ نہیں تھی یہی تیرہ چودہ سال کی ہوگی۔ میں نے ٹھنڈے کپڑے کا کوٹ پاجامہ اور چپل پہنی ہوئی تھی۔ میرے کوٹ کے اندر والی جیب روپوں سے اٹھنیوں چونیوں سے بھر گئی تھی اور ایک طرف کو جھک گئی تھی۔ میں اس طرح لوہاری دروازے میں داخل ہو کر شہر کے اندر سے ہوتا ہوا مستی گیٹ کی طرف نکل آیا۔

ان دنوں میری سب سے بڑی ہمشیرہ مستی گیٹ میں رہا کرتی تھیں۔ ان کے تین منزلہ مکان کے باہر والے رخ پر لکڑی کے بستے لگے ہوئے تھے اور مکان کا چھجہ نیچے کو جھکا ہوا تھا۔ مکان کے نیچے تانبے کے برتن بنانے والوں کا طویلہ تھا جہاں سارا دن ٹھٹھیارے تانبا کوٹتے یا اڈوں پر تانبے کے بڑے بڑے پتیلے لگائے لوہے کی ہتھوڑی سے ان کو کوٹ کوٹ کر ان پر سفید نشان ڈالتے رہتے تھے اور ان کا بڑا شور ہوتا تھا۔ میں اندھیری سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والی منزل میں آیا تو بڑی آپا نے سب سے پہلا سوال جو کیا وہ یہ تھا۔

"وے آپو جی کو بتا کر آیا ہے کہ گھر سے بھاگ کر آیا ہے؟"

مجھے یہ سوال بڑا برا لگا۔ میں تھوڑی دیر وہاں بیٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ میرے پاس بڑے پیسے تھے۔ لوہاری دروازے آ کر سوڈا واٹر کی دمٹو کی بوتل پی جو اس زمانے کی بڑی اعلیٰ بوتل ہوا کرتی تھی۔ کیونڈر کے سگریٹ کی ایک ڈبی لی۔ ایک بنارسی پان کھایا اور سگریٹ کے کش لگاتا بھاٹی دروازے آ گیا۔ وہیں میں اِدھر اُدھر دوپہر تک گھومتا پھرتا رہا۔ یہاں ایک ہندو کی فالودے کی دکان ہوا کرتی تھی۔ وہاں فالودہ پیا۔ خدا جانے دوپہر کا کھانا کہاں کھایا۔ کھایا بھی یا نہیں۔ مجھے اس عمر کی آوارہ گردیوں میں اس بات کی بالکل فکر نہیں ہوتی تھی کہ میں کھانا وغیرہ کہاں سے کھاؤں گا۔ مجھے اور سب کچھ یاد ہے لیکن یقین کریں یہ بالکل یاد نہیں ہے کہ میں نے دوپہر کا کھانا کہاں اور رات کا کھانا کہاں کھایا تھا۔ یہ ضرور یاد ہے کہ مجھے ایک یار پردیس میں دو دن کا فاقہ آ گیا تھا اور نانی یاد آ گئی تھی۔

دوپہر کو بھاٹی کے ایک سینما ہاؤس میں کوئی فلم دیکھی۔ اس کے بعد پھر بڑی آپا کے گھر آ گیا۔ میں نے انہیں یہ تو نہ بتایا کہ میرے پاس اتنے پیسے ہیں اور میں یہ پیسے گھر سے چرا کر لایا ہوں مگر یہ ضرور بتا دیا کہ میں بمبئی جا رہا ہوں۔ بڑی آپا نے مجھ پر بڑا غصہ اتارا۔ یہی کہتی رہیں کہ کم از کم آپو جی (والدہ) کو تو بتا کر آتے۔ میں نے کہا۔

"آپ انہیں بتا دیں میں تو جا رہا ہوں۔"

مجھے یاد ہے بڑی آپا نے مجھے دو گھوڑا بوسکی کی ایک قمیص پہننے کو دی۔ جو میں نے وہیں پہن لی اور اتری ہوئی ٹوپل کی قمیص وہیں چھوڑ دی۔ کیا دو گھوڑا بوسکی ہوا کرتی تھی۔ اب نہ وہ دو گھوڑے ہیں نہ بوسکیاں ہیں۔ بوسکیاں ختم ہو گئیں اور پیچھے صرف گھوڑے ہی گھوڑے رہ گئے ہیں۔

وہاں سے میں سیدھا لاہور ریلوے اسٹیشن پر آ گیا۔ پشاور سے بمبئی جانے والی فرنٹیئر میل جہاں تک مجھے یاد ہے رات کے آٹھ یا نو بجے کے درمیان چلا کرتی تھی۔ بڑی پورژوا قسم کی گاڑی تھی۔ اس میں تھرڈ کلاس نہیں ہوتی تھی۔ انٹر کلاس، فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس ہوتی تھی۔ ایک ائر کنڈیشنڈ بوگی ہوتی تھی جس کے قریب بھی لوگ نہیں جاتے تھے۔ بوگی کے گہرے رنگ کے سبز شیشوں میں سے انگریزوں اور ان کے میموں کے دھندلے دھندلے چہرے نظر آیا

کرتے تھے۔

میں نے لاہور سے بمبئی تک انٹر کلاس کا ٹکٹ لے لیا تھا۔ فرنٹیئر میل چھک چھک کرتی بڑی شان اور وقار کے ساتھ پلیٹ فارم میں داخل ہوئی اور رک گئی۔ تھرڈ کلاس نہ ہونے کی وجہ سے اس ٹرین میں بہت کم مسافر سفر کیا کرتے تھے۔ ایک بات اور بھی تھی۔ اس گاڑی میں دو تین روپے سے کم سفر کے ٹکٹ نہیں ملتا تھا۔ ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ ایک عجیب رعب اور وقار ہوا کرتا تھا فرنٹیئر میل کا۔ لوگ پلیٹ فارم پر دور کھڑے ہو کر اس ٹرین کو دیکھا کرتے تھے۔

لاہور سے امرتسر 35 میل کا فاصلہ تھا۔ فرنٹیئر میل وقت پر آتی تھی اور وقت پر چلا کرتی تھی۔ لاہور سے روانہ ہوتی تو ریلوے یارڈ سے نکلتے ہی اس نے اسپیڈ پکڑ لی۔ لاہور سے واہگہ، جلو، گورو سر، ستلانی، اٹاری، خاصہ، چھڑ ہرٹہ سب اسٹیشن چھوڑتی ہوئی امرتسر جا کر رکی۔ امرتسر یہ ٹرین دس پندرہ منٹ ہی ٹھہرتی تھی۔ امرتسر کا اسٹیشن آتے ہی میں کمپارٹمنٹ کے باتھ روم میں چھپ گیا۔

میں جب بھی گھر سے بھاگتا تو والد صاحب اپنے شاگرد پہلوان جوان کے خاص جاسوس تھے چھوڑ دیا کرتے تھے جو لاریوں کے اڈے، جی ٹی روڈ اور ریلوے اسٹیشن اور کمپنی باغ میں مجھے تلاش کرنا شروع کر دیتے تھے۔ ان میں بادی نام کا جاسوس بڑا تجربے کار تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ والد صاحب کے ایک دو جاسوس پلیٹ فارم پر ضرور موجود ہوں گے جو انٹر کلاس کے ڈبوں میں جھانک جھانک کر مجھے دیکھتے پھر رہے ہوں گے۔

ایک بار میں اپنے چھوٹے آرٹسٹ بھائی مقصود کے ساتھ امرت ٹاکیز میں حاتم طائی کا آخری شو دیکھنے چلا گیا۔ میں اور مقصود تھرڈ کلاس میں ایک بنچ پر بیٹھے تھے۔ ابھی فلم شروع ہی ہوئی تھی کہ ایک آدمی لوگوں کے جھک کر چہرے دیکھتا ہمارے سامنے آ گیا۔ یہ والد صاحب کا جاسوس بودی تھا۔ اس نے ہمیں پہچان لیا۔ کہنے لگا۔

"چلو بھئی سودے میدے، باہر آ جاؤ۔" اور ہم دونوں کو کان سے پکڑ کر سینما ہال سے باہر لے آیا۔ باہر والد صاحب کو چوانوں والا سینٹا لے کر ہمارے استقبال میں کھڑے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی انہوں نے ہم پر سینٹے برسانے شروع کر دیے۔ میں اسی وجہ سے ڈر کر کمپارٹمنٹ کے باتھ روم میں چھپ گیا تھا۔

جب ٹرین چلی اور شریف پورے سے بھی آگے نکل گئی تو میں باتھ روم سے باہر آ گیا۔ مجھے اس بات کا بڑا افسوس تھا کہ میں ٹرین میں رات کے وقت کمپنی باغ والے ریلوے پھاٹک کو تیزی سے پیچھے جاتے نہیں دیکھ سکا اور رات کے وقت کمپنی باغ کے درختوں، پھولوں اور سبزے کی ٹھنڈی خوش بو سے محروم رہا۔ رات کے وقت کمپنی باغ کے سبزے، پھولوں، درختوں اور امرودوں اور آموں کی ملی جلی ٹھنڈی خوش بو آیا کرتی تھی۔ دن کے وقت کمپنی باغ کا پھاٹک گزرتا تو ٹرین میں کمپنی باغ کے مغلیہ طرز کے دروازے کی چھتی ہوئی ڈیوڑھی دور سے نظر آتی۔ اس ڈیوڑھی کی ایک جانب باغ کی چھوٹی سی ٹکڑی آگے ریالٹو سینما کی طرف نکل جاتی تھی اور دوسری سڑک کو کاٹ کے باغوں میں سے ہوتی ہوئی آگے لیڈیز پردہ کلب اور اس کے آگے چھوٹی نہر کو چلی جاتی تھی۔ سڑک کی دونوں جانب لوکاٹ کے باغ تھے جن میں دن کے وقت ہی ہلکا ہلکا اندھیرا چھایا رہتا تھا۔ فرنٹیئر میل نے پوری رفتار پکڑ لی تھی۔ یہ بڑی تیز رفتار ٹرین ہوا کرتی تھی۔ اسٹیشن پر اسٹیشن چھوڑتی جا رہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ جالندھر جا کر رکی۔ چند منٹ ٹھہری اور آگے چل پڑی۔ لدھیانہ آ گیا۔ لدھیانے کے مردم خیز شہر نے کیسے کیسے علمائے دین، مسلمان سیاست دان، علم و ادب کے درخشاں ستارے پیدا کیے۔ اس شہر پر مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کی گہری چھاپ تھی۔ تجارت کے میدان میں بھی یہاں کے مسلمان تاجر کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ تعمیر پاکستان میں لدھیانے کے مسلمانوں کے کارنامے پاکستان کی تاریخ میں زریں حروف سے لکھے جائیں گے۔ پاکستان کے لیے لدھیانے کے مسلمانوں نے بھی بے بہا اور بے مثال قربانیاں دی ہیں۔

دن کا اجالا پھیل رہا تھا جب ٹرین میرٹھ پہنچی۔

میرٹھ شہر اور میرٹھ چھاؤنی دونوں کے اسٹیشن مجھے بڑے اچھے لگتے تھے۔ اس لائن پر بعد میں جب بھی میں نے سفر کیا میں ان اسٹیشنوں کے پلیٹ فارم پر اتر کر ضرور سیر کرتا تھا۔ صاف ستھرے پلیٹ فارم ہوا کرتے تھے۔ اس سے پہلے انبالے کا اسٹیشن آتا تھا اور انبالہ شہر اور انبالہ کینٹ کے اسٹیشن بھی مجھے اپنی طرف کھینچتے تھے۔ شاید اسی لیے کہ یہاں میرا پیارا دوست اور خوب صورت شاعر ناصر کاظمی رہتا تھا۔ جس نے مجھے دس بارہ سال بعد لاہور کے پاس ٹی ہاؤس میں آ کر ملنا تھا۔

عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ۔ انبالہ کینٹ کے اسٹیشن کا پلیٹ فارم میرٹھ شہر کے اسٹیشن کے پلیٹ فارم سے زیادہ صاف ستھرا اور چمکیلا ہوا کرتا تھا۔ میرٹھ کینٹ اور انبالہ کینٹ دونوں ہی برٹش انڈین آرمی کی بڑی اہم چھاؤنیاں تھیں اور یہاں فرنٹیئر میل ضرور کھڑی ہوتی تھی۔ سات سال بعد میں نے اسی انبالہ شہر کے پلیٹ فارم پر اگست 1947ء میں برقعہ پوش مسلمان خواتین کے ایک ہجوم کو دیکھا تھا جو پاکستان جانے کے لیے اپنے بال بچوں کو لیے سہمی ہوئی بیٹھی تھیں اور ان کے پیچھے پلیٹ فارم کے گیٹ پر سکھ تلواریں اور نیزے لیے ست سری اکال کے نعرے لگا رہے تھے۔

خدا جانے یہ خواتین پاکستان پہنچ بھی سکی تھیں یا نہیں۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مگر جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں اس وقت حالات بالکل نارمل تھے۔ فرنٹیئر میل میرٹھ سے نکل کر دلی کی طرف روانہ ہوئی تو اس کی رفتار تیز ہونے لگی۔ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ ایک کتا زور زور سے بھونکتا کچھ دور تک ٹرین کے ساتھ ساتھ بھاگتا رہا۔ پھر تھک کر پیچھے مڑ گیا۔

دلی شہر کے مکانات اور کارخانے وغیرہ ریلوے اسٹیشن آنے سے بہت پہلے شروع ہو گئے تھے۔ ٹرین دریائے جمنا کے بہت بڑے پل پر سے گزر گئی۔

دلی شہر میرا دیکھا ہوا شہر تھا۔ ایک بار پہلے رنگون جاتے ہوئے میں یہاں آیا تھا اور بھائی جان کے ساتھ مشہور شاعر م راشد صاحب کے ہاں تین چار دن رہا تھا۔ اس زمانے میں دلی شہر کی آبادی اتنی زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ پلیٹ فارم پر بہت کم لوگ نظر آ رہے تھے۔

ویسے بھی فرنٹیئر میل پر صرف لمبے سفر والے مسافر دکھائی دیتے تھے۔ اترنے والے مسافر زیادہ ہوتے تھے۔ میرے پاس کافی پیسے تھے۔ میں نے پلیٹ فارم پر اتر کر ایک فلمی رسالہ خریدا۔ پلیئرز نیوی کٹ کے پچاس سگریٹوں والا ایک چوڑا بہت خوب صورت ڈبہ خریدا۔ اسے کھولا تو اندر مخمل کے سرخ بستر پر سفید سگریٹ ساتھ ساتھ لیٹے ہوئے تھے۔

مجھے ایسا لگا جیسے کسی اسپتال کی نرسیں سو رہی ہوں۔ ابھی سگریٹوں کے پیچھے فلٹر لگنے شروع نہیں ہوئے تھے۔ ایک احمد آبادی پان کھایا اور سگریٹ سلگا

کر اپنے ڈبے میں آ کر بیٹھ گیا۔

اب مجھے والد صاحب کے کسی جاسوس کا ڈر نہیں تھا اور بڑی بے فکری سے سفر کر رہا تھا۔ فرنٹیئر میل دلی سے بمبئی بڑودہ ریلوے ٹریک پر سفر کرتی تھی۔ اسے بی بی اینڈ سی آئی کہا جاتا تھا۔ یہ وسطی ہند کا سفر تھا۔

اس ریلوے لائن پر یہ میرا پہلا سفر تھا۔ اس کے بعد اس ریلوے لائن پر اتنے سفر کیے کہ یہاں کے ریلوے ٹریک کے ساتھ ساتھ اگے ہوئے درخت تک مجھے یاد ہو گئے تھے اور یہاں کے جنگلوں کی بھی دربدری کرتا رہا تھا لیکن اس وقت میں پہلی بار اس ریلوے لائن پر سفر کر رہا تھا۔ دلی سے آگے متھرا شہر آیا۔

جھانسی، گوالیار بھوپال کا تاریخی شہر آیا۔ یہ سارا علاقہ وسطی ہندوستان کا جنگلاتی اور نیم پہاڑی علاقہ تھا۔ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ دونوں طرف جنگل ہی جنگل تھے۔ راستے میں بارش بھی شروع ہو گئی۔ اس بارش نے مجھ پر جادو سا کر دیا۔ یہ جنگلوں کی بارش تھی۔ قدرت نے بارش پیدا ہی جنگلوں کے لیے کی ہے اور جنگل بارشوں کے لیے بنائے ہیں۔

جنگل اور بارش دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ بارش کی بوچھاڑیں ٹرین کی کھلی کھڑکیوں میں سے اندر ڈبے میں آنے لگیں۔ میں ایک کھڑکی کے پاس بیٹھا جنگل اور بارش اور بارش اور جنگل کو دیکھ رہا تھا۔ کبھی لگتا کہ جنگل ہی جنگل ہے۔ کبھی لگتا کہ بارش ہی بارش ہے اور کہیں کچھ بھی نہیں ہے اور یہ دنیا کی پہلی بارشیں ہیں جو ایک لاکھ سال سے برس رہی ہیں اور لاکھوں سال تک برستی رہیں گی۔ کسی مسافر کی آواز آئی۔

"کھڑکیاں بند کر دو، بارش اندر آ رہی ہے"

مجھے یہ فقرہ بڑا اچھا لگا۔ بارش اندر آ رہی ہے۔

بارش! بارش تُو بادلوں کے دیس سے آئی ہے تُو بادلوں کے دیس کو واپس چلی جائے گی۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لیتی جا۔ تیرے جانے کے بعد سورج نکلے گا تو درختوں کے دھلے ہوئے پاک صاف پتے اور گلابی اور ہری ہری کونپلیں دھوپ میں روشن ہو جائیں گی اور گل مہر اور گلاب کے پھولوں پر تیرے قطرے سنہری دھوپ میں موتی بن کر چمکیں گے۔ "کھڑکی بند کر دو بارش اندر آ رہی ہے۔" کسی مسافر نے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر وہ کھڑکی بھی بند کر دی جہاں سے میں بارش کی طرف اور بارش میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ یاد نہیں دو دن کا سفر تھا کہ تین دن کا سفر تھا۔ دن نکل آیا تھا کہ پتا چلا بمبئی شہر آ رہا ہے۔

اس وقت آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ست پڑا کی پہاڑیوں کے جنگل ہیں اور یہاں گرمیوں میں بڑی بارشیں ہوتی ہیں۔ کلیان اسٹیشن آیا تو ریلوے ٹریک کی چڑھائی شروع ہو گئی۔ یہاں ٹرین کے پیچھے بھی ایک انجن لگ گیا۔ ٹرین کی رفتار ہلکی ہو گئی تھی۔ کافی دیر تک ٹرین چڑھائی چڑھتی رہی۔ اس کے بعد کسی اسٹیشن پر پہنچ کر ٹرین کا پچھلا انجن الگ کر دیا گیا اور اترائی شروع ہو گئی۔

ٹرین اس قدر تیز رفتاری سے جا رہی تھی کہ درخت سائیں سائیں کرتے ٹرین کے قریب سے گزر جاتے تھے اترائی ختم ہوئی تو بارش دوبارہ شروع ہو گئی لیکن یہ بارش اتنی زیادہ نہیں تھی کہ اس کی بوچھاڑ ٹرین کے ڈبوں میں آتی۔ چنانچہ میری کھلی کھڑکی کسی نے بند نہ کی اور میں اور بارش کھڑکی میں ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر مسکراتے اور باتیں کرتے رہے۔

آخر بمبئی شہر کے لوکل اسٹیشن شروع ہو گئے اور پھر فرنٹیئر میل بمبئی سنٹرل کے بہت بڑے اسٹیشن میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

داخل ہو کر رک گئی۔ یہ اسٹیشن ٹرمینل بھی تھا یعنی یہاں سے آگے کی طرف ریل گاڑی نہیں جاتی تھی۔ اس وقت بارش تھم گئی تھی۔ بڑا کشادہ اور لمبا پلیٹ فارم تھا۔ ہمارے ٹکٹ دو تین اسٹیشن پہلے ہی ایک ٹی ٹی نے ڈبے میں داخل ہو کر چیک کر لیے تھے۔ چنانچہ پلیٹ فارم پر کوئی چیکنگ گیٹ نہیں تھا۔ بس ایک طرف ٹرین کھڑی تھی اور دوسری طرف شہر کی سڑک تھی جہاں وکٹوریہ یعنی گھوڑا گاڑیاں اور ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ کسی نے ٹکٹ کا نہ پوچھا۔

پلیٹ فارم پر ہوٹلوں کے ایجنٹ مسافروں کو اپنے اپنے ہوٹل کا کارڈ دکھا کر انہیں اپنے ہوٹل میں لے جانے پر اصرار کر رہے تھے۔ میرے پاس کوئی سامان نہ تھا۔ بس تین کپڑوں میں تھا لیکن کوٹ کی جیب چاندی کے روپوں سے آدھی بھری ہوئی تھی۔ ایک سانولا سا آدمی میرے پاس آ کر بولا۔

"بابو! میرے ساتھ آ جاؤ جہاں جانا ہے پہنچا دوں گا۔"

میں نے سوچا کہ کوئی ٹیکسی ڈرائیور ہے۔ اس نے سر پر ترکی ٹوپی پہن رکھی تھی اور جسم پر لمبی برساتی تھی۔ میں اس کے ساتھ ہو گیا اور کہا۔

"مجھے میرن ڈرائیو جانا ہے۔"

وہ بولا۔

"بابو! جہاں چاہو گے پہنچا دوں گا۔ کرایہ بھی زیادہ نہیں ہو گا۔"

اور وہ مجھے ایک گھوڑے والی بگھی کے پاس لے آیا۔ میں نے پوچھا۔

"تم ٹیکسی نہیں چلاتے؟"

کوچوان بولا۔

"بابو! وکٹوریہ ٹیکسی سے زیادہ تیز چلتی ہے۔ تم بیٹھ کر تو دیکھو۔"

میں نے سوچا کہ چلو بمبئی کی وکٹوریہ کی بھی سیر کر لیتے ہیں۔ میں بگھی میں بیٹھ گیا۔ ترکی ٹوپی اور برساتی والا کوچوان بگھی کی اونچی سیٹ پر بیٹھ گیا اور میری طرف منہ پھیر کر بولا۔

"بابو! کس طرف چلنا ہے؟"

میں نے مس نسیم بانو کا ایڈریس لاہور کے فلمی رسالے "چترا" ویکلی میں پڑھ کر لکھ لیا تھا۔

"میرن ڈرائیو چلو۔"

اس نے گھوڑے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"بابو! میرن ڈرائیو کتنے نمبر پر جائے گا؟"

مس نسیم بانو کے فلیٹ کا نمبر رسالے میں نہیں دیا گیا تھا۔ بس مس نسیم بانو میرن ڈرائیو ہی لکھا تھا۔ میں نے کہا۔

"مس نسیم بانو کے ہاں چلو اس کے فلیٹ کا نمبر معلوم ہے؟"

کوچوان نے بڑے غور سے میری طرف دیکھا۔ شاید سوچ رہا تھا کہ یہ چھوٹی عمر کا لڑکا مس نسیم بانو کو کس لیے ملنے جا رہا ہے۔ اس نے میری طرف مشکوک نظروں سے دیکھا اور بگھی کھڑی کر دی۔ بولا۔

"بابو! کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"پنجاب سے۔"

"مس نسیم بانو تمہیں جانتی ہے کیا؟"

میں نے کہا۔

"نہیں، میں اسے پہلی بار مل رہا ہوں۔"

کوچوان نے بگھی آگے بڑھا دی۔ وہ سمجھ گیا کہ میں فلمی دنیا کا مارا ہوا ہوں اور نسیم بانو کے عشق میں گرفتار ہو کر اس کے در پر دھونی رمانے جا رہا ہوں۔ مسکراتے ہوئے بولا۔

"بابو! نسیم بانو سے مجھے پکار فلم کا ایک پاس لے دینا۔"

ان دنوں بمبئی کے منروا سینما میں سہراب مودی کی مشہور فلم "پکار" دکھائی جا رہی تھی۔ جس میں نسیم بانو نے ہیروئن کا رول ادا کیا تھا۔ میں نے بڑی شان سے جواب دیا۔

"فکر نہ کرو، تمہیں چار آدمیوں کا پاس لے دوں گا۔"

یہ میں نے یونہی کہہ دیا تھا مجھے خود معلوم نہیں تھا کہ مس نسیم بانو مجھے ملنے کی اجازت بھی دیتی ہے یا نہیں۔ وکٹوریہ بگھی بمبئی کے بازاروں میں سے گزرتی ایک ایسی سڑک پر نکل آئی جس کی ایک طرف اونچی اونچی بلڈنگوں کی قطار دور تک چلی گئی تھی اور دوسری طرف سمندر ہی سمندر تھا۔ کوچوان نے کہا۔

"بابو! میرن ڈرائیو آ گیا ہے۔ اب سمجھو مس نسیم کا فلیٹ بھی آ گیا۔ میں نے اس کا فلیٹ دیکھا ہوا ہے۔"

سمندر کی طرف سے مرطوب ہوا چل رہی تھی۔ جس میں مچھلیوں کی بو محسوس ہوتی تھی۔ وکٹوریہ ایک اونچی بلڈنگ کے آگے کھڑی ہو گئی۔ کوچوان بولا۔

"وہ سامنے والا فلیٹ مس نسیم کا ہے۔"

میں نے کہا۔

"تم یہیں ٹھہرنا میں جا کر پتا کرتا ہوں۔"

میں وکٹوریہ سے اتر کر فلیٹ کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ نسیم بانو کا فلیٹ پہلی منزل پر تھا۔ برآمدہ تھا۔ جہاں دیوار پر نسیم بانو کی فریم میں جڑی ہوئی بڑی تصویر لگی تھی۔ سیڑھیوں کے پاس ایک پٹھان چوکیدار بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کس سے ملنا ہے میں نے کہا۔

"میں نسیم بانو سے ملنا چاہتا ہوں۔"

چوکیدار نے پوچھا۔ "کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے کہا۔ "پنجاب سے آیا ہوں۔"

وہ بولا۔ "بیگم صاحبہ تمہیں جانتی ہیں کیا؟"

"نہیں، میں انہیں پہلی بار مل رہا ہوں۔"

وہ سمجھ گیا کہ میں نسیم بانو کا عاشق نامراد ہوں اور اس کے در پر دیدار کی خیرات مانگنے آیا ہوں۔ اس نے بے رخی سے کہا۔

"وہ اسٹوڈیو گئی ہوئی ہیں، جاؤ۔"

نسیم بانو سے میرا عشق اسی وقت ہرن ہو گیا اور میرے دل و دماغ سے نکل کر چوکڑیاں بھرتا خدا جانے کدھر غائب ہو گیا۔ میں الٹے پاؤں چل کر بگھی میں آ کر بیٹھ گیا۔ کوچوان نے پوچھا۔

"کیوں بابو! کیا ہوا؟"

میں نے کہا۔

"مس نسیم اسٹوڈیو گئی ہوئی ہیں۔ پھر مل لوں گا واپس چلو۔"

کوچوان وکٹوریہ لوٹ کر واپس چل پڑا۔ واپس چلو تو میں نے اسے کہہ دیا تھا لیکن مجھے خود معلوم نہیں تھا کہ میں واپس کہاں جاؤں گا۔ مس نسیم بانو میرے دماغ سے نکل گئی تھی اور اس وقت بمبئی شہر میں گھومنے پھرنے کا شوق دل میں سما گیا تھا۔ کوچوان نے آہستہ آہستہ بگھی چلاتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"بابو! تمہیں محبوب اسٹوڈیو لے چلوں؟ وہاں دوسری کئی ایکٹرز بھی ہوں گی۔"

کوچوان بھی سمجھ گیا تھا کہ میں فلمی دنیا کا مارا ہوں اور پنجاب سے بھاگ کر فلم ایکٹروں اور ایکٹرز کو دیکھنے بمبئی آیا ہوں۔ اس زمانے میں پنجاب اور صوبہ سرحد سے نوجوان لڑکے ہیرو بننے کے شوق میں گھروں سے بھاگ کر آ جایا کرتے تھے۔ میں نے کہا۔

"چلو محبوب اسٹوڈیو ہی چلو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوچوان نے بگھی ایک دوسری سڑک پر ڈال دی۔ ہم ایک بازار میں سے گزر رہے تھے کہ میرا چائے پینے کو دل چاہا۔ میں نے کوچوان سے کہا۔

"بگھی ایک طرف روکو میں چائے پیوں گا۔"

وہ بولا۔

"بابو! تم بگھی میں ہی بیٹھو۔ میں تمہارے لیے سامنے والے ایرانی ہوٹل سے چائے لے آتا ہوں۔"

میں نے کہا۔

"اپنے لیے بھی لے آنا۔"

میرے پاس بڑے پیسے تھے۔ کوچوان وکٹوریہ روک کر سامنے والے ایرانی ہوٹل میں گیا اور چائے کا ایک کپ اپنے لیے اور ایک کپ میرے لیے لے آیا۔ وہ میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ہم چائے پینے لگے۔ یہ منظر آج بھی پوری جزئیات کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ جیسا کہ میں لکھ رہا ہوں۔ ویسے ہی ہوا تھا۔ وہ چائے پلیٹ میں ڈال کر پی رہا تھا۔ میں نے بھی تھوڑی چائے پلیٹ یعنی پرچ میں ڈال کر پی اور پھر کپ میں ہی پینے لگا۔ بمبئی کے ایرانی ہوٹلوں میں چائے کے کپ کو چائے کوپ کہتے تھے۔ کوچوان نے مجھ سے پہلے چائے کا کوپ خالی کر دیا۔ میں نے جیب سے پلیئرز کی چوڑی ڈبی نکال کر ایک سگریٹ کوچوان کو دیا اور ایک خود سلگا لیا۔ کوچوان قیمتی سگریٹ لے کر بڑا خوش ہوا کہنے لگا۔

"یہ بڑا اعلیٰ سگریٹ ہے۔ ہم تو چار مینار یا ہاتھی کا سگریٹ پیتے ہیں۔"

بمبئی میں ہاتھی اور چار مینار کے سگریٹ بڑے عام تھے۔ چار مینار بڑا سخت اور سستا سگریٹ تھا۔ بمبئی میں جب میرے پاس پیسے ختم ہو گئے تھے تو میں چار مینار سگریٹ ہی پیتا تھا۔ شاید ایک آنے یا چھ پیسے کی ڈبی آتی تھی۔

کوچوان سمجھ گیا کہ میری کوئی منزل نہیں ہے۔ میں بس فلمی دنیا کی سیر کرنے آیا ہوں۔ وہ کہنے لگا۔

"بابو! محبوب اسٹوڈیو جا کر کیا کرو گے۔ وہاں بھی پٹھان چوکیدار تمہیں اندر نہیں جانے دے گا۔ میں تمہیں ایک جگہ لے چلتا ہوں۔ وہاں فلمی ہیروئن ثریا کا ماموں ظہورا اکثر آتا رہتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں ٹھیک ہے، مجھے وہیں لے چلو۔"

ظہور صاحب اس زمانے میں پرکاش فلم کمپنی کی مار دھاڑ کی فلموں کے بڑے مشہور ولن ہوا کرتے تھے۔ شاید ان کا پورا نام ایس ایم ظہور ہوا کرتا تھا۔ کوچوان مجھے ایک بارونق سڑک پر لے آیا جس کا نام مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ لیمنگٹن روڈ تھا۔ یہاں لاہور کے اشرف صاحب کا آٹو ورکشاپ تھا۔ کوچوان نے بگھی ورکشاپ کے سامنے کھڑی کر دی اور خود اندر چلا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسلمان کوچوان میرا ہمدرد تھا جس نے مجھے اتنے بڑے انجانے شہر میں در بدر ہونے سے بچا لیا تھا اور مجھے محفوظ ہاتھوں کے حوالے کر دیا تھا۔ کوچوان کی شکل مجھے پوری طرح یاد ہے مگر اس شریف آدمی کا نام میں بھول گیا ہوں۔ اس کا قد لمبا تھا، جوان آدمی تھا، سانولا تھا اور چہرے پر ماتا کے داغ تھے۔ تھوڑی دیر بعد ورکشاپ سے باہر نکلا تو اس کے ساتھ پچاس سال کا گھنگھریالے بالوں اور تلوار مار کہ مونچھوں والا ایک خوش شکل آدمی بھی تھا۔ یہ آدمی اشرف تھا جو لاہور کے محلہ لوہاری منڈی کا رہنے والا تھا اور فلم ایکٹریس ثریا کا قریبی رشتہ دار تھا۔ ولن ظہور اس ورکشاپ میں اکثر آتا جاتا رہتا تھا۔ اشرف صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ "کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے کہہ دیا۔ "لاہور سے آیا ہوں۔"

انہوں نے کہا۔ "سامان کہاں ہے؟"

میں نے کہا۔ "میرا کوئی سامان نہیں ہے۔"

اشرف صاحب نے کہا۔ "وکٹوریہ والے کو کرایہ دے دو، تمہارے پاس پیسے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں ہیں۔"

میں نے کوچوان کو پیسے دیے جو دس پندرہ روپے بن چکے تھے۔ یہ آج کے زمانے کے سو ڈیڑھ سو روپے کے برابر تھے۔ کوچوان سلام کر کے چلا گیا اشرف صاحب نے مجھے گیراج میں ایک طرف لوہے کی کرسی پر بٹھا دیا اور پوچھا۔

"بھوک تو نہیں لگی۔"

میں نے کہا۔ "جی نہیں، میں نے ٹرین میں ناشتا کر لیا تھا۔"

"ہوں۔" اشرف صاحب نے فکر مند لہجے میں لمبی سی ہوں کہی اور بولے۔ "گھر سے بھاگ کر آئے ہو؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں۔"

وہ بولے۔ "بڑی غلطی کی تم نے۔ تمہارے گھر والے اس وقت کتنے پریشان ہوں گے۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اتنا انہیں بتا دیا کہ میں امرتسر سے آیا ہوں اور ہمارا گھر امرتسر میں ہے وہ بولے۔

"ٹھیک ہے، ظہور بھائی تھوڑی دیر میں آئیں گے۔ تم ان کے ساتھ فلم کی شوٹنگ دیکھنے چلے جانا۔ تمہارا شوق دیدار پورا ہو جائے گا۔"

اشرف صاحب بڑے دردمند اور نیک دل انسان تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ انہوں نے میرے والے وکٹوریہ کے کوچوان کو کہہ رکھا تھا کہ اگر پنجاب سے کوئی ایسا لڑکا تمہیں ملے جو فلمی دنیا کے شوق سے گھر سے بھاگ کر آیا ہوا ہو تو اسے میری ورکشاپ میں لے آیا کرو۔

اشرف صاحب اس لڑکے سے اس کے گھر کا ایڈریس معلوم کر لیتے تھے اور اس کے گھر والوں کو خط پوسٹ کر دیتے تھے کہ آپ کا بیٹا میرے پاس محفوظ ہے۔ اسے آ کر لے جائیں۔ اتنی دیر تک وہ اپنی جیب سے لڑکے کو کھلاتے پلاتے تھے۔ ظہور صاحب کے ذریعے اسے فلمی دنیا کی سیر بھی کراتے اور فلم کی شوٹنگ وغیرہ بھی دکھا دیتے تھے۔

اشرف صاحب نے باتوں باتوں میں مجھ سے میرے گھر کا ایڈریس معلوم کر لیا اور مجھے بتائے بغیر میرے گھر خط پوسٹ کر دیا کہ آپ کا بیٹا میرے پاس ہے۔ کسی کو بھیج کر منگوا لیں۔

جب میرے والد صاحب کو خط ملا اور انہیں معلوم ہوا کہ میں محفوظ ہاتھوں میں ہوں تو انہوں نے مجھے برا بھلا کہہ کر اعلان کر دیا کہ میں کسی کو اسے لانے نہیں بھیجوں گا۔ بمبئی ایکٹر بننے گیا ہے تو اب ایکٹر بن کر ہی واپس آئے لیکن کچھ دنوں بعد والدہ کے اصرار پر انہوں نے بادل نخواستہ اپنے داماد لالہ عبدالرحمٰن کو اجازت دے دی کہ وہ آپو جی کو ساتھ لے کر بمبئی جائے اور مجھے واپس گھر لے آئے۔ لالہ عبدالرحمٰن کا ایک بھانجا بمبئی میں کراکری کا بزنس کرتا تھا۔ یہ سب کچھ بعد میں ہوا۔ اس دوران مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ میرے گھر خط لکھ دیا گیا ہے۔ میرے پاس کافی پیسے تھے جو میں نے اشرف صاحب کو بتائے تو انہوں نے کہا۔

"میرے پاس جمع کرا دو، جتنی ضرورت ہو لے لیا کرو۔"

میں روز ان سے پانچ روپے لے کر بمبئی شہر کی سیر کو نکل جاتا۔ دن میں دو دو فلمیں دیکھتا۔ ایرانی ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھاتا، چائے پیتا اور صبح کا اشرف صاحب کے گیراج سے نکلا شام کو واپس آتا۔ جس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

روز ظہور صاحب نے آنا ہوتا تھا اس روز میں ورکشاپ میں ہی رہتا اور ان کے ساتھ ان کی بڑی ٹرائف موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھ کر پرکاش اسٹوڈیو جا کر فلم کی شوٹنگ دیکھتا۔ اب یاد آ گیا ہے۔ ظہور صاحب کا فلمی نام ایم ظہور تھا۔ پہلی بار میں ظہور صاحب کے ساتھ پرکاش اسٹوڈیو گیا تو وہاں ان کی ایک فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔

ظہور صاحب اس فلم میں ولن کا کردار ادا کر رہے تھے۔ وہ مجھے اسٹوڈیو میں کرسی پر بٹھا کر سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس میرے پاس چھوڑ کر میک اپ روم میں چلے جاتے۔ اسٹوڈیو کے فلور پر کسی راجا کے محل کا سیٹ لگا تھا۔ پرکاش اسٹوڈیو میں ہی میں نے اس زمانے کی مشہور ہیروئن پرمیلا اور مس مادھوری کو دیکھا۔ اشرف صاحب کو شیر کے شکار کا بھی شوق تھا۔

ایک دن انہوں نے شیر کے شکار کا پروگرام بنایا اور اصرار کر کے میں بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ ہماری ٹولی میں ایک اشرف صاحب تھے۔ ان کا پارسی منیجر مسٹر جہانگیر اور ڈرائیور باٹا اور دو ملازم تھے۔ چنانچہ ایک دن ہم رائفلیں وغیرہ لے کر دو جیپوں میں سوار ہو کر بمبئی سے سو دو سو میل دور ست پڑا کے جنگلوں کی طرف چل دیے۔

بمبئی سے ہم دن کے وقت چلے تھے۔

ہم دو جیپوں میں بیٹھے تھے۔ چار پانچ رائفلیں اور تین بندوقیں ساتھ تھیں۔ میگزین بھی کافی تھا۔ کھانے کا خشک راشن اور چائے کی کیتلی اور کپ وغیرہ بھی رکھ لیے تھے۔ بمبئی شہر کے مضافات کافی دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ کافی دیر تک ہماری جیپیں پکی سڑک پر دوڑتی رہیں۔ پھر پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا۔

یہ پہاڑی علاقہ ایسا نہیں تھا جیسا ہمارے کوہ مری ایبٹ آباد کا علاقہ ہے۔ یہ سطح مرتفع قسم کا علاقہ تھا۔ دور دور بڑے بڑے پہاڑ کھڑے تھے۔ موسم خوش گوار تھا۔ برسات کا موسم گزر چکا تھا۔ یہ موسم شکار کے لیے بڑا موزوں ہوتا ہے۔ لوہاری منڈی لاہور والے اشرف صاحب بڑے تجربہ کار شکاری تھے۔ وہ اگلی جیپ پر اپنے ورکشاپ کے پارسی منیجر مسٹر جہانگیر کے ساتھ بیٹھے تھے۔ جہانگیر بھاری بدن کا گورا چٹا خوش کل پارسی نوجوان تھا۔ جہانگیر گاڑی چلا رہا تھا۔

میں اور ڈرائیور باٹا پچھلی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ دوسری جیپ پر اشرف صاحب کے تین ملازم سامان کے ساتھ بیٹھے تھے۔ صرف ایک ملازم کے پاس دو نالی بندوق تھی۔ باقی سارا اسلحہ ہماری والی جیپ میں تھا۔ کافی دیر تک سفر کرنے کے بعد ہماری جیپ پکی سڑک سے اتر کر ایک جنگل میں داخل ہو گئی۔ یہ جنگل اس قسم کا تھا کہ کہیں گھنے درخت تھے تو کہیں اونچی اونچی گھاس والا میدان آ جاتا تھا۔

تمام راستے اشرف صاحب اور جہانگیر کو معلوم تھے۔ وہ پہلے بھی کئی بار وہاں شکار کھیلنے آ چکے تھے۔ میں جنگل کے درختوں اور بھورے رنگ کی پہاڑیوں اور ندی نالوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ دوپہر کے وقت ہم ایک گاؤں میں داخل ہوئے جہاں بیس پچیس جھونپڑے تھے۔

یہ جنگل کے دیہاتی لوگوں کے جھونپڑے تھے۔ کالے کالے دبلے پتلے آدمی تھے۔ ان کی عورتیں تقریباً نیم عریاں تھیں۔ بچے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ اس گاؤں میں ہم نے کھانا کھایا' چائے پی اور آگے چل پڑے۔ اب ہم جنگل میں کافی آگے نکل آئے تھے۔

مجھے سرکنڈوں کی مرطوب خوش بو آتی تھی۔ وہ

خوش بو اس وقت بھی مجھے محسوس ہوتی ہے۔ اگر کسی جگہ گل مہر کا کوئی سرخ پھول دیکھا تھا تو وہ پھول آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اس کی وجہ صرف اتنی ہے کہ میں ان چیزوں سے محبت کرتا ہوں اور صرف پھولوں' قسم قسم کے درختوں اور خوب صورت چہرے دیکھے تھے۔ وہ مجھے صرف یاد نہیں ہو گئے بلکہ میری روح کا ایک حصہ بن چکے ہیں اور مرنے کے بعد میری روح کے ساتھ ہی آگے جائیں گے۔ باقی جو میرے اللہ کو منظور۔

جیسے جیسے چیزیں یاد آتی جاتی ہیں ویسے ہی لکھتا جا رہا ہوں۔ میں اپنی طرف سے اس میں کوئی افسانوی رنگ شامل نہیں کر رہا۔ جنگل میں کوئی نالہ یا پہاڑی چشمہ آ جاتا تو وہاں ہم منہ ہاتھ دھوتے کچھ آرام کرتے اور پھر آگے چل پڑتے۔ شام کے وقت ہم ایک اور گاؤں میں آ گئے۔

یہ بالکل جنگلی لوگوں کا گاؤں تھا۔ جسے وہاں کی زبان میں آدھی باسی کہا جاتا ہے۔ کالے' دبلے پتلے' لال لال آنکھوں والے آدھے ننگے لوگ تھے۔ عجیب طرح کی اردو زبان بولتے تھے۔ پورے جملے میں ایک آدھ لفظ ہی ہندوستانی کا ہوتا تھا۔ ان کی زبان اشرف صاحب اور جہانگیر خوب سمجھ لیتے تھے۔ بانس کے جھنڈوں میں ان کی جھونپڑیاں تھیں۔

عورتیں لباس کے جھنجھٹ سے آزاد تھیں۔ وہاں ہم نے اپنا کھانا پکا کر کھایا۔ رات ہو گئی تھی۔ اتنے میں ایک آدمی وہاں آیا جو اچھی خاصی ہندوستانی زبان بول لیتا تھا۔ جو زبان یہ لوگ بولتے تھے وہ اردو نہیں تھی۔ ہندوستانی تھی۔ اس میں گجراتی اور مراٹھی زبانوں کے الفاظ بھی تھے۔ ڈرائیور دبلا پتلا آدمی تھا۔ گردن لمبی تھی۔ اس کے ہاتھ گجراتی کا ایک جملہ آ گیا تھا۔ وہ ہر ایک جنگلی کے ساتھ وہی جملہ بول رہا تھا۔

"تمے سوں کرے چھے؟"

یعنی تم کیا کر رہے ہو؟ باٹا کی موجودگی سے شکاریوں کی اس پارٹی میں کافی رونق ہو گئی تھی۔ جو جنگلی آدمی آیا تھا اس نے اشرف صاحب اور جہانگیر کو بتایا کہ وہاں سے چھ میل دور جنگل کے اندر کل ایک شیر گاؤں کے باڑے سے ایک گائے اٹھا کر لے گیا تھا۔ جس کا بچا ہوا گوشت اور ہڈیاں گاؤں سے ایک کوس کے فاصلے پر ایک کھیت کے اندر ابھی تک پڑی ہیں اور خیال ہے کہ شیر آج رات اسے کھانے ضرور آئے گا۔ آپ لوگ اس شیر کو مار کر گاؤں والوں کو اس عذاب سے نجات دلائیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں اشرف صاحب کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ اشرف صاحب نے کہا۔

"تمے فکر نہ کرے چھے' ہم آج رات شیر کو مار گرائے گا۔"

اور کھانا وغیرہ کھانے کے بعد ہم لوگ جیپوں میں سوار ہو گئے۔ اس آدمی کو ساتھ لیا اور شیر کو شکار کرنے چل پڑے۔ اس وقت مجھے ڈر لگا۔ بمبئی سے جب میں اس شکاری پارٹی کے ہمراہ چلا تھا تو بڑا خوش تھا کہ جنگلوں میں پھروں گا۔

جھیلیں' چشمے' پہاڑ اور درختوں کے جھنڈ دیکھوں گا لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ پارٹی اس جگہ جا رہی ہے جہاں آج رات کو شیر آئے گا تو میں بالکل سچ کہوں گا مجھ پر خوف سا طاری ہو گیا تھا کہ اگر شیر نے ہم پر حملہ کر دیا اور ہم میں سے کوئی بھی اس پر گولی نہ چلا سکا یا شیر کو نہ لگ سکی تو کیا ہو گا؟ وہ تو مجھے کھا جائے گا۔ تب میں پچھتانے لگا کہ شکاری پارٹی کے ساتھ یہاں کیوں آ گیا۔

جنگل کا وہ تنگ سا راستہ آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ جہاں سے ہماری جیپیں ہچکولے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھاتی گزر رہی تھیں۔ اس جنگلی راستے کی دونوں جانب بانس کے اونچے اونچے گھنے جھنڈ تھے۔ جن میں سے سائیں سائیں کی آوازیں آ رہی تھی۔ ہم لوگ ایک ایسی جگہ جہاں تین چار جھونپڑے تھے دو نیم عریاں جنگلی ہاتھوں میں نیزے لیے ایک جھونپڑے کے باہر کھڑے تھے۔

جھونپڑے کے دروازے میں مٹی کے تیل والی لالٹین روشن تھی۔ ہمارے ساتھ جو آدمی آیا تھا وہ ان جنگلی آدمیوں سے ان کی زبان میں باتیں کرنے لگا۔ پھر اس نے اشرف صاحب کو بتایا کہ سامنے والے جھونپڑے میں ان لوگوں کے جانور بندھے ہوئے ہیں۔ شیر کل رات اسی باڑے سے ایک گائے اٹھا کر لے گیا تھا۔ ہم نے وہاں جا کر باڑے کو دیکھا۔ اندر دو گائیں اور ایک گدھا بندھا ہوا تھا۔ وہ آدمی یعنی ہمارا گائیڈ کہنے لگا کہ یہاں سے تھوڑے فاصلے پر ایک کھیت کی فصل میں گائے کی بچی کچی لاش پڑی ہے۔ جس کو کھانے آج رات شیر ضرور آئے گا۔

اشرف صاحب بولے۔

"چلو چل کر گائے کی لاش کو دیکھتے ہیں۔"

میرے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ یہ تو عین اس جگہ جا رہے ہیں جہاں شیر آنے والا ہے۔ ہوسکتا ہے ہمارے وہاں پہنچتے ہی شیر آ جائے اور ہم پر حملہ کر دے اور اشرف صاحب اور جہانگیر اسلحہ سنبھالتے ہی رہ جائیں۔ اشرف صاحب نے ایک رائفل مجھے دے دی تھی۔ رائفل کی نالی پر لمبی ٹارچ بندھی ہوئی تھی۔ اشرف صاحب نے خاص طور پر مجھے کہا کہ "آپ گولی مت چلانا، جب میں کہوں تو فائر کرنا۔"

مویشیوں کے باڑے سے نکل کر شکاری پارٹی وہ جگہ دیکھنے چل پڑی جہاں شیر کی آدھی کھائی ہوئی گائے کی لاش پڑی تھی۔ میں بہت ڈر رہا تھا اور اشرف صاحب اور جہانگیر کے درمیان میں چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ درختوں، جھاڑیوں میں سے اندھیرے میں سے گزرتے آخر ہم ایک کھیت میں آ گئے۔ وہاں کھیت کے درمیان ایک جگہ گائے کی آدھ کھائی لاش پڑی تھی۔ اشرف صاحب اور جہانگیر نے ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ آدھی گائے شیر نے کھائی ہوئی تھی۔ اشرف صاحب کہنے لگے۔

"جہانگیر اس طرف کوئی درخت دیکھو جس پر مچان ڈالی جا سکے۔"

لیکن وہاں کوئی درخت نہیں تھا۔ جہانگیر بولا۔

"دادا ادھر چارے کے گھٹے کے پاس ہی بیٹھنا پڑے گا۔"

اشرف صاحب بولے۔

"فکر نہیں، ہم یہاں بیٹھ کر ہی شیر مار لیں گے۔"

میں اور زیادہ خوف زدہ ہو گیا۔ مچان پھر بھی اونچی ہوتی ہے اور شیر سے بچنے کا امکان تھا لیکن زمین پر مورچہ بنا کر شیر کو شکار کرنے میں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ شیر چھلانگ لگا کر ہم میں سے کسی کو بھی دبوچ سکتا تھا لیکن میں اپنے خوف کو ظاہر کر کے اپنا مذاق نہیں بنانا چاہتا تھا۔ پس خاموش رہا اور دل میں یہی دعا مانگتا رہا کہ یا اللہ شیر آج کی رات اس طرف نہ آئے۔

میں اور اشرف صاحب گھاس کے بڑے بڑے گٹھوں کے پیچھے رائفلیں لے کر بیٹھ گئے۔ ہماری رائفلوں کے آگے ٹارچ بندھی ہوئی تھی۔ اشرف صاحب نے مجھے ہدایت کرتے ہوئے کہا۔

"جس وقت ہماری ٹارچ روشن ہو تم بھی ٹارچ روشن کر دینا اور جہاں ہماری ٹارچ کی روشنی پڑے تم بھی اسی جگہ ٹارچ کی روشنی ڈالنا خبردار فائر مت کرنا۔ فائر صرف میں جہانگیر اور باٹا کریں گے۔ تم صرف ٹارچ کی روشنی ڈالو گے۔ سمجھ گئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"جی ہاں، سمجھ گیا ہوں۔"

ہمارے پیچھے ایک ڈھلان تھی۔ ٹیلے کے اوپر ایک جانگلی کھڑا کر دیا گیا تھا۔ جس کے ہاتھ میں نیزہ تھا تاکہ اگر شیر پیچھے سے آ جائے تو وہ شور مچا کر ہمیں خبردار کر دے۔ یہ جانگلی لوگ واقعی بڑے بہادر تھے اور بعد میں پتا چلا کہ صرف نیزے کے ساتھ شیر کا شکار کر لیتے ہیں۔ اس وقت ہمارے چاروں جانب خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

رات کا اندھیرا پھیکا پھیکا سا تھا اور کھیت کی فصل اور دور کے درخت سایوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ اب ہمیں مچھروں نے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ مجھے آج بھی یاد ہے میں نے اپنی گردن پر بیٹھے ہوئے مچھر کو ہاتھ سے مارا تو اشرف صاحب نے سرگوشی میں مجھے ڈانٹا۔

"بے وقوف شور مت کرو۔"

اس کے بعد مچھر مجھے کاٹتے رہے اور میں اپنے اوپر جبر کر کے پتھر کے بت کی طرح بیٹھا رہا۔ آدھا گھنٹہ اسی طرح ہمیں بے حس و حرکت بیٹھے گزر گیا۔ پھر دور کھیتوں میں کچھ ہل جل کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی دور سے شیر کی دہاڑ سنائی دی۔

جنگل کی رات کی خاموشی میں دور سے سنائی دیتی شیر کی دہاڑ آج بھی میرے کانوں میں سنائی دے رہی ہے۔

میرا دل خوف کے مارے زور سے دھڑکنے لگا۔ اشرف صاحب نے ہلکی سی سیٹی بجا کر جہانگیر اور باٹا کو خبردار کیا جو ہماری دائیں جانب گھاس کے گٹھوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس طرف سے بھی کسی نے آہستہ سے سیٹی بجا کر جواب دیا کہ ہم نے شیر کی دہاڑ سن لی۔ اس خیال سے میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی کہ شیر کسی وقت بھی پیچھے سے آ کر ہم پر حملہ کر سکتا ہے۔ ایک نیزہ بردار جانگلی اس کا کیا مقابلہ کر سکے گا۔ اتنے میں کھیت کی فصل میں دو آنکھیں اندھیرے میں چمکتی ہوئی دکھائی دیں۔ اشرف صاحب نے ٹارچ کی روشنی پر اپنی ٹارچ کی روشنی مرکوز کر دی۔ دوسری جانب سے جہانگیر اور باٹا کی ٹارچیں بھی روشن ہو کر کھیت میں چمکتی آنکھوں پر مرکوز ہو گئیں۔

اشرف صاحب تجربہ کار شکاری تھے۔ سرگوشی میں بولے۔

"یہ شیر کی آنکھیں نہیں ہیں۔"

میری جان میں جان آئی کہ شیر نہیں آیا ہے۔ اشرف صاحب نے مجھے سرگوشی میں کہا۔

"ٹارچ بند کر دو۔"

میں نے ٹارچ کی روشنی بند کر دی۔ اشرف صاحب نے بھی اپنی ٹارچ کی روشنی بجھا دی۔ اس کے فوراً بعد جہانگیر اور باٹا کی ٹارچیں بھی بجھ گئیں۔ چاروں طرف سناٹا اور اندھیرا تھا اور کسی تالاب سے جھینگر کی آواز آ رہی تھی۔ شیر کی دہاڑ اس کے بعد دوبارہ سنائی نہیں دی تھی۔ اشرف صاحب نے مجھے آہستہ سے کہا۔

"کھیت میں کوئی گیدڑ تھا جو گائے کی لاش کو کھانے آیا تھا۔"

ہم دیر تک بت بنے بیٹھے رہے۔ مچھر تنگ کر رہے تھے۔ کوئی مچھر میری گردن یا ماتھے پر بیٹھتا تو میں اسے ہاتھ سے اس طرح اڑا دیتا کہ آواز پیدا نہ ہو۔ آسمان پر صبح کا نور پھیلنے لگا۔ اشرف صاحب نے کہا۔

"اب شیر نہیں آئے گا۔"

اشرف صاحب نے مسٹر جہانگیر کو آواز دی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تمے سوں کرے چھے جہانگیر۔" اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور ان کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسری طرف سے جہانگیر اور باٹا بھی اٹھ کر آ گئے۔

جہانگیر نے کہا۔

"دادا! شیر بڑا مکار ہے۔ اس کو ہمارا پتا چل گیا تھا۔"

اشرف صاحب نے کہا۔ "شیر کی قسمت اچھی تھی بچ گیا۔"

باٹا نے کہا۔ "دادا! آج رات اسے مار لیں گے۔"

اشرف صاحب بولے۔ "اب وہ ادھر نہیں آئے گا۔"

ہم ایک جھونپڑے میں آ کر بیٹھ گئے۔ یہاں بیٹھ کر چائے بنوا کر پی گئی۔ جھونپڑی کا فرش اور دیواریں پکی تھیں مگر بڑی صاف ستھری تھیں۔ دیوار پر شیشے میں جڑی ہوئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصویر لگی تھی۔ انہوں نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ چائے پینے کے بعد اشرف صاحب نے کہا۔

"ہم یہاں کم از کم تین گھنٹے سوئیں گے۔"

وہ سب جھونپڑے کے اندر ہی گھاس پھوس کے بستر پر دراز ہو گئے۔ میں بھی ایک طرف لیٹ گیا۔ سب سو گئے۔ مجھے بھی نیند آ گئی لیکن مچھروں نے مجھے جگا دیا۔ میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ باہر سنہری دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں جھونپڑے کے پیچھے بانس اور ناریل کے درختوں میں پھرنے لگا۔ بڑی شفاف ہوا تھی۔

ہوا میں طرح طرح کے پودوں، درختوں اور جنگلی پھولوں کی خوش بو تھی۔ میں نے ایک جگہ گل مہر کے زرد پھول دیکھے۔ اس سے پہلے میں نے گل مہر کے سرخ پھول ہی دیکھے تھے۔ پھولوں پر شبنم کے موتی دھوپ میں چمک رہے تھے۔

گھاس بھی رات بھر کی اوس میں بھیگی ہوئی تھی۔ ایک جگہ تین چار کیلے کے درخت ساتھ ساتھ اُگے ہوئے تھے۔ ان کے پتوں کے درمیان زرد کیلوں کے گچھے لٹک رہے تھے۔ میں دو تین کیلے توڑ کر کھانے لگا۔ یہ چھوٹے چھوٹے کیلے تھے اور ان میں ہماری ہری چھال والے کیلوں کی خوش بو نہیں تھی مگر میٹھے بڑے تھے۔

کافی دیر بعد شکاری لوگ سو کر اٹھے۔ وہاں ہم سب نے ناشتا کیا۔ سوکھی مچھلی یہ لوگ ساتھ لائے تھے جسے وہاں بھونا گیا۔ ناشتے کے بعد یہ شکاری پارٹی واپس اسی جگہ آ گئی جہاں ہماری جیپیں کھڑی تھیں۔ ایک ہی رات میں جنگل کے مچھروں نے مجھے بد دل کر دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ لوگ اب واپس بمبئی چل پڑیں گے لیکن وہ جیپوں میں بیٹھ کر دوسرے جنگل کی طرف چل پڑے۔

دوپہر تک ہم لوگ جنگل میں پھرتے رہے۔ اشرف صاحب اور جہانگیر نے ایک جنگلی بکرے کا شکار مارا اور وہیں ذبح کر کے آگ جلا کر بھونا گیا اور دوپہر کا لنچ کھایا۔ اس کے بعد پھر یہ پارٹی آگے روانہ ہو گئی۔ جیپیں آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔ ایک ریچھ کا شکار کیا گیا جس کو وہیں چھوڑ دیا گیا۔

کئی پرندے بھی شکار کیے گئے۔ رات آ گئی۔ رات کو وہیں جنگل میں ایک جگہ سب لیٹ گئے۔ دو ملازم بندوقیں لے کر باری باری رات کو پہرہ دیتے رہے۔ صبح چھ سات مرغابیاں مار کر ان کا ناشتا کیا گیا۔ شیر کہیں نہ ملا۔ دوسرا اور پھر تیسرا دن بھی جنگلوں میں گھومتے پھرتے اور چھوٹا شکار کرتے گزر گیا۔

کہیں کوئی چشمہ آ جاتا تو سب وہاں بیٹھ کر منہ ہاتھ دھوتے۔ تھوڑا آرام کرتے اور پھر شیر یا کسی چیتے کی تلاش میں آگے چل پڑتے۔ ایک جگہ درخت کی ٹہنی پر میں نے سانپ کی کینچلی دیکھی۔ وہ بالکل سانپ کی طرح ٹہنی سے چمٹی ہوئی تھی۔ صاف لگتا تھا کہ سانپ کینچلی کے اندر سے نکل گیا ہے اور کینچلی باقی رہ گئی ہے۔ اشرف صاحب کے ایک نوکر نے کینچلی سمیٹ کر رومال میں باندھ لی۔ کہنے لگا۔

"اس کا سرمہ آنکھوں کے لیے بڑا مفید ہوتا ہے۔"

اس طرح ہم کچھ دن جنگلوں میں پھرتے رہے مگر کوئی شیر نہ ملا۔ ساتویں روز ہم بمبئی کی طرف واپس روانہ ہو گئے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ہمارے رنگ سانولے ہو گئے تھے۔ خدا خدا کر کے بمبئی شہر میں داخل ہو گئے۔

ورکشاپ میں آ کر مجھے ایک ملازم نے بتایا۔

"تمہاری والدہ تمہیں لینے بمبئی آئی ہوئی ہیں۔ میں نے کہا وہ سب لوگ شکار کھیلنے گئے ہوئے ہیں۔"

والدہ صاحبہ اپنے بھانجے اور میرے بڑے خالہ زاد بھائی کے ساتھ مجھے لینے بمبئی آئی تھیں۔ وہ ورکشاپ میں اپنا ایڈریس دے گئی تھیں۔ میں آپو جی کے آنے کا سن کر بے تاب ہو گیا اور اسی وقت ٹیکسی لے کر والدہ صاحبہ جہاں ٹھہری ہوئی تھیں وہاں پہنچ گیا۔ والدہ نے مجھے دیکھتے ہی گلے لگا لیا۔ ہم دونوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے کہا۔

"چلیں واپس امرتسر چلتے ہیں۔ میں اب یہاں نہیں رہوں گا۔"

بھانجے صاحب نے کہا۔

"بھائی ہم بمبئی آئے ہیں تو ایک دو دن یہاں کی سیر ہی کر لیں۔"

مگر میرے اصرار پر ہم دوسرے دن ہی بمبئی سے امرتسر واپس چلے پڑے۔ والدہ اشرف صاحب کا شکریہ ادا کرنے ان کی بیگم صاحبہ کے پاس بھی گئیں۔ اشرف صاحب نے باٹا کو گاڑی دے کر ہمیں اسٹیشن پر پہنچایا اور جب تک ٹرین نہ چلی باٹا پلیٹ فارم پر کھڑا رہا۔

یوں بمبئی کی میری پہلی یاترا اختتام کو پہنچی۔ اس کے بعد کے اپنے بمبئی کے سفر کے حالات آگے چل کر بیان کروں گا۔ جب مجھے دو دن کا فاقہ آ گیا تھا اور نانی یاد آ گئی تھی۔ ابھی میں آپ کو اپنے ایک اور دلچسپ سفر کا حال بیان کرنا چاہتا ہوں۔ بمبئی سے والدہ کے ساتھ امرتسر پہنچا تو والد صاحب نے بڑا لحاظ کیا اور میری بالکل ٹھکائی نہ کی لیکن انہوں نے مجھے ایک جگہ پھنسا دیا۔

ہال بازار ہمارے امرتسر والے مکان سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھا۔ ہال بازار میں عبدالغفار پینٹر کی دکان کے بالکل سامنے والی عمارت کی دوسری منزل میں اصفہانی چائے کمپنی کا دفتر تھا۔ پہلے یہ سن لیجیے کہ عبدالغفار پینٹر بڑے خاموش طبع اور نیک دل انسان تھے۔ بڑا سا بورڈ سامنے رکھے وہ رنگ روغن سے اس پر اردو یا انگریزی حروف کے خاکوں میں زرد اور سرخ رنگ بھرا کرتے تھے۔ اردو املا وہ بڑی خوب صورت لکھتے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد پاکستان کی فلم انڈسٹری میں جس خاتون گلوکارہ نے اپنی گھریلو قسم کی سریلی آواز میں بڑے کامیاب فلمی گیت گائے ان کا نام زبیدہ خانم تھا۔ عبدالغفار پینٹر زبیدہ خانم کے والد صاحب تھے۔

لاہور کے ایک فلم اسٹوڈیو میں جب میں نے پہلی بار گلوکارہ زبیدہ خانم کو دیکھا تو بڑا حیران ہوا۔ زبیدہ خانم کی شکل اپنے والد صاحب کی ہو بہو کاپی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اصفہانی چائے کمپنی کا اسسٹنٹ منیجر ہمارے والد صاحب کا دوست تھا۔ والد صاحب نے انہیں کہا کہ حمید میٹرک پاس کرنے کے بعد آوارہ پھر رہا ہے۔ اسے چائے کمپنی کے دفتر میں کہیں ملازم کرادو۔ اس طرح کام پر لگ گیا تو سیدھا ہو جائے گا۔ چنانچہ اسسٹنٹ منیجر صاحب نے مجھے اصفہانی چائے کمپنی میں بطور سیلز مین ملازم رکھوا دیا۔ میری ڈیوٹی یہ تھی کہ سائیکل کے پیچھے چائے کا چھوٹا کریٹ رکھ کر شہر کے ہوٹلوں میں جاؤں۔ ان سے چائے کے آرڈر لوں اور انہیں چائے سپلائی کروں۔

مجھے یہ نوکری بڑی اچھی لگی کیونکہ اس کی وجہ سے مجھے سارے شہر کی سیر کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ اصفہانی چائے کمپنی کے پاس تین چار برانڈ کی چائے تھی۔ ایک ریڈ سپاٹ تھی' ایک گرین سپاٹ تھی اور ایک ماؤنٹین بو کے تھی۔

ماؤنٹین بو کے اصفہانی کی اعلیٰ کوالٹی کی چائے تھی۔ مجھے اس برانڈ کی خشک چائے کی خوش بو اور اس کی دم کرنے کے بعد کی خوش بو آج تک یاد ہے۔ اصل میں یہی وہ خوش بوئیں ہیں جو میری روح کو توانائی اور میرے جسم کو زندہ رہنے کی طاقت بخشتی ہیں۔ اگر اعلیٰ چائے' اعلیٰ سگریٹوں اور سرخ گلابوں' سفید موتیا اور گرمیوں میں منہ اندھیرے باغوں میں سے گزرنے والی نہروں کی مرطوب خوش بوئیں نہ ہوتیں تو پتا نہیں میرا کیا حال ہوتا۔ زندہ تو میں ضرور رہتا لیکن معلوم نہیں کس حال میں زندہ ہوتا۔

اتنا ضرور ہے کہ ان خوش بوؤں اور خوب صورت چہروں اور اداس موسیقی اور شارلٹ برونٹے کے رومان انگیز غمگین ناولوں اور اقبالؒ کی شاعری کے بغیر میری زندگی حبس دوام اور عبور دریائے شور کی زندگی ہوتی۔

مجھے اصفہانی چائے کمپنی میں سیلز مین کی نوکری مل گئی تھی۔ اس نوکری سے میں بڑا خوش تھا کیونکہ مجھے سائیکل پر سوار ہو کر مسلسل امرتسر کے بازاروں وغیرہ میں گھومنا پھرنا پڑتا تھا اور یوں میری آوارہ گردی کا شوق پورا ہو جاتا تھا۔ مختلف برانڈ کی چائے کے ایک ایک پاؤنڈ کے ڈبے میری سائیکل کے پیچھے لکڑی کے کریٹ میں بھرے ہوتے اور میں شہر کے ہوٹلوں میں چائے سپلائی بھی کرتا اور ان سے نئے آرڈر بھی لیتا۔

ایک خوشی یہ بھی تھی کہ اس طرح مجھے چائے کے ساتھ رہنے کا موقع مل جاتا تھا۔ چائے کا گودام ہمارے محلے میں پیلے اسپتال کے پیچھے تھا۔ دو سیلز مین اور بھی تھے۔ ایک گورکھا لڑکا تھا اور ایک ہندو لڑکا تھا جو سیتا پور کا رہنے والا تھا۔ مال لینے جب میں چائے کے گودام میں جاتا تو فضا سوکھی چائے کی مہک سے لبریز ہوتی تھی۔

میرا دل گودام سے باہر نکلنے کو نہیں چاہتا تھا۔ میں چاہتا کہ سارا دن گودام میں ہی چائے کے ڈبوں کے پاس بیٹھا رہوں۔ سبز چائے کی بوریاں بھی گودام میں تھیں۔ ایک روز میں تھوڑی سی سبز چائے گھر لے گیا۔ آپو جی نے چائے کو پہلا ابال دیا تو چائے کی پتیاں ایسے کھل گئیں جیسے ابھی ٹہنیوں سے توڑ کر پتیلی میں ڈالی گئی ہوں۔ پانچ پانچ پتیوں والی باریک ڈالیاں تھیں۔ اس چائے کی ابھی کٹائی نہیں ہوئی تھی۔ لالہ عبدالرحمٰن بھی وہاں بیٹھے تھے۔ انہوں نے چائے کی کھلی ہوئی پتیاں دیکھیں تو بولے۔

"یہ اصلی ہے آپو جی!"

پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"یار میرے لیے بھی یہ چائے لا دے۔"

میں نے گودام سے دو پونڈ کے قریب سبز چائے چوری کی اور لالہ جی کو لا کر دے دی۔ وہ بڑے خوش

ہوئے اور چائے لے کر رکھ لی۔ اس کے علاوہ گودام میں چورا چائے کے بڑے ڈبے بھی ہوتے تھے۔ اس کو ڈسٹ چائے کہتے تھے۔ یہ چائے بہت زیادہ رنگی ہوئی ہوتی تھی۔

یہ چائے ہوٹلوں میں سپلائی کی جاتی تھی۔ یعنی چائے کی دکانوں کو سپلائی کی جاتی تھی جہاں کاریگر مزدور اور ڈرائیور آ کر چائے پیتے تھے۔ یہ چائے تیز اور اسٹرانگ ہوتی تھی اور اس کا رنگ بڑی جلدی نکل آتا تھا۔ نوکر پیشہ اور مزدور لوگ جلدی میں ہوتے تھے اور وہ چائے کے دم آنے کا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ یہ چائے لکڑی کے بڑے کھوکھوں میں ہوٹلوں کو سپلائی کی جاتی تھی۔

کبھی کبھی چائے کمپنی کے ہال بازار والے آفس میں چھ سات بوڑھے لمبے لمبے چوغے پہنے آتے تھے۔ یہ لوگ تاجکستانی اور یارقندی ہوتے تھے۔ گورے اور سرخ اور ترچھی آنکھوں والے۔ ہنستے تھے تو آنکھیں رخساروں میں چھپ جاتی تھیں۔ یہ بوڑھے چائے کے مختلف برانڈ کو بلینڈ کرنے کے ماہر تھے۔ وہ ایک لمبی میز کے آمنے سامنے کھڑے ہو جاتے۔ میز پر چھوٹی چھوٹی چینی کی پیالیاں جن کو فنجان کہتے ہیں پڑی ہوتیں۔

ہر پیالی کے پاس ایک سفید کاغذ ہوتا۔ ایک پنسل بھی رکھی ہوتی۔ کاغذ پر نمبر شمار درج ہوتا۔ دوسرے کاغذ میں مختلف ڈھیروں میں سے تھوڑی تھوڑی سوکھی چائے پیالی میں ڈال کر اوپر سے گرم پانی ڈالتا۔ پیالی پر پرچ رکھ کر اسے دم آنے کے لیے ایک منٹ دیتا۔ پھر پرچ اٹھا کر پیالی ہونٹوں کے ساتھ لگا کر چائے کا ایک چھوٹا سا گھونٹ منہ میں لیتا۔ منہ کے اندر ہی اندر اسے اِدھر اُدھر دو تین بار گھماتا۔ پھر نیچے ٹین کے ڈبے میں کلی کرتے ہوئے پھینک دیتا

اور سفید کاغذ پر فارسی زبان میں اپنے تاثرات درج کر دیتا کہ اس بلینڈ میں یہ خوبی ہے اور یہ کمی ہے۔ میں ان تاجک اور یارقندی بزرگوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتا تھا۔ مجھے لگتا کہ یہ چائے کے قریبی رشتے دار ہیں اور اس سے ملنے بڑی دور سے آتے ہیں۔

مسلم امرتسر کے کمپنی باغ میں ٹھنڈی کھوئی والی سڑک کا نام ہال روڈ تھا۔ یہ کمپنی باغ سے گزرتی تھی اور اس پر ہفتے میں ایک بار ہی کوئی تانگہ یا سائیکل سوار دکھائی دیتا تھا۔ ٹھنڈی کھوئی سے آگے گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول کا چوک تھا جس میں سے ایک سڑک مجیٹھ نام کے قصبے کی طرف نکل جاتی تھی۔

اس سڑک کا نام بھی مجیٹھ روڈ تھا۔ اس سڑک کی دونوں جانب جامن کے گھنے درخت تھے۔ ذرا آگے جا کر یہ سڑک بائیں جانب مڑ جاتی تھی جہاں سے کمپنی باغ والی نہر کا ایک سوا سڑک کی جانب چل پڑتا تھا۔ آگے امرتسر میڈیکل اسکول تھا۔ امرتسر میڈیکل اسکول کے سامنے سڑک پر نہر والے سوئے کے اوپر چائے کا ایک بڑا کھوکھا ہوتا تھا۔

نہر کا پانی چائے کے کھوکے یا دکان کے نیچے سے گزرتا تھا۔ یہ سوایا چھوٹی سی گدلی اور ٹھنڈے پانی والی نہر مجھے بہت پسند تھی۔ میں چائے کے اس کھوکھے والے کو بھی اصفہانی چائے سپلائی کرتا تھا۔ جس روز میں وہاں ڈسٹ چائے لے کر آتا تو نہر کے پاس لوہے کی کرسی پر بیٹھ کر چائے ضرور پیتا تھا۔ ایسا ہی گدلے ٹھنڈے پانی والا سوایا چھوٹی سی نہر لاہور میں گورنمنٹ ہاؤس والی سڑک کشمیر روڈ سے بانس کے درختوں والی سندر داس روڈ کی طرف جائیں تو چوک میں ہوا کرتی تھی۔

1948-50ء میں یہ چھوٹی سی نہر اپنے جوبن پر تھی اور اس کے اوپر آم کے درخت جھکے ہوئے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ نہر جب کشمیر روڈ سے ہوتی ہوئی چوک میں پہنچتی تھی تو چوک والی سڑک کے نیچے سے ہو کر آگے بانسوں والی سندر داس روڈ پر نکل آتی تھی۔ ساری سندر داس روڈ پر اس چھوٹی نہر پر آم کے درخت جھکے ہوئے ہوتے تھے۔ سڑک کی دوسری جانب بانس کے جھنڈ جھکے ہوئے ہوتے تھے۔

اس سڑک پر کبھی کبھار ہی کوئی تانگہ وغیرہ گزرتا تھا۔ سارا دن سڑک خالی پڑی رہتی تھی۔ اس سڑک پر سے گزرتے ہوئے یوں لگتا تھا جیسے ہم کسی جنگل سے گزر رہے ہیں۔ آج اس سڑک کا جنگل غائب ہو گیا ہے اور سڑک پر گاڑیوں' اسکوٹروں' ویگنوں کی اتنی ٹریفک ہوتی ہے کہ آدمی پیدل نہیں گزر سکتا۔ اس کے کنارے والی نہر بھی غائب ہو گئی ہے یا کسی جگہ سے نظر بھی آتی ہے تو اس کے پانی میں پلاسٹک کے لفافے اور کوڑا کرکٹ تیر رہا ہوتا ہے۔

مسلم امرتسر والی نہر بھی بالکل ایسی ہی اور چھوٹی سی تھی اور آج وہ بھی ہندوؤں' سکھوں کے ہجوم میں غائب ہو گئی ہوگی۔ نہروں کی قدر امرتسر کے مسلمانوں کو تھی اور وہی ان کے کناروں پر بیٹھ کر اس کی بہار دیکھا کرتے تھے۔

امرتسر کے ہندو بیوپاری تھے اور ہر وقت بیوپار کے حساب کتاب میں ڈوبے رہتے تھے۔ امرتسر کے سکھ زیادہ تر مزدور پیشہ اور لکڑی کا کام کرنے والے تھے۔ ان کے نزدیک نہر پانی کا ایک نالہ ہوتا ہے جس میں نہا کر اسے گندا کیا جاتا ہے اصفہانی چائے کمپنی والوں نے مجھے ایک ہندو منیجر کے ساتھ پٹھان کوٹ بھیج دیا۔ وہاں کمپنی کی جو برانچ تھی وہ ٹھیک بزنس نہیں کر رہی تھی۔ مجھے خاک معلوم نہیں تھا کہ بزنس کیا ہوتا ہے۔

کمپنی والے ایک مسلمان کو وہاں ضرور بھیجنا چاہتے تھے اور ان کے نزدیک میں بڑا موزوں مسلمان تھا۔ میں اس لیے خوش تھا کہ مجھے پٹھان کوٹ دیکھنے کا موقع ملے گا۔ پٹھان کوٹ کے آگے ڈلہوزی تھا' مگر میں وہاں نہیں جا سکا۔

پٹھان کوٹ کی سڑکیں کہیں سے اونچی تھیں اور کہیں سے گھاٹیاں نیچے کو اترتی تھیں۔ اس شہر میں پہاڑی شہروں کی جھلک تھی۔ اسٹیشن چھوٹا سا تھا۔ نیچے گھاٹی میں ایک بستی تھی جس کے سفیدے کے درخت اوپر سڑک سے صاف نظر آتے تھے۔ پٹھان کوٹ میں دس پندرہ دنوں میں ہی میرا جی بھر گیا اور میں کسی کو بتائے بغیر امرتسر واپس آ گیا۔ امرتسر میں آتے ہی میں نے چائے کمپنی کی ملازمت چھوڑ دی اور گھر سے بھاگ کر کلکتے چلا گیا۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ کلکتے کی آوارہ گردی کے بعد امرتسر واپس آیا تو والد صاحب نے پہلے تو میری خوب مرمت کی پھر اپنے ایک دوست عبداللہ خان سے کہا کہ لڑکے کو کسی جگہ لگا دو یہ آوارہ ہو رہا ہے۔

عبداللہ خان درمیانے قد کے مضبوط جسم والے بزرگ تھے اور امرتسر پٹھان کوٹ بس سروس کی سوسائٹی کے اعلیٰ عہدے دار بھی تھے اور سوسائٹی میں ان کی چھ سات بسیں بھی تھیں۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا اور انگریزوں نے سرگودھا شہر سے چند میل دور دھب سڑی کے مقام پر ایک ہوائی اڈے کی تعمیر شروع کر رکھی تھی۔

عبداللہ خان کشمیری تھے۔ انہیں ہوائی اڈے تک بجری وغیرہ پہنچانے کا ٹھیکہ مل گیا تھا اور چھ سات لاریوں کی سیٹیں باہر نکال کر انہوں نے لاریوں کو ٹرکوں میں تبدیل کر دیا تھا اور سردار خان نامی ایک سانولے رنگ کے اونچے لمبے دلچسپ شخص کو ڈرائیوروں کا منیجر بنا کر لاریوں کے ساتھ سرگودھا

سے روانہ کرنے والے تھے۔

والد صاحب نے ان سے میری نوکری کی بات کی تو عبداللہ خان صاحب نے مجھے سردار خان کے ساتھ اسسٹنٹ منیجر بنا کر بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ایک روز ہم چھ یا سات لاریوں کو لے کر امرتسر سے سرگودھا روانہ ہو گئے۔ سرگودھا شہر میں ریلوے پھاٹک کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ سرگودھا پہنچ کر ہم نے لاریاں اس میدان میں ایک طرف قطار میں کھڑی کر دیں۔ یہاں ریلوے پھاٹک کے پاس ایک کافی کھلا گودام ٹائپ کا کمرا خالی پڑا تھا۔ یہاں پانچ ڈرائیوروں نے چارپائیاں ڈال کر اپنے بستر لگا دیے۔ اس کمرے میں ایک طرف میں نے بھی اپنا بستر لگا دیا۔ یہ میرا صبح کی سیر اور قدرت کے نظاروں سے محبت کے عروج کا زمانہ تھا۔

میں بلاناغہ صبح کی سیر کو جایا کرتا تھا۔ صبح کی سیر میں اپنی صحت ٹھیک رکھنے کے لیے نہیں کرتا تھا۔ میری صحت پہلے ہی ضرورت سے زیادہ ٹھیک تھی۔ صبح کی سیر میں صرف پچھلے پہر کے آسمان پر پھیکے پڑتے ستاروں' شبنم کے موتیوں جڑے پودوں اور پھولوں اور مشرقی افق سے رنگ و نور کی کرنیں لٹاتے سورج کو طلوع ہوتے دیکھنے کے لیے کیا کرتا تھا۔

یہ سردیوں کا موسم تھا۔ سرگودھا میں بڑی سردی تھی۔ مگر میں صبح کو صرف ایک قمیص اور پاجامہ پہن کر سیر کرنے جاتا تھا۔ یہ میری شروع سے ہی عادت تھی۔ میں کبھی سر پر اونی ٹوپی پہن کر' گلوبند لپیٹ کر اور سویٹر اور جرابیں پہن کر سیر کرنے نہیں گیا تھا۔ میں سویٹر اور اونی ٹوپی پہن کر سردی سے بچنے کے جرم کا ارتکاب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں سردی سے کھلے جسم اور کھلے دل کے ساتھ ملنا چاہتا تھا اور مجھے دسمبر میں بھی صبح کی سیر کرتے ہوئے کبھی سردی نہیں لگی تھی۔

بدلتے موسم' گرمیوں کی لو' برسات کی بارش اور سردیوں کی دھند اور کہر میرے قبیلے کے لوگ تھے۔ میرے اپنے خاندان کے افراد تھے۔ میرے اپنے بہن بھائی تھے۔ پھر مجھے ان سے بچنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں ایک شخص سے محبت بھی کروں اور اس سے بچتا بھی پھروں اور اس سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی بھی کوشش کروں۔ آدمی اپنے آپ کو دشمنوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے دوستوں سے۔ اپنے خیر خواہوں سے نہیں۔

یہ موسم' یہ بارشیں' یہ سردیوں کی دھند اور گرمیوں کی تپش اور چلچلاتی دوپہروں کی لو۔ یہ سب میرے دوست تھے اور میرے دوست ہیں۔ میرے خیر خواہ تھے اور آج بھی میرے خیر خواہ ہیں۔ یہ مجھے کبھی نقصان نہیں پہنچاتے۔ انہوں نے مجھے کبھی نقصان نہیں پہنچایا۔ انہوں نے مجھے اتنا کچھ دیا ہے مجھ پر اتنا قرض چڑھا دیا ہے کہ میں ساری زندگی اس قرض کو نہیں اتار سکوں گا۔

سرگودھا شہر مجھے بڑا اچھا لگا۔ مختصر سا شہر تھا۔ آبادی مناسب تھی۔ آس پاس بڑے درخت تھے۔ سبزہ تھا۔ اس زمانے میں سرگودھا کا صابن اور سرگودھا کے مالٹے بڑے مشہور تھے۔ شہر کا ایک بڑا بازار تھا۔ یاد نہیں اس بازار کا نام کیا تھا۔ شاید ریل بازار تھا یا کچہری بازار تھا۔ کافی کشادہ بازار تھا۔ اس بازار میں ایک زمیندارہ ہوٹل ہوتا تھا۔ شاید اب بھی ہو۔

سرگودھا پہنچنے کے بعد ہم سب نے اس ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اصلی دیسی گھی میں بھنے ہوئے مرغ کا بے حد لذیذ سالن تھا۔ تندور کی گرم گرم اعلیٰ آٹے کی روٹیاں تھیں۔ جن میں سے باداموں کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خوش بوآ رہی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد سردار خان اور دوسرے ڈرائیور حقہ لے کر بیٹھ گئے۔ چلم میں خاص دیسی سوکھا ہوا تمباکو گڑ ڈال کر بھرا ہوا تھا۔ اس کی دھوئیں کی خوش بو مجھے بے حد اچھی لگی۔ ایک دو کش میں نے بھی لگائے لیکن تمباکو بڑا سخت تھا۔ میں نے پاسنگ شو کا سگریٹ نکال کر سلگالیا۔ پاسنگ شو مڈل کلاس کا بڑا شریف اور مدبر اور سفید پوش سگریٹ ہوا کرتا تھا۔ اس کے تمباکو کی خوش بو اور ذائقہ ہی سب سے الگ تھا۔ دوسرے روز میں منہ اندھیرے اٹھ کر ریلوے پھاٹک کی دوسری طرف کھیتوں میں سیر کرنے نکل گیا۔ خوب سردی بڑھ رہی تھی۔ کہیں کہیں کھیتوں میں دھند بھی پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے سرگودھا کے یہ کھیت اور دھند بڑی اچھی لگی۔ میں کھیتوں میں سیر کرتا دور تک چلا گیا۔

آگے باغ اور اونچے اونچے یوکلپٹس اور ٹاہلیوں کے درخت شروع ہوگئے۔ یہ پھل دار باغ تھے۔ شاید مالٹوں کے باغ تھے۔ درختوں کی ٹہنیوں کو ذرا سا ہاتھ لگاتا تو نیچے شبنم کے قطرے ٹپکنے لگتے۔ میں نے چلو میں شبنم بھر کر اپنی آنکھوں سے لگائی۔ اپنے چہرے پر لگائی تو میری آنکھیں اور چہرہ پہلے تو برف کی طرح یخ ہوگیا۔ پھر گرم ہوگیا اور اس میں سے سینک اٹھنے لگا۔ آہ! یہ نیچر کی پارسائی تھی۔ پاکیزگی تھی۔ یہ میرے لیے قدرت کا بے بہا انعام تھا۔ میں ایسے خوش ہوا جیسے مجھے دونوں جہاں کی دولت مل گئی ہو۔ یہ وہ خوشی تھی جو دنیا کی ساری دولت دے کر بھی حاصل نہیں ہوسکتی تھی۔ جو مجھے نیچر کی طرف سے مفت مل رہی تھی۔ واپس آکر میں بڑے کمرے کے باہر نلکے کے نیچے بیٹھ کر نہانے لگا۔ چھپی اٹھتی پی بی ایل 2638 کے ڈرائیور نے اتنی سخت سردی میں مجھے باہر نلکے کے نیچے بیٹھ کر نہاتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگا۔

"خدا کا خوف کرو، اتنی سردی میں نہا رہے ہو، نمونیہ ہوجائے گا۔"

میں سوچنے لگا سخت سردی میں ساری رات گلاب کا پھول شبنم میں شرابور رہتا ہے اسے نمونیہ کیوں نہیں ہوتا؟ کوئی چیز ہے جو اسے زندہ رکھتی ہے۔ بس مجھے اس چیز کی تلاش تھی اور آج بھی اس چیز کی تلاش ہے۔ کپڑے پہننے کے بعد میں نے زمیندارہ ہوٹل میں جا کر ناشتہ کیا اور سردار خان کے پاس چلا گیا۔ سردار خان زمیندارہ ہوٹل کے ایک کمرے میں رہتا تھا جو ہوٹل کے بالکل سامنے والی گلی کی نکڑ پر ایک چوبارہ سا تھا۔ سردار خان نسواری رنگ کے مخمل کے لحاف میں دبکا حقہ پی رہا تھا۔ اس نے مجھے ایک رجسٹر دیتے ہوئے کہا۔

"آج دوپہر کے بعد ہماری لاریاں ائرپورٹ پر بجری ڈھونی شروع کردیں گی۔ میرا خیال ہے شام تک ہر ایک گاڑی چار پانچ چکر ضرور لگائے گی۔ تم ایک تو صبح کو اپنے سامنے لاریوں میں پٹرول ڈلوا کر نوٹ کرلیا کرو کہ کتنا پٹرول ڈالا گیا ہے اور پھر شام کو ہر لاری کے ڈرائیور سے حساب لینا کہ کتنے چکر لگائے ہیں اور کتنا پٹرول خرچ ہوا ہے۔"

اس وقت تو مجھے یہ کام ایک مصیبت معلوم ہوا لیکن بعد میں، میں اس کا عادی ہوگیا اور معلوم ہوا کہ یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں ہے۔ میں رجسٹر لے کر پٹرول پمپ پر کرسی ڈال کر بیٹھ جاتا اور نوٹ کرتا جاتا کہ لاریوں میں کتنا پٹرول ڈالا گیا ہے۔ پھر شام کو ہر ایک ڈرائیور کے پاس جا کر چیک کرتا کہ اس نے کتنے پھیرے لگائے ہیں اور کتنا پٹرول خرچ ہوا ہے۔ سارے ڈرائیور ایک جگہ نہیں رہتے تھے۔ چار ڈرائیور تو میدان والے کمرے میں رہتے تھے۔ باقی ڈرائیور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زمیندارہ ہوٹل کے سامنے والی گلی کے ایک چوبارے پر رہتے تھے۔ یہ چوبارہ کرائے پر لیا گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہر ڈرائیور اپنی طرز کی ایک الگ چیز تھی۔ لاری نمبر پی بی ایل 3512 نئی لاری تھی اور اس کا نوجوان ڈرائیور بھی بڑا شوقین مزاج تھا۔ پتلون کوٹ پہنتا تھا اور ریشمی مفلر گلے میں لپٹا ہوتا تھا۔ بالوں میں خوش بودار تیل لگا کر ماتھے پر بالوں کا ایک چھلا ضرور بنا لیتا تھا۔ چھبی اٹھتی یعنی پی بی ایل 2638 پرانی اور تباہ حال لاری تھی۔

اس کا ڈرائیور بھی بوڑھا اور دبلا پتلا تھا اور کھڑ کھڑ کرتا تھا۔ ایک روز شام کو ساری لاریاں ائر پورٹ پر بجری اور پتھروں کی روڑی پھینک کر آ گئیں مگر چھبی اٹھتی کا نہ ڈرائیور آیا اور نہ اس کی لاری آئی۔ سب کو فکر لگی کہ آدمی بوڑھا اور کمزور ہے۔ گاڑی بھی بوڑھی اور کمزور ہے۔ کہیں کوئی حرج مرج نہ ہو گیا ہو۔ پہلے تو کچھ دیر انتظار کیا مگر جب رات ہو گئی تو سردار خان نے میری ڈیوٹی لگائی کہ (3512 پی بی ایل) کو لے جاؤ اور دیکھو کہ چھبی اٹھتی کو کہیں کوئی حادثہ تو نہیں پیش آ گیا۔

میں نے لاری پکڑی۔ ڈرائیور کو لیا اور رات کے اندھیرے میں دھپ سڑی کی طرف چل پڑا۔ یہ سڑک اگرچہ پکی تھی مگر چھوٹی سی تھی اور دن کے وقت سنسان ہوتی تھی۔ رات کو تو وہاں الو بھی بولتے ہوئے ڈرتا تھا۔ ڈرائیور گاڑی آہستہ چلا رہا تھا اور ہم راستے میں اِدھر اُدھر دیکھتے جا رہے تھے۔ سڑک پر کوئی بتی بھی نہیں تھی۔

رات بڑی تاریک اور سرد تھی۔ بڑی سردی پڑ رہی تھی۔ شاید کہر ابھی پڑ رہا تھا۔ اس زمانے میں موسم بڑے شدید ہوا کرتے تھے اور سرگودھا میں کچھ زیادہ ہی ٹھنڈ پڑتی تھی۔ ہم نے لاری کے شیشے چڑھا رکھے تھے مگر لاری کا پچھلا دروازہ غائب تھا اور بالکل ٹرک کی طرح تھی اور پیچھے سے ہمیں سرد یخ ہوا کے تھپیڑے پڑ رہے تھے۔ دس گیارہ میل ہم سڑک پر نکل گئے۔ دائیں بائیں کیکر اور ٹاہلیوں کے درخت سائیں سائیں کر رہے تھے۔ آخر ایک جگہ ہمیں ایک گاڑی نظر آئی۔ گاڑی پکی سڑک سے اتر کر کچے میں چھوٹی سی نہر یعنی سوئے کے کنارے کھڑی تھی۔ گاڑی پر ہماری لاری کی روشنی پڑی تو ڈرائیور نے کہا۔

"چھبی اٹھتی کھڑی ہے۔"

ہم لاری ایک طرف روک کر گاڑی کے پاس گئے۔ یہ اپنی گاڑی تھی کمزور اور بوڑھا ڈرائیور اگلی سیٹ پر کمبل میں گٹھڑی بن کر سو رہا تھا۔ ہم نے اسے جگایا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا کہنے لگا۔

"گاڑی کی بیلٹ ٹوٹ گئی ہے۔" ہم اپنی لاری میں احتیاط کے طور پر ایک رسا لے گئے تھے۔ دونوں ڈرائیور رسا نکال کر گاڑی کے پیچھے باندھنے لگے۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ میرے خدا! اتنے چمکیلے، موٹے موٹے، نیلے سرخی مائل اور سفید ستارے میں نے زندگی میں شاید کبھی نہیں دیکھے تھے۔

میں نے ڈرائیور کو وہیں چھوڑا اور نہر کے کنارے چلا گیا۔ فضا شفاف تھی۔ جیسے میرے اور ستاروں کے درمیان کوئی شے حائل نہ ہو۔ نہر کے پانی میں ستاروں کا عکس پڑ رہا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کسی نے نہر میں ہیرے جواہرات کا خزانہ لٹا دیا ہو۔

کیکر کی شاخیں اور پتیاں شبنم میں تر بہ تر تھیں۔ میرا جی واپس سرگودھا جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ یہی دل چاہتا تھا کہ اس ہیرے جواہرات والی نہر کے ساتھ ساتھ اوپر کی طرف چلتا چلا جاؤں اور اس فردوس ارضی تک پہنچ جاؤں۔ جہاں جہاں قدرت کا دریا دل

جوہری اس نہر میں ہیرے جواہرات کے انمول خزانے لٹا رہا تھا لیکن پینتیس بارہ کے ڈرائیور نے ہارن دے کر مجھے میرے خواب ارضی سے جگا دیا۔

شبنم میں بھیگی ہوئی، سرد خاموش رات نے آسمان پر ستاروں کے زر و جواہر کا خزانہ کھول رکھا تھا۔ قدرت کے اس حسین منظر سے جدا ہونے کو میرا دل نہیں چاہتا تھا مگر مجھے جدا ہونا پڑا۔ خراب گاڑی پی بی ایل 2638 کو ہم اپنی گاڑی کے پیچھے باندھ کر اڈے پر لے آئے۔

کبھی کبھی مجھے دن کے وقت کسی نہ کسی گاڑی میں بیٹھ کر چیکنگ کے لیے زیر تعمیر ائر پورٹ پر جانا پڑتا تھا۔ ائر پورٹ پر بڑے زور شور سے کام ہو رہا تھا۔ کہیں رن وے پر بجری بچھائی جا رہی تھی۔ کہیں بڑے بڑے ٹرکوں کے ذریعے رن وے پر مسالہ ڈال کر اسے کارپٹ کیا جا رہا تھا۔

مزدوروں میں کہیں کہیں محنت کش دیہاتی خواتین بھی کام کرتی نظر آ جاتیں۔ میں ان عورتوں کی جفاکشی پر بڑا حیران ہوتا تھا کہ یہ کس طرح بجری کی بھری ہوئی ٹوکریاں اٹھا اٹھا کر رن وے پر ڈال رہی ہیں۔ میرے دل میں ان کے لیے بڑے احترام کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔

موسم سردیوں کا تھا۔ ایک دن میں اپنے ایک ڈرائیور کی ٹرک نما گاڑی پر سوار ائر پورٹ سے واپس آ رہا تھا کہ دور سے مجھے سڑک کے کنارے پر پھاہی کے درختوں کے نیچے ایک اونٹ بیٹھا نظر آیا۔ اس کے اوپر سوکھی لکڑیوں کا تنکڑ لدا ہوا تھا۔ ہمارا ٹرک معمول کی رفتار سے سڑک پر جا رہا تھا کہ اونٹ پر ڈرائیور کی نظر پڑ گئی۔ اس نے گاڑی کی اسپیڈ کم کی اور اسے پکی سڑک سے اتار کر لے آیا اور گاڑی اونٹ سے ذرا قریب کھڑی کر دی میں نے پوچھا۔

"گاڑی یہاں کس لیے کھڑی کی؟"

اس گاڑی کا ڈرائیور بڑا خاموش طبع تھا اور بڑی مسکین طبیعت والا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ گاڑی سے اتر کر دائیں بائیں دیکھا۔ اونٹ کا مالک کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ڈرائیور نے کلینر سے کہا۔

"ادھر آ کر تنکڑ کو ذرا ہاتھ ڈالو۔"

اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اونٹ کے اوپر سے سوکھی لکڑیوں کا تنکڑ اٹھایا اور گاڑی کے پیچھے رکھ دیا۔ اس کے بعد ڈرائیور اپنی سیٹ پر آ گیا اور گاڑی کو کچے سے نکال کر پکی سڑک پر لایا اور گاڑی دوبارہ اپنی معمول کی رفتار سے چل پڑی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"تم نے غریب اونٹ والے کی لکڑیاں چرالی ہیں یہ اچھا نہیں کیا۔"

ڈرائیور نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور سامنے دیکھتے ہوئے گاڑی چلاتا رہا۔

اس سے ملتا جلتا ایک اور واقعہ ہماری لاریوں کے اڈے پر ہوا۔ ریلوے پھاٹک کے پاس جس چھوٹے سے میدان میں ہماری لاریاں کھڑی ہوتی تھیں وہاں ایک کافی بڑی کوٹھڑی میں چار پانچ ڈرائیور رات کو سوتے تھے۔ کھانا وغیرہ بھی وہ وہیں پکاتے تھے۔

اس روز ڈرائیور کی پھیرے لگانے کی ڈیوٹی نہیں تھی۔ وہ کوٹھڑی میں ہی تھے۔ دونوں ڈرائیور ایک دن پہلے پھیرے لگا چکے تھے۔ دن کے دس ساڑھے دس کا وقت ہوگا۔ میں رجسٹر ہاتھ میں لیے ان کے ڈیرے پر پٹرول کا حساب لینے گیا تو ایک ڈرائیور باہر دھوپ میں چارپائی پر بکل مارے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔

میں اس کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس ڈرائیور کا نام کچھ اور تھا۔ سب لوگ اسے تھیلا کہہ کر بلاتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھے۔ تھیلے نے مجھے اپنی گاڑی کے پٹرول کا حساب لکھوایا اور سامنے ریلوے لائن کی طرف دیکھتے ہوئے سگریٹ کے کش لگانے لگا۔

اتنے میں ریل کی پٹڑی پر سے ایک بکری نیچے اتر کر جھاڑیوں میں ادھر ادھر منہ مارنے لگی۔ پھر وہ چلتی چلتی ہماری چارپائی کے قریب آ گئی۔ تھیلے کو نہ جانے کیا سوجھی اس نے چادر اتار دی اور اپنے کلینر کو آواز دی جو کوٹھڑی میں تھا۔

"پھوکے۔ باہر آؤ جلدی۔"

میرے دیکھتے ہی دیکھتے ڈرائیور چارپائی سے اترا۔ بکری چارپائی کی پائنتی کی طرف آ گئی تھی۔ ڈرائیور نے ایک دم سے بکری کو گردن سے دبوچا اور گھسیٹتا ہوا کوٹھڑی کی طرف لے گیا۔ اس کا کلینر بھی باہر آ گیا۔ تھیلے ڈرائیور نے کلینر سے کہا۔

"اسے پیچھے سے اٹھاؤ۔"

اور وہ بکری کو ڈنڈا ڈولی کر کے کوٹھڑی کے اندر لے گئے مجھے معلوم تھا کہ ڈرائیور اس قسم کی حرکتیں کرتے ہی رہتے تھے۔ میں چارپائی پر ہی دھوپ میں بیٹھا رہا۔ کوٹھڑی میں سے بکری کے بلبلانے کی دل دوز آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی آواز بند ہو گئی۔ جیسے کسی نے بکری کا منہ بند کر دیا ہو۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد ڈرائیور تھیلا صاحب بڑے اطمینان سے کوٹھڑی سے نکلے اور میرے پاس چارپائی پر آ کر بیٹھ گئے۔

میں نے اس سے کوئی سوال نہ کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس نے کیا کیا ہے۔ اس سے کچھ پوچھنا بے کار تھا۔ اتنے میں ریلوے کی طرف سے ایک بکر دان چھڑی ہاتھ میں پکڑے بکری کی تلاش میں اس طرف آ گیا۔ اس نے ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے دیکھا تو پوچھا۔

"میری بکری تو ادھر نہیں آئی۔"

"ڈرائیور تھیلے نے بڑا معصوم سا منہ بنا کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہم نے تو ادھر کوئی بکری نہیں دیکھی۔"

بے چارا بکری دان مایوس سا چہرہ لے کر واپس چلا گیا۔ جیسے ہی وہ ریل کی پٹڑی کی دوسری جانب نگاہوں سے اوجھل ہوا ڈرائیور تھیلا ایک دم سے اٹھا اور بولا۔

"یا میرے مولا۔"

یہ کہہ کر وہ کوٹھڑی میں گھس گیا۔ اس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ میں دھوپ میں وہیں بیٹھا رہا۔ چند لمحوں کے بعد مجھے بکری کے ممیانے کی ایسی بھیانک آواز سنائی دی کہ میں اپنی جگہ کانپ گیا۔ جلدی سے اٹھ کر کوٹھڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے کلینر نے پوچھا۔ "کون ہو؟"

میں نے کہا۔ "میں ہوں۔"

اس نے دروازہ کھول دیا۔ اندر جو میں نے منظر دیکھا وہ یہ تھا کہ ڈرائیور تھیلے نے بکری کو کھرے کے فرش پر گرایا ہوا تھا اور اس کی گردن پر چھری پھیر رہا تھا۔ کلینر نے جلدی سے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ تھیلے ڈرائیور نے کلینر سے کہا۔

"پانی ڈالو اوئے پانی ڈالو اس کی گردن پر۔"

کلینر لوٹا اٹھا کر ذبح شدہ بکری کی گردن پر پانی ڈالنے لگا۔ لال لال خون کھرے میں پھیلا ہوا تھا۔ کوٹھڑی میں جو دوسرا ڈرائیور تھا وہ اپنی چارپائی پر لحاف اوڑھے بیٹھا تھا۔ کہنے لگا۔

"تھیلے سب سے پہلے مسجد کے مولوی صاحب کو گوشت بھیج کر ختم پڑھوا لینا۔"

تھیلے نے جواب دیا۔

"مولوی صاحب کا حق سب سے پہلے ہے۔"

دوسری جنگ عظیم بس ختم ہی ہونے والی تھی چنانچہ ہم سرگودھا کے اس زیر تعمیر ائر پورٹ کو ادھورا چھوڑ کر لاریاں لے کر امرتسر واپس آ گئے تھے کیونکہ ہمارے وہاں ہوتے ہوئے ہی جنگ ختم ہو گئی تھی۔ انگریز کا زمانہ تھا۔ شراب کھلے عام تھی مگر حیرت کی بات ہے کہ ان ڈرائیوروں میں سے کوئی بھی شراب نہیں پیتا تھا۔ دو تین ڈرائیور چرس ضرور پیتے تھے۔ کبھی کبھی میں رات کو سخت سردی میں اڈے والی کوٹھڑی میں پھیروں کا حساب نوٹ کرنے جاتا تو کوٹھڑی کا دروازہ بند ہوتا اور کوٹھڑی کے اندر چرس کی انتہائی ناگوار بو پھیلی ہوتی تھی۔

میں جلدی جلدی پھیرے نوٹ کر کے باہر نکل آتا تھا۔ ایک اونچا لمبا دبلا پتلا ڈرائیور اردو پڑھنا لکھنا جانتا تھا۔ اس کو جاسوسی ناول اور رسالے پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ مجھے یاد ہے ایک رات میں کوٹھڑی میں پھیرے نوٹ کرنے گیا تو وہ دہکتے ہوئے کوئلوں کی انگیٹھی چارپائی کے قریب رکھے لالٹین کی روشنی میں بڑے انہماک سے کوئی رسالہ پڑھ رہا تھا۔ میں اس کی چارپائی پر بیٹھ گیا اور رجسٹر پر اس کے پھیروں کا حساب لکھا اور پوچھا۔

"یہ کون سا رسالہ پڑھ رہے ہو؟"

ڈرائیور بولا۔

"عالمگیر رسالہ ہے اس میں ایک انگریزی کہانی کا ترجمہ پڑھ رہا ہوں۔ یہ ایک انجن ڈرائیور کی کہانی ہے جو صبح صبح ٹرین لے کر دوسرے شہر جاتا ہے اور جب ٹرین اس کے کوارٹروں کے سامنے سے گزرتی ہے تو تین بار وسل دیتا ہے۔ جس کو سن کر اس کے بچے مکان سے نکل کر دوڑتے ہوئے ٹرین کی طرف جاتے ہیں اور دور کھڑے اپنے بابا کو ہاتھ ہلاتے ہیں۔"

میں نے ابھی کہانیاں افسانے لکھنے شروع نہیں کیے تھے لیکن کہانیاں پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ خاص کر انگریزی کہانیوں کے ترجمے ضرور پڑھتا تھا۔ مجھے ڈرائیور کا بیان کیا ہوا منظر بڑا اچھا لگا۔ ریل گاڑیاں دیکھنے کا ویسے بھی مجھے بڑا شوق تھا۔ کھیتوں کے درمیان سے چھک چھک کرتی گزرتی ریل گاڑی مجھ پر ایک طلسم سا طاری کر دیتی تھی اور میں اسے دیکھتا رہ جاتا تھا۔

ریل گاڑی میں مجھے ایک رومانس کی کیفیت ملتی تھی۔ یہ سارا رومان کوئلے سے چلنے والے دیو پیکر انجن کی سیٹی کی آواز اور اس کی ہیبت ناک گڑگڑاہٹ میں تھا۔ جب یہ انجن سینہ تانے دھواں اڑاتا وسل پر وسل دیتا شاہانہ دبدبے کے ساتھ زمین کے سینے کو دہلاتا سامنے سے آ کر گزر جاتا تو دل پر قدرت کی ہیبت اور جلال سا طاری ہو جاتا۔ اب ڈیزل کے بد شکل بھدے انجنوں میں وہ بات وہ رومانس کہاں۔

اب ریلوے انجن ایسے گزر جاتا ہے جیسے کوئی بہت بڑی مشین گزر گئی ہو۔ وہ رومانس ختم ہو گیا۔ اس زمانے میں ریل گاڑی کی ایک اپنی ثقافت تھی۔ ایک اپنا کلچر تھا۔ اس کلچر میں مختلف آوازیں، منظر اور خوش بوئیں شامل تھیں۔ گارڈ کی سیٹی کی آوازیں، ریل گاڑی کے دوڑتے ہوئے پہیوں کے ریل کی پٹڑی سے ٹکرانے کی آوازیں۔ پلیٹ فارم پر پھیری لگانے والوں کی چائے گرم، چائے گرم کی آوازیں۔ مسافروں کا شور، ڈبوں کے اندر تازہ پھرے ہوئے رنگ روغن کی خوش بوئیں۔ دھواں اڑاتے دہکتے پتھر کے کوئلوں کی خوش بوئیں، پلیٹ فارم پر چائے، سگریٹ کے دھوئیں اور پان کی لطیف خوش بوئیں اور پھر ان سب خوش بوؤں اور آوازوں میں ہر اسٹیشن کے شہر کی اپنی خوش بوئیں، اپنی آوازیں، ڈیزل انجنوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے ریل گاڑیوں کے کلچر اور ثقافت کی ساری لطافتیں ختم کر دی ہیں۔ اب ریلوے اسٹیشن پر جا کر دیکھو تو محسوس ہوتا ہے کہ جیسے شہر میں غدر مچ گیا ہے اور لوگ افراتفری کے عالم میں شہر چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔

ہمارے سرگودھا والے لاریوں کے اڈے کے ریلوے لائن پر سے کوئی گاڑی گزرتی تو میں اسے بڑے شوق سے دیکھتا۔ اگر میں ڈرائیور کی کوٹھڑی میں بیٹھا ہوتا تو ریل گاڑی کے انجن کی آواز سن کر فوراً باہر آ جاتا۔ انگریزوں کا زمانہ تھا۔ ریل گاڑی کے ڈبوں کے رنگ سرخ ہوا کرتے تھے۔ صرف فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے ڈبوں کے رنگ سبز ہوتے تھے۔ جو گاڑی پشاور سے کلکتے جاتی تھی اور جس کا نام ہوڑہ ایکسپریس تھا وہ ساری کی ساری سبز رنگ کی ہوتی تھی۔ یہ گاڑی اتنی تیز چلتی تھی کہ جب یہ پوری رفتار سے جا رہی ہوتی تھی تو کھڑکی سے منہ باہر نکال کر سامنے کی جانب دیکھا نہیں جاتا تھا۔

یہ بات بڑی مشہور تھی کہ ہوڑہ ایکسپریس دلی سے آگے جا کر طوفان میل بن جاتی ہے۔ شاید اسی گاڑی یا پھر فرنٹیئر میل کو طوفان میل بھی کہا جاتا تھا۔ اس زمانے میں بلکہ ہمارے بچپن کے زمانے میں طوفان میل نام کی ایک فلم بھی آئی تھی۔ یہ فلم بمبئی کی رنجیت موویٹون کی بنی ہوئی تھی اور اس میں اس زمانے کی اسٹنٹ فلموں کے مشہور اداکاروں مثلاً ای بلیموریا' ایشور لعل' ڈکشٹ' چارلی' غوری' کسیر' مادھوری اور خاتون نے کام کیا تھا۔ اس کا ایک سین بے حد مشہور ہوا تھا۔ یہ سین بہت بڑے بورڈ پر پبلسٹی کے لیے بھی اور فلم کے اشتہاروں پر بھی بنایا گیا تھا۔

اس سین میں فلم کے ہیرو کو ریلوے انجن کے آگے چھجے پر جھکے نیچے ریل کی پٹڑی پر پڑے ہوئے ایک بچے کو اٹھاتے دکھایا گیا تھا۔ فلم میں جب یہ سین آتا تھا تو ہال میں سناٹا چھا جاتا تھا اور جب ہیرو چلتے انجن کے چھجے سے جھک کر ریلوے پٹڑی پر سے لڑکے کو اوپر اٹھا لیتا تو ہال تالیوں سے گونج اٹھتا تھا۔ یہ سین اس فلم کی ہائی لائٹ تھا۔ یہ فلم کئی ہفتے چلی تھی۔ اس سین کے بعد میں بلکہ اب تک فلموں میں نقل اتاری جاتی ہے۔ اس زمانے کے سرگودھا شہر میں بھی ایک سینما ہاؤس تھا یہ سینما ہاؤس بڑی شکستہ حالت میں تھا۔

شاید یہ پہلے تھیٹر ہوا کرتا تھا۔ اس کی چھت بڑی اونچی تھی اور اس کی چھت میں کبوتروں نے گھونسلے بنائے ہوئے تھے۔ چلتی فلم کے دوران کبوتروں کی غٹرغوں کی آوازیں آتی رہتی تھیں اور تماشائیوں پر اوپر سے کبوتروں کی بیٹیں بھی گرتی رہتی تھیں۔ ان دنوں اس سینما ہاؤس میں ''بھگت کبیر'' نام کی فلم لگی ہوئی تھی جس میں مظہر خان اور بھارت بھوشن نے کام کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ بھارت بھوشن کی پہلی فلم تھی۔ وہ بھگت کبیر بنا ہوا تھا۔ اس فلم کے بعض سین آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔

☆☆.....☆.....☆☆

اس زمانے میں ابھی میں نے بھگت کبیر کو نہیں پڑھا تھا۔ کئی سالوں کے بعد جب میں نے کہانیاں افسانے اور ناول لکھ کر نام پیدا کر لیا تھا تو صوفی شاعروں کا مطالعہ کرتے ہوئے بھگت کبیر کو بھی پڑھا۔ یہ شخص خدا کی وحدانیت کو ماننے والا اور خدا سے محبت کرنے والا شاعر تھا۔ بنارس کا رہنے والا تھا۔ کبیر کی پیدائش کے بارے میں ایک روایت بڑی مشہور ہے کہ بنارس کا ایک مسلمان جولاہا نیرو نامی اپنی بیوی نیما کے ساتھ جا رہا تھا کہ اس نے تالاب کے کنارے ایک بچہ پڑا دیکھا۔ مسلمان جولاہا یہ بچہ اٹھا کر گھر لے آیا اور اس کی پرورش کرنے لگا۔ اس

نے بچے کا نام کبیر رکھا۔ بڑے ہو کر کبیر فقیر بن گئے۔ گھر میں بیٹھ کر کپڑا بنتے اور پھر بازار لے جا کر بیچ آتے۔ دو چار آنے جو محنت کا معاوضہ ملتا اس میں سے بہت کم اپنے پاس رکھتے اور باقی فقیروں میں بانٹ دیتے۔ کبیر ایک خدا کے ماننے والے تھے اور بت پرستی کے سخت خلاف تھے۔ کبیر کا کلام ظاہر کرتا ہے کہ ان کے دل و دماغ پر اسلام کا گہرا اثر تھا۔ کبیر صاحب کا مزار مگھر ریلوے اسٹیشن کے قریب آدھ میل پر ہے۔ راستا صاف نہیں ہے۔ مزار ایک پختہ چار دیواری میں ہے۔ اس کے دو دروازے ہیں۔ احاطہ کے اندر چند مکان شاگرد پیشوں کے بنے ہوئے ہیں جو اب غیر آباد ہیں۔ مزار پر املی کے دو درختوں نے سایہ کر رکھا ہے۔ 28 ربیع الثانی کو عرس ہوتا ہے۔

یہ پاکستان کے قیام سے پہلے کا زمانہ تھا۔ ابھی ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی۔ سرگودھا میں ہندو اور سکھ بھی رہتے تھے مگر زیادہ آبادی مسلمانوں کی تھی۔ غیر مسلم بہت کم تھے۔ ان دنوں سرگودھا بڑا پر سکون تھا۔ آبادی زیادہ نہیں تھی۔ ہم سردیوں کے موسم میں وہاں گئے تھے۔ بڑی سخت سردی پڑتی تھی۔ چیزوں میں ابھی ملاوٹ شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہر شے میں سے اس کی اصلی خوش بو آتی تھی۔ ابھی ایسنس کا بھی رواج نہیں چلا تھا۔ ملاوٹ سے تو جہاں تک میرا خیال ہے لوگ ناواقف تھے۔ سرگودھا کے کچہری بازار (غالباً یہی نام تھا بازار کا) کے زمیندارہ ہوٹل میں دوپہر کے وقت دیسی گھی کے تڑکا لگانے کی خوش بوئیں اڑا کرتی تھیں۔ آج کل تو یہ خوشبو اجنبی لگتی ہے۔ اس زمانے میں یہ خوش بوئیں عام تھیں۔ میں اور دو ایک خوش لباس ڈرائیور اپنے منیجر سردار خان کے ساتھ اس ہوٹل میں کھانا کھایا کرتے تھے۔ کھانے کے بعد جب پٹھان چائے پکتی تھی تو اس کی خوش بو مجھے اڑا کر بنگال اور سری لنکا کے چائے کے باغات میں لے جاتی تھی۔ ایک لاری کا مالک خود ڈرائیور بن کر ساتھ آیا تھا۔ وہ بڑے صاف ستھرے کپڑے پہنتا تھا اور کریون اے کے سگریٹ پیتا تھا۔ کریون اے کے سگریٹ اس زمانے میں سب سے مہنگے سگریٹوں میں شمار ہوتے تھے۔ اسے کالی بلی والی ڈبی بھی کہتے تھے۔ ہر سگریٹ کا ذائقہ اور فلیور الگ ہوتا تھا۔ تمباکو خالص ہوتا تھا۔ اس میں کسی قسم کی ملاوٹ نہیں ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ دو پیسے والی سب سے سستی تارکی ڈبی کی سگریٹوں میں بھی خالص تمباکو ہوتا تھا۔ اگرچہ وہ گھٹیا تمباکو ہوتا تھا یعنی تمباکو کی جڑیں اور مڈھ کوٹ کر بھرے ہوتے تھے۔

سرگودھا سے امرتسر اور امرتسر سے سرگودھا ریل گاڑی میں جاتے ہوئے چنیوٹ سے آگے سرخ رنگ کی پہاڑیاں مجھے بہت پسند تھیں اور پھر جب گاڑی دریائے چناب کے دونوں عالی شان پلوں پر سے گزرتی تو میں کبھی نیچے دریا کو دیکھتا اور کبھی اردگرد کے پہاڑی سلسلے کو دیکھتا۔ خشک پہاڑیاں تھیں مگر ان میں ایک عجیب شان جبروت و ہیبت تھی۔ بے آب و گیاہ اتنی خوب صورت پہاڑیاں میں نے کبھی نہیں دیکھی تھیں اور ان پہاڑیوں کے درمیان بلندی پر تعمیر کیے گئے دونوں ریلوے پل تو انجینئرنگ کا حیرت انگیز نمونہ ہیں۔ اس علاقے کے لوگ بھی خوش اخلاق' تنومند اور بہادر لوگ ہیں اور کمال کے ہنرمند ہیں۔ چنیوٹ کے لوگوں کی ہنرمندی اور صناعی کی تو ایک دنیا گواہ ہے۔ یہاں کے تاجروں کا کاروبار جنوبی ایشیا کے کئی ممالک میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ بڑے مخیر اور خوش حال اور دین دار لوگ ہیں اور چنیوٹ شہر کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عمارتیں تو عجوبہ روزگار ہیں۔

دوسری عالمگیر جنگ ختم ہوگئی اور سرگودھا کے ہوائی اڈے کا کام وہیں رک گیا۔ انگریزوں کو اب اس ہوائی اڈے کی ضرورت نہیں تھی چنانچہ ہم بھی اپنی تیرہ لاریاں لے کر امرتسر واپس آ گئے۔ میرے دن ایک بار پھر کمپنی باغ اور بڑی نہر کی آوارہ گردیوں میں گزرنے لگے۔ عشق کا بخار پھر تیز ہونے لگا۔ سینما کی تھرڈ کلاس کا ٹکٹ دو آنے کا ہوتا تھا۔ روز کبھی امرت ٹاکیز اور کبھی رائل ٹاکیز اور کبھی پرل ٹاکیز میں ایک فلم دیکھتا۔ کوشش کرتا کہ والد صاحب کی نظروں سے دور رہوں لیکن انہیں میری آوارہ گردیوں اور عشق و محبت کا علم ہوگیا۔ چنانچہ انہوں نے کوچوانوں والا سانٹا پکڑ لیا جو انہوں نے خاص طور پر میرے اور میرے چھوٹے آرٹسٹ بھائی کے لیے بنوایا تھا۔

ایک دن میں امرت ٹاکیز میں واڈیا موی ٹون کی فلم ''ہنٹر والی'' کا میٹنی شو دیکھ کر گھر آیا تو والد صاحب نے سانٹا پکڑ لیا اور مجھے مارا۔ میں نے اسی وقت ایک بار پھر گھر سے بھاگنے کا فیصلہ کرلیا۔ امرتسر میں ظہور الحسن ڈار میرا دوست ہوا کرتا تھا۔ اس کے مضامین اور کہانیاں ''عالمگیر'' رسالے میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ اس کا مکان ہمارے ساتھ والے محلے میں تھا۔ اسے دنیاوی معاملات کی بڑی سمجھ تھی۔ بڑا ذہین اور عزم و ہمت والا نوجوان تھا۔ مجھ سے عمر میں دو چار سال بڑا تھا۔ ہماری بڑی دوستی تھی۔ ہم ایک دوسرے کے گھر آیا جایا کرتے تھے۔ اس کی بڑی آرزو تھی کہ وہ بمبئی جا کر فلموں کی کہانیاں لکھے۔ میں نے جب گھر سے بھاگنے کا ارادہ کیا تو قرعہ فال ایک بار پھر بمبئی شہر ہی کا نکلا۔ میں نے ڈار سے کہا۔

''میں تو گھر سے بھاگ کر بمبئی جا رہا ہوں۔''

ڈار نے بڑی سنجیدہ نظروں سے مجھے دیکھا اور بڑی متانت سے پوچھا۔

''وہاں جا کر کیا کرو گے؟''

میں نے یونہی کہہ دیا

''میں فلموں میں کام کروں گا۔''

ڈار نے ماہرانہ انداز میں میری ٹھوڑی کو ہاتھ سے اوپر نیچے کر کے میرے چہرے کا جائزہ لیا اور بولا۔

''چہرہ تو تمہارا ٹھیک ہے تم فلموں میں کام کر سکتے ہو۔''

وہ خود فلموں میں کہانی لکھنے کے لیے بمبئی جانے کے لیے پر تول رہا تھا۔ کہنے لگا۔

''تو پھر میں بھی قسمت آزمائی تمہارے ساتھ ہی بمبئی چلوں گا۔''

ان دنوں وہ نارتھ ویسٹرن ریلوے کے لاہور ہیڈ کوارٹر میں ملازم تھا اور ہر روز صبح بابو ٹرین میں جسے سبر یر ٹرین بھی کہتے تھے امرتسر سے لاہور جاتا اور شام کو اسی ٹرین میں واپس آ جاتا تھا۔ ہم دونوں نے گھر سے بھاگ کر بمبئی جانے کا پروگرام طے کرلیا۔ کچھ پیسے میں نے اپنی والدہ اور بہنوں سے لے جمع کر رکھے تھے۔ ڈار نے بھی کچھ رقم اپنے پاس رکھ لی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ریلوے کی نوکری چھوڑ کر میرے ساتھ بمبئی جائے گا لیکن وہ بڑا دنیا دار اور سمجھ دار لڑکا تھا۔ اس نے دفتر سے ایک ماہ کی چھٹی لے لی اور مجھے بالکل نہیں بتایا۔ بھاگنے کا ایک دن مقرر ہوگیا۔ ہمیں صبح کی گاڑی پکڑنی تھی۔ اب یاد نہیں دن کے وقت بمبئی جانے والی کون سی گاڑی لاہور سے آتی تھی۔ ہم دن کے آٹھ سوا آٹھ بجے الگ الگ راستوں سے امرتسر کے ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔ سولہ سترہ روپے کا بمبئی کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ آتا تھا۔ ہم نے ٹکٹ خریدے اور پلیٹ فارم پر آ کر ٹرین کا انتظار کرنے لگے۔ ہم دونوں کے پاس ایک ایک چھوٹا سا اٹیچی تھا

جس میں ہمارا ایک ایک جوڑا کپڑوں کا اور ٹوتھ پیسٹ وغیرہ تھے۔

مجھے والد صاحب کے جاسوسوں کا ڈر لگا تھا کہ ان میں سے کسی نے مجھے دیکھ لیا تو سارا کام خراب ہوجائے گا لیکن ٹرین آ گئی اور ہم ایک ڈبے میں جا کر بیٹھ گئے۔ جب تک ٹرین کھڑی رہی میرے دل کو دھڑکا لگا رہا۔ آخر ٹرین چل پڑی۔ جب ٹرین شریف پورے سے بھی آگے نکل گی تب مجھے اطمینان ہوا کہ اب میں آزاد ہوں۔ بمبئی میں ظہور کا کوئی جاننے والا تھا جو ہفتہ وار فلمی رسالہ نکالتا تھا۔ ہم بمبئی میں اس کے پاس جا کر ٹھہر گئے۔ کچھ روپے ہمارے پاس تھے چنانچہ ہم ناشتہ اور کھانا وغیرہ ایرانی ہوٹل میں کھاتے تھے۔ ہمارے میزبان کی فلم انڈسٹری میں کافی واقفیت تھی۔ اس کے ساتھ ہم اس زمانے کے دو چار فلم ڈائریکٹروں سے بھی ملے مگر کہیں فوری طور پر کام نہ مل سکا۔ سب یہی کہتے۔

''آتے جاتے رہیں کام مل جائے گا۔'' اتنی دیر ہم بمبئی ایسے شہر میں کسی کے مہمان بن کر رہ نہیں سکتے تھے۔ ہمارے پیسے بھی ختم ہوگئے۔ میزبان نے بھی ہمیں کہہ دیا کہ آپ لوگ واپس ہی چلے جائیں۔ اس وقت یہاں کام ملنا مشکل ہے۔ ظہور کے پاس واپسی کا کرایہ تھا میرے پاس نہیں تھا۔ میں نے بمبئی کے سیر سپاٹوں اور فلمیں دیکھ کر سارے پیسے ختم کر دیے تھے۔ ایک رات ہم بمبئی کے بوری بندر کے اسٹیشن سے ٹرین میں سوار ہوگئے۔ ظہور کے پاس ٹکٹ تھا۔ میرے پاس نہیں تھا۔ میں بغیر ٹکٹ بیٹھ گیا تھا اور مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔ بغیر ٹکٹ سفر کرنے کی مجھے عادت تھی۔ لیکن یہ لمبا سفر تھا راستے میں شاید جھانسی یا ہوشنگ آباد اسٹیشن پر ایک ٹی ٹی ٹکٹ چیک کرنے ہمارے ڈبے میں آ گیا۔ مجھ سے ٹکٹ مانگا تو میں نے کہا۔ میری جیب کٹ گئی تھی اس لیے بغیر ٹکٹ بیٹھ گیا ہوں۔ ٹکٹ چیکر نے مجھے بڑے آرام سے ٹرین سے نیچے اتار دیا کہ میں تمہیں یہی سزا دے سکتا ہوں۔ ٹرین آگے نکل گئی اور میں اجنبی اسٹیشن پر اکیلا کھڑا ٹرین کو نظروں سے دور ہوتے دیکھتا رہا۔

بمبئی سے ٹرین رات کے سوا نو بجے کے قریب چلی تھی اور جس وقت ٹی ٹی نے مجھے ہوشنگ آباد (شاید یہی نام تھا اسٹیشن کا) کے اسٹیشن پر اتار دیا تو ٹرین کے پلیٹ فارم خالی کر دینے کے بعد میں نے اسٹیشن کی گھڑی پر وقت دیکھا تو رات کے تین بجنے والے تھے۔ میری عمر اس وقت کتنی ہوگی؟ اس کا اندازہ آپ اس سے لگالیں کہ میٹرک کی جماعت سے بھاگا تھا۔ میرا جو چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا جس میں کپڑوں کا ایک جوڑا وغیرہ تھا وہ بھی اپنے ساتھ نہیں لا سکا تھا۔ خیر اس کی مجھے پروا نہیں تھی۔ مجھے اس کی بھی کچھ زیادہ فکر نہیں تھی کہ رات کے تین بجے اپنے شہر امرتسر سے سیکڑوں میل دور ایک اجنبی شہر کے اسٹیشن پر اکیلا ہوں۔ پیسہ دھیلا بھی پاس نہیں ہے کیا کروں گا' کہاں سے کھاؤں گا؟ وغیرہ وغیرہ۔ میرا جواہیڈ وانچر اور خانہ بدوشی کا شوق تھا وہ مجھے پر لگا کر اڑاتا پھرا تھا۔ میں نے یقین کریں اس زمانے میں گھر سے بھاگنے کے بعد ایک لمحے کے لیے بھی کبھی نہیں سوچا تھا کہ جہاں جا رہا ہوں وہاں رہوں گا کہاں؟ وہاں سوؤں گا کہاں؟ کھاؤں گا کہاں؟ میرے جذبے بے اختیار کو دیکھ کر قدرت ہی میرا کچھ خیال کر رہی تھی اور جہاں بھی میں جاتا تھا وہاں میرا کچھ نہ کچھ بندوبست ہوجاتا تھا اور کہیں رات کو سونے کی جگہ نہیں ملتی تھی تو میں بے دھڑک کسی فٹ پاتھ پر ہی لیٹ کر سو جاتا تھا۔ خدا کی قسم فٹ پاتھ پر کم از کم اس زمانے میں ایسی گہری نیند آتی تھی کہ صبح سڑکیں دھونے والے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹرک کے پانی کی بوچھاڑ ہی مجھے جگاتی تھی۔

بس یہی شوق تھا کہ جنگل دیکھوں، جنگلوں کی بارشیں دیکھوں۔ بارشوں میں بھیگتے درخت دیکھوں۔ نئے نئے شہروں کے لوگ دیکھوں۔ ان شہروں کی گلیاں بازار دیکھوں۔ وہاں کا میوزک سنوں؟ یہ دیکھوں کہ ان شہروں میں جب سورج طلوع ہوتا ہے تو آسمان کا رنگ کیسا ہوتا ہے۔ شام کی ہوا کس طرف کو چلتی ہے۔ دریاؤں میں کشتیاں چلانے والے مانجھی کون سے گیت گاتے ہیں۔ ان کے دردناک گیتوں کا درد کہاں سے آتا ہے۔ وہاں کے دریا کیسے ہوتے ہیں۔ ندیاں کون سے جنگلوں سے کون سے دریاؤں سے نکل کر بل کھاتی ہوئی بہتی ہیں اور سمندروں سے آنے والی ہواؤں میں ناریل کے درخت کیسے لہراتے ہیں۔ ناریل کا درخت تو ہمارے پنجاب کے میدانی اور پہاڑی علاقوں میں کہیں بھی نظر نہیں آیا تھا۔ امرتسر کے کمپنی باغ میں بھی اس کا کوئی درخت نہیں تھا۔ یہ درخت جنوب مشرقی ایشیا کا بیٹا ہے اور یہ اسی زمین میں پروان چڑھتا ہے۔ یہ درخت میں نے رسالوں اور کتابوں کی تصویروں میں ہی دیکھے تھے۔ میں انہیں قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔ ان سے ہاتھ ملانا چاہتا تھا۔ ان سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ بس یہی شوق آوارگی تھا۔ یہی میرا اجذبہ بے اختیار تھا۔

رات کے تین بجے بغیر ٹکٹ کے میں ہوشنگ آباد کے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ایک بنچ پر بیٹھ گیا تھا۔ اس وقت میں صرف امرتسر پہنچنا چاہتا تھا تاکہ ایک بار پھر تازہ دم ہو کر بمبئی شہر پر اپنے ایڈونچر کا حملہ کر سکوں لیکن جس گاڑی کو مجھے امرتسر لے کر جانا تھا وہ نکل چکی تھی اور اس وقت اگر کوئی ٹی ٹی مجھ سے آ کر ٹکٹ طلب کرتا تو دوسرے لمحے میں اسٹیشن سے باہر ہوتا۔ اب میں اسی انتظار میں تھا کہ دلی کی طرف جانے والی کوئی ریل گاڑی بمبئی کی طرف سے آئے تو میں اس میں بیٹھ کر کم از کم دلی کی طرف تو نکل جاؤں۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ اس گاڑی میں بھی ٹی ٹی آ کر مجھے نیچے اتار دے۔

میں نے کرتا پاجامہ اور چمڑے کے بوٹ پہن رکھے تھے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ اس علاقے میں بارشیں شروع ہو گئی تھیں۔ بارش نہ بھی ہو تو آسمان پر بادل چھائے رہتے تھے۔ کبھی حبس ہو جاتا تھا اور کبھی ہوا چلنے لگتی تھی۔ اس وقت بھی اسٹیشن پر خوش گوار ہوا چل رہی تھی۔ میں بنچ پر بیٹھا ریلوے لائن کی اس جانب دیکھ رہا تھا جدھر بمبئی شہر تھا۔ ایک قلی میرے قریب سے گزرا۔ میں نے اس سے دلی جانے والی گاڑی کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ دلی کی طرف جانے والی گاڑی آدھے گھنٹے میں آئے گی۔ میں مطمئن ہو گیا کہ یہاں رات نہیں گزارنی پڑے گی۔ بیٹھے بیٹھے مجھ پر غنودگی سی طاری ہو گئی اور میں واقعی بنچ پر سر پیچھے لگا کر سو گیا۔ ایک بڑے زبردست شور نے مجھے جگا دیا۔ کوئی ٹرین پلیٹ فارم میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کا دیوہیکل انجن زبردست شور مچا رہا تھا۔ میں نے سوتی جاگتی حالت میں ایک آدمی سے پوچھا کہ یہ گاڑی دلی جائے گی؟ اس نے جواب دیا۔

"ہاں! اسی طرف جائے گی۔"

میں نے اس کے جملے پر غور نہ کیا کہ یہ گاڑی دلی نہیں بلکہ دلی کی طرف جا رہی تھی۔ مجھ پر اس وقت نیند کا غلبہ تھا۔ چاہتا تھا کہ کسی طرح ٹرین کے کسی ڈبے میں گھس کر سو جاؤں۔ چنانچہ ٹرین کھڑی ہوئی تو میں جو ڈبہ سامنے آیا اس میں گھس گیا۔ مسافر سو رہے تھے۔ دو ایک مسافر جاگ رہے تھے۔ کسی سیٹ پر کوئی جگہ نہیں تھی۔ میں ڈبے کے فرش پر ہی ایک طرف ہو

کر بیٹھ گیا اور سر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ میری دونوں جانب مسافروں کے ٹرنک اور گٹھڑیاں وغیرہ پڑی تھیں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور مجھ پر دوبارہ نیند طاری ہو گئی میں سو گیا۔

نیند میں ہی مجھے محسوس ہوا کہ ٹرین چل پڑی ہے۔ اس کے بعد مجھے ٹرین کا کوئی ہوش نہ رہا کہ چل رہی ہے یا نہیں چل رہی۔ جس وقت دھچکا لگنے سے آنکھ کھلی تو باہر روشنیوں کا عکس ڈبے میں پیچھے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ میں نے دروازے کی کھڑکی میں سے باہر دیکھا۔ ٹرین کسی اسٹیشن کو چھوڑتی ہوئی پوری رفتار سے دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ پتہ نہیں کون سا اسٹیشن تھا۔ مجھے یہی اندازہ تھا کہ دلی صبح کے وقت یا پھر دوپہر کے وقت آئے گا۔ میں پھر سو گیا۔ دوسری بار جب آنکھ کھلی تو سپیدی نمودار ہو رہی تھی۔ ڈبے کے مسافروں کے چہرے نظر آنے لگے تھے۔ اس علاقے کے لوگوں کے زرد زرد چہروں سے میں واقف تھا۔ یہ تھرڈ کلاس کا ڈبہ تھا۔ زیادہ تر مسافر دیہاتی تھے۔ میں نے دیکھا کہ جہاں دروازے کے قریب فرش پر بیٹھا تھا وہاں میرے پاس ہی سیٹ پر ایک دبلی پتلی زرد چہرے اور اداس آنکھوں والی لڑکی بھی بیٹھی تھی۔ وہ ابھی ابھی سیٹ پر سے سو کر اٹھی تھی اور اپنے سیاہ بالوں کو پیچھے باندھ رہی تھی۔ اس نے ہلکے کاسنی رنگ کی معمولی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ ماتھے پر بندیا لگی تھی۔ اس کی سامنے والی سیٹ ایک بوڑھا آدمی بیٹھا کٹورے میں پانی پی رہا تھا۔ پانی پی کر اس نے لڑکی سے کہا۔

"رمکلی! پانی پی لے اپنے گاؤں کا اسٹیشن آ رہا ہے۔ گھر چل کر ہی کچھ بھوجن کریں گے۔"

اس لڑکی کا نام رمکلی تھا۔ لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ بال باندھ کر اس نے اپنی ساڑھی کو درست کیا اور کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی اور باہر دیکھنے لگی۔

ٹرین فل اسپیڈ سے جا رہی تھی۔ لڑکی کا رخ میری طرف تھا اور میں اسے پوری طرح سے دیکھ سکتا تھا۔ میں جس عمر میں تھا اس عمر میں مجھے ہر لڑکی اچھی لگتی تھی کہ میں ہر لڑکی سے پیار کرنے لگ جاتا تھا۔ یہ میری حماقت تھی، لیکن اس قسم کی حماقتیں اب مجھے بڑی قیمتی اور انمول لگ رہی ہیں اور افسوس کرتا ہوں کہ وہ مجھ سے جدا ہو گئی ہیں اور مجھے خشک اور بے رس عقل کے حوالے کر گئی ہیں، جس کا نہ کوئی سر ہے نہ پیر۔ اپنی عادت کے مطابق مجھے اس وقت اس دبلی پتلی اداس آنکھوں والی لڑکی سے پریم ہو گیا۔ اس زمانے میں محبت نہیں ہوتی تھی۔ پریم ہوتا تھا۔ یہ پریم کا لفظ کتابوں، رسالوں کی کہانیوں اور فلموں میں بڑا چلتا تھا۔ تم ہی نے مجھ کو پریم سکھایا اور پریم نگر میں بناؤں گی گھر میں۔ اس قسم کے گانوں کے ریکارڈ پر شہر کے ہوٹلوں میں بڑے بجا کرتے تھے۔

ایک دو بار لڑکی نے بھی میری طرف دیکھا۔ جیسے ہی ہماری آنکھیں چار ہوئیں ہم نے فوراً اپنی اپنی آنکھیں دوسری طرف پھیر لیں۔ ایک بار ہماری آنکھیں ایک دوسرے سے ملیں تو مجھے ایسے لگا جیسے لڑکی میری طرف دیکھ کر ہلکا سا مسکرائی تھی۔ محبت میں بدگمانیاں بھی بہت ہوتی ہیں اور خوش فہمیاں بھی بہت ہوتی ہیں۔ انسان یہی سمجھنے لگتا ہے کہ لڑکی تو مجھ پر جان چھڑکنے لگی ہے۔ وہ میرے بغیر اب رہ نہیں سکے گی۔ حالانکہ بہت ممکن ہے کہ لڑکی کو کچھ پتا بھی نہ ہو کہ یہ جو ریل کے ڈبے کے دروازے کے پاس بیٹھا ہے کون ہے۔ کوئی ہے بھی یا نہیں، لیکن عشق تو نام ہی ایک خوب صورت اور لطیف خیال کا ہے۔ عشق کے خیال ہی سے میرے ایسا آدمی خیال و خواب کی دنیا میں نکل جاتا ہے۔ مجھے تو خیال و خواب کی دنیا میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نکل جانے کا کوئی بہانہ چاہیے۔

ٹرین کی رفتار ہلکی ہوتی شروع ہوگئی تھی۔

ٹرین دریا کے پل سے گزر رہی تھی۔ لڑکی کے بوڑھے چچا یا دادا نے لڑکی سے کہا۔

”مڈھلکر آ گیا بیٹا۔“

بوڑھے نے دریا کی طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”جے ریدا دیوی کی جے۔“

اور صدری کی جیب میں سے دو پیسے نکال کر لڑکی کو دیے۔

”یہ لے رمکلی! دیوی کی بھینٹ کر دے۔“

لڑکی نے پیسے لے کر نیچے دریا میں پھینک دیے۔ اس کے چہرے پر بڑی دل کش مسکراہٹ تھی اور اس کے بالوں کی ایک لٹ ہوا میں اڑتی ہوئی بار بار اس کے ماتھے پر گر رہی تھی۔ میرے خرمن ہوش و حواس پر بجلی گرانے کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اگر یہ لڑکی مجھ سے جدا ہوگئی تو مجھے ساری زندگی چین نصیب نہ ہو سکے گا۔ لڑکپن کی محبتیں بھی کتنی معصوم اور کس قدر ناپائیدار اور کس قدر اثر انگیز ہوتی ہیں۔

کوئی اسٹیشن آ گیا تھا۔ گاڑی بہت آہستہ ہوگئی تھی۔ لڑکی نے سیٹ پر بچھائی ہوئی دری اور چادر لپیٹ کر ایک طرف رکھ دی تھی اور کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے لڑکی ایک بار پھر میری طرف دیکھ کر مسکرائی ہے۔ مجھ پر عشق کا بھوت اور زیادہ سوار ہوگیا۔ میں یہ بھوت کا لفظ نہیں لکھنا چاہتا تھا۔ عشق کے ساتھ یہ لفظ اچھا نہیں لگتا لیکن اب ایسا ہی لکھا اور بولا جاتا ہے۔

اول تو آج کل عشق ہوتا ہی نہیں۔ اگر بڑی مشکل سے عشق ہو بھی جائے تو لوگ کہتے ہیں کہ اس پر عشق کا بھوت سوار ہوگیا ہے۔ لوگ عشق کرنا بھول گئے ہیں یا پھر لوگوں کو زبردستی اور ہوس پرستی کا شکار ہوتے دیکھ کر عشق بوریا بستر اٹھا کر بھاگ گیا ہے لیکن جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں اس زمانے میں عشق کی بڑی بہار تھی۔ لوگ بڑے شوق سے عشق کرتے تھے۔ دوسرا کام کاج لوگ اس لیے جلدی جلدی کر لیتے تھے کہ انہیں کام کاج سے فارغ ہو کر عشق بھی کرنا ہے۔ بڑے بوڑھوں کی زبان پر بھی عشقیہ گیت ہوتے تھے۔ ہماری گلی میں ایک بڑا پرہیز گار بوڑھا درزی ہوا کرتا تھا۔ وہ کپڑے سیتے ہوئے نیو تھیٹرز کا فلمی گیت گاتا رہتا تھا۔

سندر ناری سندر پیاری
پیاری چھب دکھلائے

تکیوں اور باغوں میں ہیر گانے کے مقابلے ہوتے تھے۔ شاید اسی لیے اس زمانے میں قتل و غارت گری نہیں ہوتی تھی اور گینگ ریپ کا کبھی نام بھی نہیں سنا تھا کیونکہ لوگ عشق کرتے تھے اور عشق آدمی کی سیرت کو نیک بناتا ہے اور عشق کے درجات کی بلندی انسان کو عشق مجازی کے مقام سے نکال کر عشق حقیقی کی راہ پر لگا دیتی ہے۔

بہرحال یہ تو تصوف کی باتیں ہیں۔ یہ تصوف والے ہی بہتر جانتے ہیں۔ میں تو آپ کو اپنا قصہ سنا رہا ہوں۔ اپنی آپ بیتی سنا رہا ہوں کہ بغیر ٹکٹ کے تھا۔ بے زر بے پر تھا۔ جیب میں چائے کی ایک پیالی پینے کے لیے بھی پیسے نہیں تھے۔ مگر دل میں عشق کا سمندر جوش مار رہا تھا اور وہ اداس آنکھوں والی (کم از کم اس خوش فہمی میں تھا کہ اس کی آنکھیں اداس ہیں) لڑکی میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھی ہے اور جس کا نام رمکلی ہے۔

مجھے اس سے محبت ہوگئی تھی اور مجھے یقین ہوگیا تھا کہ اس سے جدا ہو جانے کے بعد میری دنیا میں

سوائے اندھیروں کے اور کچھ باقی نہیں رہے گا۔ اس سے پہلے آٹھویں جماعت میں مجھے فلم ایکٹریس مس نسیم بانو سے عشق ہوگیا تھا تو اس وقت بھی مجھے یقین تھا کہ اگر مس نسیم بانو مجھے نہ مل سکی تو میری زندگی میں اندھیرے اور تاریکیاں چھا جائیں گی۔ مس نسیم بانو مجھے بالکل نہ ملی۔ وہ مجھے مل ہی نہیں سکتی تھی لیکن اس کے نہ ملنے سے میری زندگی میں پہلے سے زیادہ روشنی آ گئی تھی لیکن جب میں اس سے عشق کر رہا تھا تو اس وقت بالکل سچا تھا۔ میرا عشق سچا تھا۔

مجھ میں اور میرے عشق میں جھوٹ کا شائبہ تک نہیں تھا۔ ٹرین کسی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر رک گئی۔ لڑکی اپنے بوڑھے باپ یا چچا کے ساتھ ڈبے سے اترنے لگی تو اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میری پوری کائنات میری طرف دیکھ رہی ہے۔ اس وقت مجھے وہ دبلی پتلی مدراسی لڑکی یاد آ گئی جس نے اپنے بالوں میں موتیے کے ہار سجا رکھے تھے اور جس نے ترچنا پلی کے اسٹیشن پر ٹرین سے اترتے وقت مڑ کر میری طرف دیکھا تھا اور میری طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو کہ تم بھی ٹرین سے اتر کر میرے ساتھ آ جاؤ۔ کہاں زندگی برباد کرتے پھرو گے۔ مگر میں سوچتا ہی رہ گیا تھا کہ ٹرین سے اتروں یا نہ اتروں اور ٹرین چل پڑی تھی اور وہ موتیے کے پھولوں والی لڑکی۔ وہ فردوس ارضی کی طرف بلانے والی لڑکی آہستہ آہستہ میری نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ اس بات کو کئی برس بیت گئے ہیں۔ وہ لڑکی مجھے دوبارہ نظر نہیں آئی۔ نظر آ بھی نہیں سکتی۔ سمندر کے سینے پر ابھر کر واپس سمندر میں تحلیل ہو جانے والی لہر پھر کہاں ملتی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ زمانہ ایک بار پھر اپنے ایک گزرے ہوئے منظر کو دہرا رہا ہے۔ اگر اس دفعہ یہ لڑکی میری نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تو پھر کبھی کوئی لڑکی میری طرف دیکھ کر نہیں مسکرائے گی۔

بس اس خیال کے ساتھ ہی میں بھی لڑکی کے پیچھے ڈبے سے اتر گیا اور جس طرف لڑکی جا رہی تھی میں بھی اس طرف چلنے لگا۔ یہ کوئی بڑا اسٹیشن نہیں تھا۔ آمنے سامنے اس کے دو پلیٹ فارم تھے۔ درمیان میں ٹرین کھڑی تھی۔ سامنے اسٹیشن کا چھوٹا سا گیٹ تھا جہاں سے لوگ ٹکٹ دکھا کا باہر نکل رہے تھے۔ لڑکی اور اس کے بوڑھے باپ کے پاس تو ٹکٹ تھے میرے پاس ٹکٹ نہیں تھا مگر مجھے اسٹیشن سے باہر نکلنے کے سارے گر آتے تھے۔ میں نے دیکھ لیا کہ گیٹ کے دوسری طرف جہاں تانگے وغیرہ کھڑے تھے اس طرف میں ریلوے لائن پار کر کے بھی جا سکتا تھا۔ چنانچہ میں وہیں سے ریلوے لائن کے ساتھ ہوگیا۔ میں تیز تیز چل رہا تھا کہ کہیں لڑکی میرے پہنچنے سے پہلے کسی تانگے میں بیٹھ کر چلی نہ جائے۔ مگر ریل کی پٹڑی کے ساتھ خاردار اونچا جنگلہ تھا جو دور تک چلا گیا تھا۔

میں تیز تیز چلنے لگا۔ آخر ایک جگہ خاردار تاروں والی دیوار ختم ہوگئی اور میں دوڑ کر جھاڑیوں میں سے ہوتا ہوا کچی سڑک پر آ گیا۔ اتنے میں ایک یکہ میرے قریب سے بڑی تیزی سے گزر گیا میں نے دیکھا کہ یکے کی پچھلی سیٹ پر وہی اداس آنکھوں والی لڑکی اپنے بوڑھے باپ یا چچا یا دادا کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ میں بے اختیار ہو کر جدھر یکہ گیا تھا اس طرف دوڑنے لگا۔

یہ میرا دیوانہ پن تھا مگر آج میں اپنے اس دیوانے پن پر اپنی آدھی سے زیادہ عقل قربان کر سکتا ہوں۔ افسوس کہ یہ دیوانہ پن مجھ سے بچھڑ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گیا۔ میں دوڑتے دوڑتے خود ہی آہستہ ہوگیا۔ ایک تو یہ کہ یکہ کافی دور نکل گیا تھا۔ دوسرے یہ سوچنے لگا کہ لوگ کیا کہیں گے کہ بس اسی ایک جملے نے مجھے میری منزل سے دور کردیا کہ لوگ کیا کہیں گے لیکن جذبہ عشق سلامت تھا۔

میں اسٹیشن پر واپس نہیں آیا بلکہ جس طرف یکہ گیا تھا اسی طرف چلتا گیا تھا۔ دن پوری طرح سے نکل آیا تھا۔ بادلوں کی وجہ سے دھوپ نہیں تھی۔ کچی سڑک آگے جا کر دائیں طرف کو مڑ گئی۔ یکہ اب نظر نہیں آیا لیکن وہ گیا اسی طرف تھا۔

سڑک کی دونوں جانب درخت تھے۔ کچھ دور جا کر سڑک پھر ایک طرف کو مڑ جاتی تھی کئی درختوں کی ٹہنیاں سڑک پر جھکی ہوئی تھیں۔ ان درختوں نے یکے کو میری نظروں سے اوجھل کردیا تھا لیکن میں چلا جارہا تھا۔ میں اس ذوق وشوق سے جارہا تھا جیسے اس لڑکی نے مجھے کسی جگہ ملنے کا وقت دے رکھا ہو جب کہ حقیقت یہ تھی کہ اس لڑکی کے بارے میں سوائے اس کے مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ دیہات کی رہنے والی ہے اور ہندو ہے۔ کیونکہ اس نے ماتھے پر بندیا لگائی ہوئی تھی۔

آگے کھلی جگہ آگئی جس کی دونوں جانب کھیت تھے۔ اس کے آگے پھر درختوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اسی طرح چلتے چلتے میں ایک ندی پر پہنچ گیا۔ ندی کا پاٹ چوڑا تھا۔ ندی کے کنارے ایک جگہ پتھر کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جو ندی میں اترتی تھیں۔ یہاں ایک میری عمر کا لڑکا دھوتی باندھے نہا رہا تھا۔ وہ ندی میں بیٹھا ہوا تھا اور بار بار ڈبکی لگا کر دونوں ہتھیلیوں سے پانی اپنے سر پر ڈال رہا تھا۔

ندی پر کوئی پل نظر نہیں آتا تھا۔ میں وہیں ایک جگہ بیٹھ گیا اور لڑکے کو نہاتے دیکھتا رہا۔ لڑکا نہا کر ندی سے باہر نکل آیا اور کپڑے پہننے لگا۔ اس کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ وہ مجھ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر ذرا سا مسکرایا اور بولا۔

"ندی کا پانی بڑا ٹھنڈا ہے کیا تم اشنان کرو گے؟"

میں نے جواب دینے کے بجائے نفی میں سر ہلا دیا۔ لڑکا دھوتی کرتا پہن کر میرے قریب آ گیا کہنے لگا۔

"تم کون سے شہر سے آئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"بمبئی سے دلی جارہا تھا یہ جگہ اچھی لگی گاڑی سے اتر گیا کہ یہاں کچھ روز سیر کی جائے۔"

لڑکے نے کہا۔

"میرا نام جے دیو ہے۔ تمہارا کیا نام ہے۔"

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"میرا نام موہن ہے۔"

لڑکا بولا۔

"تم ہمارے پاس رہ لو۔ میرے پتا جی شمشان بھومی میں مردے جلاتے ہیں۔ یہاں یوگی مت کی پہاڑی ہے۔ اس پہاڑی میں ایک غار ہے جس کے اندر رام جنی کی مورتیاں ہیں۔ میں تمہیں مورتیاں دکھانے لے چلوں گا۔ میری ماتا جی اور بہنیں تو سیتا پور میں رہتی ہیں۔ میں یہاں پتا جی کے پاس ہوتا ہوں۔ تم نے کچھ کھایا ہے کہ نہیں میرے ساتھ آؤ۔"

میں نے سوچا کہ اس کے ساتھ چلتا ہوں اس کے ذریعے مجھے میری گمشدہ محبت کا کوئی سراغ مل جائے۔ اوپر سے مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ ندی آگے جا کر ایک جنگل میں چلی گئی تھی۔ جنگل کے کنارے پر ایک طرف دو تین کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ ان کے آگے ایک میدان میں دو اینٹوں کے چبوترے تھے۔ جے دیو نے بتایا کہ ان چبوتروں پر ہم

مردے جلاتے ہیں۔

"پتا جی کہا کرتے ہیں کہ ہم راجہ مہاراجوں کے مردوں کا انتم سنسکار کیا کرتے تھے۔ پر اب راجے مہاراجے نہیں رہے۔ اس لیے ہر جاتی کے مردوں کا کریا کرم کرتے ہیں۔"

جے دیو کا ادھیڑ عمر کمزور سا باپ دھوتی باندھے چارپائی پر بیٹھا ناریل (حقہ) پی رہا تھا۔ جے دیو نے کہا۔

"پتا جی! یہ موہن ہے، بمبئی سے ہمارے گاؤں کی سیر کو آیا ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔ میں اسے یوگی مت کی رام جنی کی مورتیاں دکھانے لے جاؤں گا۔"

جے دیو کا باپ ناریل گڑگڑاتے چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ایک نظر مجھے دیکھا اور بولا۔

"اسے کونے والے کوارٹر میں چارپائی ڈال دینا۔"

"اچھا پتا جی۔"

موہن مجھے کوارٹر کے اندر لے گیا۔ ہم نے بوریے پر بیٹھ کر چاولوں پر دال ڈال کر بڑے مزے سے کھائے۔ اس کے بعد موہن مجھے رام جنی کی مورتیاں دکھانے یوگی مت کی پہاڑی کی طرف لے گیا۔ یہ جنگل کے شروع میں ایک چھوٹا سا ٹیلہ تھا۔ جس کے اوپر کسی صدیوں پرانے قلعے کا کھنڈر دکھائی دے رہا تھا۔ وہ غار جس کے اندر رام جنی کی مورتیاں تھیں اس ٹیلے کے اندر بنا ہوا تھا۔ میری جانے بلا یہ رام جنی کی مورتیاں کیا ہوتی ہیں۔ غار دیکھنے کا شوق مجھے اس لڑکے کے ساتھ لیے جارہا تھا لیکن اس غار میں میرے ساتھ کیا گزرنے والی تھی؟ اس کا مجھے علم نہیں تھا۔

یوگی مت پہاڑی کا غار کیا تھا پوری طرح بھول بھلیاں تھیں۔ پہاڑی کے نیچے غاروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ایک غار میں سے دوسرا اور دوسرے غار میں سے تیسرا غار نکلتا تھا۔ یہ قدرتی غار تھے اور اسی کے اندر دیواروں کے پتھر تراش کر پجاریوں نے عورتوں کی مورتیاں بنائی ہوئی تھی۔ کوئی مورتی ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ کوئی ڈانس کرنے کے پوز میں تھی۔ کوئی آلتی پالتی مار کر بیٹھی ہوئی تھی۔ غاروں کے اندر ہوا آرہی تھی۔ میں نے جے دیو سے پوچھا۔

کہنے لگا۔

"یہ غار آگے جا کر پہاڑی کے دوسری طرف نکل جاتے ہیں۔ اس طرح ہوا ان کے اندر چلتی رہتی ہے۔"

مجھے ان پتھر کی مورتیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جے دیو نے ایک مورتی کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ کہنے لگا۔

"یہ رام جنی کی مورتی ہے۔ اس کو تم بھی پرنام کرو۔"

میں نے کہا۔

"نہیں، نہیں میں نہیں کروں گا تم کرو۔"

کہنے لگا۔

"تمہاری مرضی مگر پرنام نہیں کرو گے تو رام جنی کا شراپ (بددعا) لگے گا۔"

"مجھے کوئی شراپ وراپ نہیں لگتا میں نے مورتیاں دیکھ لی ہیں۔ میں تو باہر جارہا ہوں۔"

جے دیو بولا۔

"اکیلے مت جانا۔ راستہ بھول گئے تو یہاں سے باہر نہیں نکل سکو گے۔ میں آگے کچھ مورتیوں کی پوجا کرلوں پھر اکٹھے واپس چلیں گے۔"

میں وہیں بیٹھ گیا اور جے دیو سے کہا۔

"اچھا تو پھر تم پوجا کرلو، میں یہیں تمہارا انتظار کرتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوں۔"

جے دیو بولا۔

"یہاں سے اٹھ کر اِدھر اُدھر مت جانا میں جلدی آ جاؤں گا۔"

وہ چلا گیا میں بیٹھ کر اپنی اداس آنکھوں والی محبوبہ کے خیال میں گم ہو گیا۔

سوچنے لگا کہ یہاں ضرور آگے کوئی گاؤں ہو گا۔ وہ لڑکی اسی گاؤں میں رہتی ہو گی۔ میں جے دیو کے ساتھ اس گاؤں میں جا کر لڑکی کو تلاش کروں گا۔ ہو سکتا ہے مجھے اس کا دیدار نصیب ہو جائے۔ یہ تو میں سوچ ہی نہیں رہا تھا کہ اگر وہ لڑکی مجھے گاؤں میں مل گئی تو میں اس کا کیا کروں گا؟ اس کو کیا کہوں گا؟ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں نے اس سے کوئی بات کی تو وہ جوتا اٹھا کر مجھے مارنا شروع کر دے۔ یا پھر شور مچا دے اور گاؤں کے لوگ مجھے مار مار کر برباد کر دیں۔ عشق اور پھر لڑکپن کا عشق انجام سے بے نیاز ہوتا ہے۔

بیٹھے بیٹھے جب کافی دیر ہو گئی اور جے دیو نہ آیا تو میں نے دل میں اسے برا بھلا کہا اور اٹھ کر اکیلا ہی واپس چل پڑا۔ اپنی طرف سے واپس جا رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں اسی راستے سے واپس جا رہا ہوں جس راستے سے ہم غار میں داخل ہوئے تھے لیکن جیسا کہ میں نے بتایا ہے پہاڑی کے نیچے غاروں کا جال بچھا ہوا تھا اور ایک غار میں سے دوسری اور تیسری غار نکل کر آگے چلی جاتی تھی۔ اس کا بھول بھلیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں بھٹک گیا۔ جس غار میں جاتا وہ آگے ایک اور غار سے مل جاتا میں گھبرا گیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے ایسے لگا جیسے میں ان غاروں میں سے کبھی باہر نہ نکل سکوں گا۔

میں نے گھبرا کر جے دیو کا نام لے کر اسے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ مگر کسی طرف سے بھی جے دیو میری مدد کو نہ آیا۔ شاید میری آواز وہیں غار میں بلند ہو کر دفن ہو جاتی تھی لیکن یقین کریں مجھے پسینہ آ گیا۔ میں عشق وشق سب کچھ بھول گیا اور دیوانوں کی طرح غاروں میں کبھی ادھر کبھی ادھر دوڑ دوڑ کر باہر جانے کا راستا تلاش کرنے لگا۔ مجھے یاد آ گیا کہ جے دیو نے کہا تھا کہ یہ غار پہاڑی کی دوسری طرف نکل جاتے ہیں چنانچہ میں ایک طرف تیز تیز چلنے لگا۔

یہ غار سرنگ کی طرح تنگ نہیں تھے بلکہ پرانے قلعوں کی راہ داریوں کی طرح قدرے کشادہ تھے اور چھت بھی اونچی تھی اور ہوا بھی آ رہی تھی۔ چلتے چلتے میں کافی آگے نکل گیا لیکن غار ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ ایک عجیب بات تھی کہ غار میں تاریکی نہیں تھی۔ سارے غاروں میں ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ خدا جانے یہ روشنی کہاں سے آ رہی تھی۔

میں تھک ہار کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اپنے دل کو قابو میں کیا۔ گھبراہٹ کو دور کیا اور سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ یہی فیصلہ کیا کہ جس طرف سے آیا ہوں اسی جانب واپس چل پڑوں آخر یہ غار واپس تو اسی جگہ نہیں آئے گا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

❖

Courtesy www.pdfbooksfree.pk